ٹوٹے رشتے
(افسانے)
ساوتری گوسوامی
اسباق پبلی کیشنز، پونے

﴿افسانے﴾

ساوتری گوسوامی

اسباق پبلی کیشنز پونے

نام کتاب : اٹوٹ رشتے
موضوع : افسانے
مصنفہ : ساوتری گوسوامی
صفحات : 288
قیمت : 250روپئے
کمپوزنگ وڈزائننگ: ارقم کمپیوٹی کیشنز،مائر گاؤں خورد،موبائل نمبر 09767113554
طباعت : جے گنیش پریس پونے
مرتب : نذیر فتح پوری
زیر اہتمام: اسباق پبلی کیشنز،پونہ-9822516338
تعداد : ۵۰۰
سن اشاعت: ۲۰۰۱ء

رابطہ

ASBAQUE PUBLICATIONS
SAIRAmanzil,230/B/102,
Viman darshan.Sanjay Park,
Lohgaon Road.Pune-411032.M.S.

SAVITRI GOSWANI
41, mathdson road,
Applecross,W A 6153
Australia

فہرست مضامین

انتساب

اپنے بچوں کے نام

☆ سنیتا۔(بیٹی)

☆ اروند۔(داماد)

☆ روی شنکر(بیٹا)

☆ ٹیریسا۔(بہو)

☆ مدھو بیتا۔(بیٹی)

☆ تپن۔(داماد)

☆ ریتی۔(نواسی)

☆ کُشل۔(نواسا)

ساوتری گوسوامی

ساوتری گوسوامی کے افسانے

زندگی کی حقیقت کے آئینے

منشی پریم چند کے بعد اردو افسانے کی ترقی کا محاسبہ کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہ موضوع آسمان اور زمین کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ فکشن کے پارکھوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اب بھی لکھ رہے ہیں آئندہ بھی ان کا ذہن اور قلم اس موضوع کی گرہ کشائی اور ستارہ شماری کرتا رہے گا، اس کے بعد بھی سارے کے سارے افسانہ نگاروں کے ساتھ انصاف کہاں ہوگا۔ اس کی وجہ پارکھوں کی ان دیکھی اور دانستہ کسی کو نظر انداز کرنے کی عادت یا پالیسی نہیں ہوسکتی، بلکہ مطالعہ اور مشاہدے کی تحدید انصاف کی ڈگر پر چلنے سے روک دیتی ہے، جب تک آپ کی رسائی تمام تخلیقی فنکاروں تک نہیں ہوگی آپ ان کے فن پاروں کا تجزیہ کیسے کر سکتے ہیں، آپ کی پارکھی طبیعت کے لیے یہ لازم ہے کہ آپ ایسے فنکاروں کو تلاش کریں جو گمنام تو نہیں لیکن عصری ادب کے پردے پر ان کا وجود ایسا نمایاں بھی نہیں کہ تمام آنکھیں انہیں دیکھ سکیں، ان کے خدوخال کا جائزہ لے سکیں، ان کے نقش ونگار کا تجزیہ کر سکیں، ان کی آنکھوں کی گہرائی، ان کی پیشانی کی سلوٹوں اور ان کے لبوں کے تبسم کی معنویت تک رسائی حاصل کر سکیں۔

افسانے کی حقیقت سے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے۔

''کیا حقیقت نگاری کی طرف پھر سے توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔؟ یعنی ایسی کہانی کی طرف جو کتھا کہانی کے لاشعوری تقاضوں کو بھی پورا کرے اور انسانی اور سماجی مسائل کو بھی معنیاتی ابعاد کے ساتھ پیش کرے، ایسی حقیقت نگاری جو رومانی رویوں، سستی جذباتیت، اکہری ترجمانی اور عینیت کا شکار نہ ہو......''

علامتی افسانہ نگاری کے جواب میں نارنگ صاحب نے لکھا ہے۔

''ضروری نہیں کہ ہر اصطلاح کا جواز ہم مغرب سے لیں، ہمیں اپنی روایت، رجحانات اور تقاضوں کے تحت نئی اصطلاحات بھی اختیار کرنا ہوں گی، حقیقت نگاری کا یہ نیا رجحان چونکہ نئے اردو افسانے میں ایک ناگزیر اشاریہ ہوگا۔ اور نئے افسانے میں کہانی پن کی بازآبادکاری کا نقیب ہوگا، اس کو نئی حقیقت نگاری سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔''

(حوالہ۔ نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزیے اور مباحث۔ صفحہ نمبر ۹۔ مرتبہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، پبلشر زاردو اکادمی دلی۔ اشاعت ۱۹۸۸ء)

گوپی چند نارنگ فکشن کے ایسے پارکھ ہیں جو نئے آفاق کی قدر افزائی کے باوجود روایت اور حقیقت نگاری کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علامتی، لایعنی اور نام نہاد جدیدیت کے تناظر میں تحریر کردہ افسانوں کو آئینہ دکھانے کی ہمیشہ کوشش کی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس گراں قدر رائے کے تناظر میں جب ہم اردو کی بزرگ فکشن نگار محترمہ ساوتری گوسوامی کی افسانوی کائنات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان افسانوں میں ایک طرح کی ایسی حقیقت نگاری دکھائی دیتی ہے۔ جو سماج کے ہر چہرے کو آئینہ دکھاتی ہے۔ زندگی کی شیریں اور تلخ سچائیوں کا عکس ہمیں ان افسانوں میں جا بجا نمایاں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک افسانہ ''ڈالر کی تلاش میں'' کی یہ تحریر ملاحظہ کریں۔

''میرے والدین پڑھے لکھے تھے لیکن ان کے پاس یونیورسٹی کی بڑی بڑی ڈگریاں نہیں تھیں۔ دونوں کی دلی خواہش تھی کہ میں خوب پڑھوں اور ڈگریاں حاصل کروں۔ دونوں برسرِ روزگار تھے۔ ایک پشتینی مکان تھا۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ نہ کوئی غم نہ کوئی پریشانی، ہم تینوں اپنے حال میں آسودہ اور شادماں تھے۔ ہمیشہ ہمارے چہروں پر ہنسی اور زبانوں پر راگنی رہتی تھی۔ میرے ماں باپ کی زندگی کا مقصد صرف میری سرفرازی تھی۔ میں ذہین تھا سو ان کا خواب پورا کرنے کے لیے میں نے دل و جان سے کڑی محنت کی اور مجھے نیویارک کی ایک یونیورسٹی میں ایڈمشن مل گیا۔''

یہ ایک افسانے کا اقتباس زندگی کے آئینہ خانے کے بہت سے عکس درشاتا ہے۔ ایک طرف محبت کرنے والے والدین ہیں جو چاہتے ہیں کہ ان کا اکلوتا بیٹا ایک کامیاب انسان بنے، دنیا اس کے روبرو سرنگوں ہو۔ وہ جہاں جائے کامیابی کا پرچم لہراتا رہے۔ لیکن یہ کامیابی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی مل سکتی ہے۔ بیٹا بھی ایک ذمہ دار اور ماں باپ کے درد کو محسوس کرنے والا کردار ہے۔ اس کی انتھک محنت اور مسلسل جدوجہد رنگ لاتی ہے اور اسے دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے۔

اس افسانے میں تین کردار ہیں۔ یہ تینوں ایک صحت مند سماج اور ایک سلجھے ہوئے معاشرے، ایک دردمند دل رکھنے والے خاندان کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی افسانے کا وہ روپ ہے جسے حقیقت نگاری کہا گیا ہے۔ ساوتری گوسوامی کے افسانے حقیقت سے مربوط نظر آتے ہیں۔ ہمیں سچائی کے اظہار کی طاقت عطا کرتے ہیں۔ ایک مربوط طرزِ تحریر کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک کردار دوسرے کردار سے کس طرح مربوط ہو کر ایک سماجی زنجیر بن جاتا ہے اس کی جھلک ساوتری گوسوامی کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ساوتری گوسوامی نے محض دو پانچ افسانے نہیں لکھے بلکہ انھوں نے افسانوں کی سنچری مکمل کر لی۔ اور

اب بھی وہ میدان میں ڈٹی ہوئی ہیں۔ قلم کی توانائی اور تخیل کی روشنائی نے انھیں متحرک اور فعال رکھا ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے قاری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے افسانے نہیں لکھے۔ بلکہ قاری کو حقیقت سے روشناس کرنے کے لیے افسانے لکھے ہیں۔ قاری کو زندگی کا مقصد سمجھانے کے لیے افسانے لکھے ہیں۔ روشنی اور اندھیرے کے درمیان لکیر کھینچ کر دونوں کا فرق سمجھانے کے لیے افسانے لکھے ہیں۔

ایک افسانہ' تلاش ایک مکمل مرد کی'' ایک ایسی سماجی کہانی ہے جس میں بزرگ نسوانی کردار اپنے پوتے کا منہ دیکھنے کے لیے ترس جاتی ہے۔ یہ موضوع اگر چہ نیا نہیں ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ابھی حل کہاں ہوا ہے۔ جب تک ایک ضرورت مند سماج دنیا میں موجود ہے۔ یہ مسئلہ اٹھتا رہے گا اور کوئی نہ کوئی حساس فنکار اس کو موضوع سخن بناتا رہے گا۔ ملاحظہ کریں۔ ایک مختصر مکالمہ جس میں افسانے کی کہانی سمٹ آئی ہے۔ بیوی کی شکایت اور خواہش کے جواب میں اس کا شوہر کہتا ہے۔

''مانا کہ سائنس بہت ترقی کر رہا ہے۔ مگر اولاد ڈاکٹر نہیں خدا دیتا ہے۔ ڈاکٹر ہزار ٹیسٹ کروائے گا۔ ٹیسٹ ویسٹ کا جھگڑا چھوڑو، جب داتا کی مرضی ہوگی دے دیگا۔ بندے کا کام صبر کرنا ہے۔ جواب میں اماں ابل پڑیں۔

''صبر...... چار سال سے صبر ہی تو کر رہی ہوں اور کتنا صبر...... میرا بچہ منھ سے کچھ نہ بولے مگر ہر جوان مرد کی طرح اس کے دل میں بھی اولاد کی تمنا ہوگی۔ امید بر آنے میں تاخیر دل کو بیمار کر دیتی ہے۔''

انسانی معاشرے میں انواع اقسام کی بیماریاں بھری پڑی ہیں۔ ایک بیماری کثرت اولاد کی ہے۔ جس کا علاج ممکن نہیں۔ غریب ماں باپ چار چھ بچوں کی نہ سلیقے سے پرورش کر سکتے ہیں نہ ان کو پڑھا لکھا کر قابل انسان بنا سکتے ہیں۔ دوسری بیماری اولاد سے محرومی کی ہے۔ لاکھ جتن کر لینے کے بعد بھی بعض گودیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تقدیر میں ہریالی نہیں ہوتی اور وہ ہری ہونے کے انتظار میں کتنے ہی موسموں سے گزر جاتی ہیں۔ ساوتری گوسوامی کی کہانی ''تلاش ایک مکمل مرد کی'' اسی دوسری بیماری کے گرد گھومتی ہے۔ دراصل یہ افسانہ نگار کی تیسری آنکھ کا کمال ہے۔ جو انسانی معاشرے میں پرورش پانے والی بیماریوں کا مشاہدہ کرتی رہتی ہے اور اسے تخلیقی فن پارے میں ڈھال کر قارئین کے روبرو پیش کر دیتی ہے۔ لگتا ہے ساوتری گوسوامی کے پاس بھی یہی تیسری آنکھ ہے جو انھیں مشاہدوں کی رہ گزر سے گزارتی رہتی ہے اور زندگی کے حقائق کا ادراک فراہم کرتی رہتی ہے۔

ساوتری گوسوامی ایک زندہ سماج کی متحرک افسانہ نگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ وہ جس طرف نظر اٹھاتی ہیں کہانیوں کا ایک جال بھر لے آتی ہیں۔ اور پھر ان کہانیوں کو اپنی فکر کی

سان سے گزار کر افسانہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ اسی سبب ان کے افسانوں کے کردار سچے، کھرے، اور چلتے پھرتے سماج کے افراد نظر آتے ہیں۔

بعض افسانے خاصے طویل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کرداروں کی کثرت ہے۔ لیکن یہ کردار اپنی کثرت کی وجہ سے قاری کو الجھن میں نہیں ڈالتے بلکہ ہر کردار اپنی صحت مند موجودگی کا احساس دلاتا ہوا اپنا سفر مکمل کرتا ہے۔

''سسکتے لوگ'' ''یہ دکھیاروں کا پریوار'' یہاں بڑا اندھیرا ہے، کیوں کہ یہاں کے سارے چراغ یا تو بجھ چکے ہیں یا بجھا دیئے گئے ہیں۔ کسی کو ہاتھ سے ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس سماج کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں۔ اب یہ گھر کچی دیواروں پر کھڑا ہے۔ اس سے ایک مضبوط سائبان کی امید رکھنا بے سود ہے۔ زندگی کے اس مہیب سفر میں قدم قدم پر موت کا سایہ نظر آتا ہے۔ جہاں ہر شخص کے ہاتھ میں کشکول ہے اور وہ زندگی کی بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔ کہاں کہاں پہنچی افسانہ نگار کی تیسری آنکھ، آنکھ کا یہ طلسماتی کردار کیسے کیسے منظر قید کر لایا۔ ان افسانوں میں کرداروں کا ایک بازار سجا دیا گیا ہے۔ آیئے ان کرداروں سے ملیں۔ ان سے تفصیلی گفتگو کریں۔ ان کے درد کو جانیں۔ ان کے زخموں کی گہرائی کا اندازہ لگائیں۔ اس دوستی اور اپنے پن میں بڑا فائدہ ہے۔ دیکھیں کہ افسانہ نگار نے کس سہلتا اور سجلتا کے ساتھ یہ سب کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کرداروں میں جو اپنا پن ہے یہ دراصل افسانہ نگار کے خلوص کی کشش ہے۔ جو قارئین کے دامن دل کو اپنی سمت کھینچتی ہے۔

افسانوں کا یہ انتخاب میں نے اپنے طور پر کیا ہے۔ ترتیب بھی میری اپنی ہے۔ ابھی ساوتری جی کے بہت سے افسانے اشاعت کے منتظر ہیں۔ اس سے پہلے ان کے افسانوں کے دو انتخاب چھپ چکے ہیں۔ ایک کتاب ہندی لپی میں بھی آچکی ہے۔ انڈو پاک کے مختلف ادبی رسالوں میں ان کے بعض افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

محترمہ ساوتری گوسوامی دنیا کے ایسے خطے میں مقیم ہیں جسے آسٹریلیا کہا جاتا ہے۔ جہاں ہمدم و ہم زبان کوئی نہیں۔ کسی سے اردو میں گفتگو کرنے لیے دل چاہے تو آئینے کے روبرو ہو جایئے آواز بھی آپ کی سماعت بھی آپ کی۔ ایسے میں اردو کا پرچم بلند کرنا، سب سے بڑی جسارت ہے۔ اردو میں سوچنا سب سے بڑی عبادت ہے اور اردو میں لکھنا سب سے بڑی ریاضت ہے۔

عمر کے ۸۴ ویں پڑاؤ میں محترمہ ساوتری گوسوامی ان تمام فرائض کی ادائیگی کے لیے ہمہ وقت کمربستہ نظر آتی ہیں۔ ہم سب ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گزار ہیں۔ چراغ جلتا رہے۔ روشنی ہوتی رہے، اندھیرے منھ چھپاتے پھریں، انسانیت کا بول بالا ہو۔ محبت کے سر پر تاج سجے اور آدمی سرخ رو ہو۔ اسی خواہش کے ساتھ

۱۰،۱،۲۰۱۵ (نذیر فتح پوری) پونہ

اٹوٹ رشتہ

پلوی۔منوج اور بھرت کا بھولا بچپن کھیلتے۔جھگڑتے۔روٹھتے اور مناتے پلک جھپکتے نہ جانے کہاں کھو گیا۔ان تینوں معزز خاندانوں کی حویلیاں برسوں سے اس محلے میں جگمگا رہی تھیں۔وہ سب لوگ کئی پشتوں سے ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں کے ساتھی تھے۔وقت بڑے امن وامان سے گذر رہا تھا انکی آپسی محبت اور دوستی بے مثال تھی......

اچانک منوج کی چھوٹی بہن کو تیز بخار آیا اور کچھ ہی گھنٹوں میں وہ بچی ہسپتال میں آخری سانسیں لے رہی تھی۔منوج یقینی طور سے دعوی کرتا کہ اس کی بہن کی موت ڈاکٹروں کی لاپرواہی کا نتیجہ ہے۔اگر ڈاکٹر وقت پر آجاتا اور اسکی بہن کو صحیح علاج ملتا تو وہ ضرور بچ جاتی۔منوج نے اپنے کانوں سے سنا تھا...... ''چائے تو پی لوں۔۔مریض تو آتے ہی رہتے ہیں''......اور جب ڈاکٹر چائے پی کر فارغ ہوئے تھے اسکی گڑیا سی بہن بے ہوش ہو چکی تھی۔وہ تو چل بسی اور پیچھے سب تڑپتے رہ گئے تھے......ڈاکٹر کے دل پر اس بچی کی موت کا اثر بالکل بھی نہیں ہوا تھا...... نہ چہرے پر کوئی غم کے آثار تھے نہ کوئی فکر وتردد کی شکن ......بس دھیرے سے ''sorry'' کہہ کر کمرے سے ایسے باہر نکلے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

ڈاکٹر کا ہر لفظ منوج کے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھتا رہتا...... یہ غمناک حادثہ اس کے ذہن میں ہر وقت شور مچاتا رہتا۔گڑیا کی جدائی جب برداشت نہ ہوتی تو منوج بے تماشا چلاتا...... ''ڈاکٹر انسان نہیں پتھر کے بے جان بت ہوتے ہیں...... چلتے پھرتے بے جان بت......بیدرد...... بے حس......'' یہ پیسہ بنانے کی مشین ہیں۔مریض کی بیماری۔علاج...... زندگی اور موت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں......''

منوج کو ڈاکٹر لفظ سے نفرت ہو گئی تھی...... اس حادثے کے بعد وہ بیحد سرکش اور ضدی ہو گیا تھا ......چھوٹی چھوٹی باتوں پر لمبی لمبی تکراریں کرنا تو اسکی عادت سی ہو گئی تھی...... پلوی سے بہت جھگڑتا اور جب بھرت دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کرتا تو وہ دانت پیس کر رہ جاتا......

وقت کی تیز رفتار تو دیکھئے...... دیکھتے دیکھتے تینوں بچے جوان ہو کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے،منوج ایک کامیاب وکیل بنا...... بھرت نے خاندانی بزنس سنبھالی......اور پلوی کا ڈاکٹر بننا منوج کو بالکل پسند نہیں آیا......

بھرت کی ماتا جی کی بیماری کے دوران پلوی اور بھرت ایک دوسرے کے اور بھی قریب تر ہو گئے ۔بھرت نے کئی بار اقرار محبت کرنا چاہا...... پلوی سے کہنا چاہا کہ وہ اسکو اتنی پیاری لگتی ہے کہ زندگی بھر اسکو اپنی آنکھوں میں سجائے رکھنا چاہتا ہے...... اسکی میٹھی میٹھی باتیں اور شریں ادائیں اس کے دل میں بس گئی ہیں...... سورات دن اسکا ہی خیال ستا تا رہتا تھا ہے...... پھر سوچا محبت کی اپنی نرالی زبان ہے...... کچھ بھی کہنے اور سننے کی ضرورت نہیں...... محبت کا شیریں جذبہ دل سے اتر کر آنکھوں میں عیاں ہوتا ہے۔

بس دن یوں ہی بیتتے گئے...... بھرت کی ماتا جی نے سانسیں بند ہونے سے پہلے پلوی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ سنایا تو پلوی نے مسکرا کر پلکیں جھکا دیں...... وہ اٹک اٹک کر بولیں ''بچپن کی دوستی کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے مجھے یقین ہے تم ہی میرے سونے گھر کو دوبارہ آباد کر سکتی ہو۔...... اس بے جان گھر میں پھر سے زندگی بھر سکتی ہو'' ...... دونوں کو سدا خوش رہنے کی دعائیں دیتے دیتے ان کی زبان لڑکھڑا گئی ...... آنکھیں بند ہو گئیں...... روح پرواز کر گئی......

ایک کامیاب بزنس کے واحد مالک کو ماں کے لیے سوگ منانے کا بھی وقت نہیں ملا...... اکثر وہ ملک سے باہر ہی رہتا تھا...... آہستہ آہستہ جب سارے کاروبار کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تو شادی کرنے کا ارادہ کیا...... کتنی خوش تھی پلوی...... اس نے جو سوچا تھا جو چاہا تھا...... بس اب پورا ہونے ہی والا تھا...... اچانک طوفان نے آ گھیرا تھا...... وہ رات بڑی بھیانک تھی...... طوفانی تیز ہوائیں اور تیز بارش میں کچھ بھی بجھائی نہیں دے رہا تھا...... چاند کالے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا...... تارے سو گئے تھے...... بڑی کربناک رات تھی...... پلوی کا ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح بیت رہا تھا۔

صبح ہوئی...... اس کا سورج کہیں کھو گیا تھا...... اندر باہر تاریکی ہی تاریکی...... چاروں جانب گھور اندھیرا...... ان چند گھنٹوں میں پلوی کا چاند سا مکھڑا زرد پڑ گیا تھا...... آنکھوں کی چمک آنسوؤں نے ڈھانک لی تھی...... ہائے میرے پیار کی منزل کتنی قریب تھی...... صرف قدم دو قدم ہی تو چلنا باقی رہ گیا تھا...... یہ کیا ہو گیا...... وہ بے شمار خوشیاں مجھ بدبخت کی قسمت میں نہیں تھیں...... ''بھرت...... میں تو ہر پل ہر لمحہ اس دن کی راہ دیکھ رہی تھی...... جب آسمان سے ہم دونوں کے اوپر پھولوں کی بارش ہو گی...... شہنائیاں بجیں گی...... لیکن...... اب سب ختم ہو گیا...... اب تو تمہارا انتظار کرنے کا حق بھی مجھ سے چھین لیا گیا ہے...... رات تیز بارش میں میرے اوپر انگارے برستے رہے...... میں جل گئی...... پوری کی پوری خاک ہو گئی

......کوئی مجھے بچا نہ سکا ...... اب موت اور صرف موت ہی میری منزل ہے۔ وہ روتی رہی ...... سر پٹکتی رہی ......کس کو اپنا راز دار بناتی ...... ماں کو ...... نہیں ...... ماں تو سنتے ہی مر جائیگی ...... آنسو لگاتار بہتے رہے۔

وہ رات بھر اکیلی اس دوزخ کی آگ میں جلتی رہی تھی۔ صبح ماں نے دیکھا تو گھبرا کر بولیں تم بہت بیمار ہو ...... مجھے کیوں نہیں بلایا ...... واقعی کل رات بہت بھیانک طوفان آیا تھا ...... ایسے طوفان ہمیشہ بربادیوں کی نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں ...... کل رات منوج کی گاڑی پیڑ سے ٹکرا گئی ...... سنا ہے بہت پی لی تھی ...... گاڑی میں آگ لگ گئی تھی ...... وہ پورا کا پورا جل گیا ...... وہ یہ دردناک خبر سن کر چونکی نہیں تھی ماں دھیرے سے بولیں اگر ہو سکے تو منوج کی ماں سے ضرور مل آنا ...... میں ابھی جا رہی ہوں ...... ایک ہی تو اس گھر کا چراغ تھا ...... اس کی ماں کا رو رو کر برا حال ہو رہا ہے ...... پلوی بولی ...... اماں مجھے رات بھر تیز بخار تھا ...... میں بعد میں جاؤنگی۔

ہسپتال سے کئی فون آئے ...... اس نے کسی سے بات نہیں کی ...... اپنے آپ کو کمرے میں قید کر لیا ...... منوج کے گھر بھی نہیں گئی ...... کئی دن ایسے ہی گزر گئے ...... ماں نے سمجھایا ...... بچپن کے ساتھی یوں اچانک ساتھ چھوڑ جائے تو غم ناقابل برداشت ہو جاتا ہے ...... جانے والے کا سوگ اسطرح نہیں مناتے کہ انسان اپنے آپ کو بھول جائے ...... اپنی ساری ذمہ داریاں بھول جائے ...... تم نے ہسپتال جانا بھی بند کر دیا ...... اب سنبھالو اپنے آپ کو ......

بیٹی کا حال روز بروز بد سے بدتر ہوتا دیکھ ماں کا دل چھلنی ہوا جا رہا تھا ...... وہ بڑی بیقراری سے بھرت کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی ...... پلوی سوچتی رہتی کسطرح آگ کے دریا کو پار کروں ...... اسکو لگا منوج اس پار کھڑا اس کو بلا رہا ہے ...... کہہ رہا ہے ...... مجھے ڈاکٹروں سے نفرت ہے ...... بے حد نفرت ...... ایسا نہ ہو یہ ڈاکٹر تم کو بھی مجھ سے چھین لیں ...... تم ہمیشہ مجھے پاگل سمجھتی رہیں ...... میں پاگل نہیں ...... میں تو تمہاری محبت میں دیوانہ ہو گیا ہوں ...... پلوی کا جی چاہا اس آگ کے دریا کو پار کر کے منوج تک پہنچ جائے اور اسکا گلا گھونٹ دے ...... اس کا خون پی جائے ...... اداسی۔ بےبسی اور پریشانی کے عالم میں وقت کی چال بہت دھیمی ہو گئی تھی ...... وقت کٹے نہ کٹتا تھا ...... اچانک ایک دن بھرت لوٹ آیا ...... وہ سیدھا پلوی سے ملنے پہنچا ...... پلوی کی گہری پیاری آنکھیں آنسوؤں سے بھری۔ شگفتہ چہرہ مرجھایا ہوا دیکھ بھرت کا دیدہ و دل کا گوشہ گوشہ رو پڑا ...... گھبرا کر بولا ...... آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ منوج کی موت کا سوگ مناتے مناتے

تم خود بیمار ہوگئی ہو...... ذرا اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھو تو سہی...... تمہاری تو صورت ہی بدل گئی......

آنسوؤں کی لڑیاں موتیوں کی طرح پلوی کے چہرے پر بکھر گیں...... وہ آکر اس کے قریب بیٹھ گیا تو وہ فوراً ہی ذرا پرے کھسکی...... بولی...... وہ طوفان آیا تھا...... بڑا بھیانک تھا...... ایسے ہولناک طوفان ہمیشہ غلاظت اور گندگی کے ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں اور ساری کائنات کو بکھیر جاتے ہیں...... لوگ اپنی راہیں بھول جاتے ہیں...... منزلیں بدل جاتی ہیں...... میرا راستہ بھی بدل گیا ہے...... میں اب ذلت اور ندامت کے گرد و غبار میں لپٹی ہوئی ایک لاش ہوں...... میرے سارے سنہرے خواب بکھر گئے...... اب موت ہی میری منزل ہے......

اسکے آنسو رکتے ہی نہ تھے...... بھرت انتہائی پریشان ہوکر بولا...... اس طوفانی رات کونسی ایسی قیامت ٹوٹ پڑی جو تم موت کو گلے لگانا چاہتی ہو...... اس کے آنسو پوچھتے ہوئے بولا...... ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں...... دوست ایک دوسرے کی مصیبتوں کے ساتھی ہوتے ہیں...... برسوں کا ساتھ ہے ہمارا...... میں کسی حال بھی تم کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا...... وہ روکر بولی ''تمہیں وہ دوستی...... وہ بچپن کا ساتھ بھلانا ہوگا''۔

بھرت ہنسا...... حالات جیسے بھی ہوں...... کیا تم مجھے بھلا پاؤ گی...... وہ چپ رہی اسکے سوال کا جواب نہ دے سکی...... دھیمی آواز میں بولی، بہتری اسی میں ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو...... بھرت بڑی سنجیدگی سے بولا...... تم ایک بلند کردار کی...... شائستہ...... پڑھی لکھی لڑکی ہو...... لاتعداد صفات کی مالکن ہو...... تم جیسی بہادر لڑکیاں ہمت کی ڈور ایسی آسانی سے نہیں چھوڑ دیتیں...... وہ زندگی سے لڑنا جانتی ہیں...... گہری خاموشی چھاگئی......

تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صاف صاف بتاؤ کیا ہوا اس طوفانی رات جو تم اپنی زندگی سے اس حد تک بیزار ہوگئی ہو کہ موت کا سہارا لینا چاہتی ہو...... تمہارے اندر آتش فشاں چھپا ہے...... سارا لاوا باہر نکلے تو بات بنے...... وہ سہمی ۔ حیران و پریشان رورو کر اپنی بربادی کا فسانہ سنانے لگی......

بولی...... میں ہسپتال سے لوٹ رہی تھی کہ زور کی آندھی اور طوفان نے آگھیرا...... چاروں طرف سے کالے بادل گھر گھر کر آئے اور ایسے برسے کہ ذرا سی دیر میں زمین سمندر بن گئی...... رات اتنی سیاہ تھی کہ کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا...... قسمت بگڑنی تھی سو موٹر بھی خراب ہوگئی...... میں دیر تک اکیلی بیٹھی رہی...... مارے خوف کے دل بیٹھا جاتا تھا...... سڑک پر کوئی نہ تھا...... دور سے ایک گاڑی آئی اور میرے پاس رک گئی...... اندھیرے میں پہلے تو میں اسے پہچان نہ سکی...... پھر آواز آئی...... آؤ تمہیں گھر

راستہ بہت خطرناک ہو گیا ہے...... آگے کئی پیڑ ٹوٹ کر گر گئے ہیں...... وہ بولا...... تب پہچانی...... چھوڑ دوں

ہے...... میں بیٹھی ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کروں وہ آیا اور میرا ہاتھ زور سے کھینچ کر اپنی گاڑی کی طرف لے گیا۔ اسکے منھ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ جب جب بجلی چمکتی لمحاتی روشنی میں اس کا چہرہ دکھائی پڑتا۔ وہ بڑے وحشیانہ انداز میں بولا...... جب جدائی کا درد بیتاب کر دیتا ہے اور دل کی بے چینی بہت بڑھ جاتی ہے تو بہت پی لیتا ہوں...... نشے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں...... تو دل کو تھوڑا سا قرار مل جاتا ہے...... اس نے مجھے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھا تھا...... میرا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا اور وہ شیطان میرے حال زار پر ہنس رہا تھا...... میں نے رو رو کر اس سے رحم کی بھیک مانگی...... گڑ گڑائی...... مجھے چھوڑ دو...... مجھ پر رحم کرو...... وہ زور سے ہنس کر بولا...... چھوڑ دوں...... کبھی نہیں...... تم نے مجھ پر رحم کی ایک نظر نہیں ڈالی...... بڑی مشکل سے تو میرا اور تمہارا ساتھ ہوا ہے...... میں نے بہت کوشش کی چلتی گاڑی سے کود جاؤں...... بہت ہاتھ پیر مارے لیکن اس کی مضبوط گرفت سے آزاد نہ ہو سکی...... وہ بولتے بولتے رک گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

کچھ وقفہ کے بعد بولی...... وہ کہنے لگا تم کانپ کیوں رہی ہو...... میں تو تمہارا دوست ہوں...... بچپن کا دوست کیا میرا ساتھ گوارا نہیں...... کاش تم میری بیقراری کا اندازہ لگا سکتی...... میری تکلیف کو محسوس کر سکتیں تو آج یہ نوبت نہ آتی...... تمہارے بغیر میرا جینا دشوار ہو گیا ہے...... میں نے کہا تم کو اس دوستی کا واسطہ...... مجھے چھوڑ دو...... وہ کچھ سوچ کر بولا...... کونسی دوستی...... وہ دوستی جس پر بھرت کا حق زیادہ ہے۔ کیا تم واقعی مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو...... نہیں...... مجھے یقین نہیں ہوتا...... کیونکہ دوست کبھی محبت کا مذاق نہیں اڑاتے...... تم نے کبھی میرے جذبات کا احترام نہیں کیا...... میں نے کہا...... منوج ہم صرف دوست ہیں...... میں ہر دوست سے عشق تو نہیں کر سکتی...... دوستی کا جذبہ بھی بہت پاک ترین ہوتا ہے۔ اور ہم تو بچپن کے دوست ہیں...... وہ زور سے ہنسا...... دوست...... نہیں...... میں تم سے بیحد محبت کرتا ہوں...... تم میرے اندر اسطرح سما چکی ہو کہ اب تم سے جدا ہوا تو مر جاؤں گا...... میری فطرت ہے جس چیز کو چاہتا ہوں اگر اسے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا تو زور زبردستی چھین لیتا ہوں...... اس نے بوتل نکالی اور گٹ گٹ پوری خالی کر دی بولا...... اب تم مل گئی ہو تو میں شراب پینا چھوڑ دونگا...... میں تو صرف غم غلط کرنے کے لئے پیتا ہوں......

اب تم مل گئی ہو...... وہ زور زور سے ہنس رہا تھا...... آج کے بعد تم مجھ سے...... صرف مجھ سے عشق کرو گی...... کرنا ہی پڑے گا کیونکہ آج سے تم میری ہو...... صرف میری...... کل ہماری شادی ہو گی...... میں غصہ

اور بے بسی میں چلائی...... تم جیسے نیچ اور کمینے انسان سے کبھی شادی نہیں کرونگی...... وہ پھر زور سے ہنسا...... یقین کرو بالکل پاگل لگ رہا تھا...... بولا...... دھمکی مت دو ورنہ میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاؤنگا...... شادی کرنے کے لیے اتنی ناخوش کیوں ہو...... چلو...... خوشی سے نہیں تو مجبوراً کرنی پڑے گی...... میں زور سے چلائی میں جان دے دونگی پر تم سے شادی نہیں کرونگی...... اس وقت تم اپنے ہوش و ہواس میں نہیں ہو...... اس لئے تمہیں نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو...... تم خود ایک کامیاب وکیل ہو...... سب کچھ جانتے ہوئے تم کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتے...... ذرا سوچو دنیا والے کیا کہیں گے...... اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا......

وہ ہنس کر بولا...... اگر تم سوچتی ہو میرے ساتھ رات گزارنے کے بعد کوئی اور شریف مرد تم سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گا تو یہ تمہاری بھول ہے...... بھرت جو تمہیں دل و جان سے چاہتا ہے اور جس کی وجہ سے تم نے مجھے ٹھکرا دیا وہ بھی تمہیں کبھی قبول نہیں کرے گا...... میری جان یہ ہندوستان ہے صدیوں سال پرانے ریت رواجوں کو تم نہیں بدل سکتیں...... آج کی رات کے بعد تمہارے لئے دو ہی راستے ہونگے۔ مجھ سے شادی یا موت...... میں نے بچپن سے آج تک تم کو بے انتہا چاہا ہے اور آخری سانس تک چاہتا رہونگا...... میں نے تم سے اتنا پیار کیا ہے آج تک اس زمین پر کسی مرد نے کسی عورت سے نہیں کیا ہوگا...... میں نے کہا تم جیسے مرد کیا جانیں محبت کیا شئے ہے...... پیار کا دوسرا نام قربانی ہے...... خدا کے واسطے مجھے جانے دو......

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا تم نے اپنی زندگی کے ایک دن کا ایک پہر تو کیا ایک لمحہ بھی مجھے نہیں دیا جبکہ ادھر میں ہر پل تمہارے ساتھ کے لئے تڑپتا رہا...... تم نے میرے دل و دماغ اور میری سوچوں پر پورا پورا قبضہ کر رکھا ہے...... بہت عرصے کے بعد...... بہت لمبے انتظار کے بعد آج مشکل سے تو تم ملی ہو...... میں متواتر چلاتی رہی روتی رہی...... بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں میری آواز کھوگئی...... اسی رات سارے فرشتے بھی سو گئے تھے...... زمین کا حال تو برا تھا ہی آسمان سے بھی کوئی میری مدد کے لیے نہیں اترا...... کاش وہ مجھے قتل کر دیتا تو بہتر ہوتا......

اس نے میرے ساتھ وہ کیا جو کوئی شریف مرد کسی عورت کے ساتھ نہیں کر سکتا...... جو کچھ میرے ساتھ ہوا خدا اس عذاب سے ہر لڑکی کو محفوظ رکھے...... میرے اندر میں آگ دہک رہی تھی...... رگ رگ میں چنگاریاں دوڑ رہی تھیں...... اور وہ خاموش تھا...... اس کے بعد وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا...... دوسری بوتل کھولی وہ بھی پی گیا...... کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ جلائی...... شاید ماچس گر گئی......

میں تو اپنی رسوائی اور بدقسمتی پر آنسو بہا رہی تھی اور خدا سے دعا کر رہی تھی کہ کاش بجلی مجھ پر گرے

اور میرے غلیظ جسم کو بھسم کر ڈالے...... دیکھا تو آگ اس کے کپڑوں میں لگ رہی تھی...... شعلے لپک رہے تھے...... وہ اپنے ہوش میں نہ تھا...... موٹر چلانے کی کوشش بھی کر رہا تھا......

آگ دیکھ وہ گھبرا گیا تھا...... میں موقع پاتے ہی گاڑی سے کود پڑی اور تیز دوڑی...... پیچھے مڑ کر دیکھا اس کی گاڑی سامنے والے پیڑ سے ٹکرائی...... وہ جل رہا تھا...... چلا رہا تھا...... شاید اس میں ہلنے کی قوت ہی نہ رہی تھی...... میں اس بھیانک منظر کو دیکھ کر رکی نہیں...... بھاگتی رہی...... مجھے اپنی خبر نہ تھی...... آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی تھی...... میرا سر گھر کے دروازے پر ٹکرایا تو کچھ ہوش آیا......

وہ جو میرا بچپن کا دوست تھا...... مجھے برباد کر گیا تھا اور خود بھی خاک ہو گیا تھا...... میری ساری آرزوؤں ارمانوں اور خواہشات کا خون کر گیا تھا...... اتنا بے حرمت کر گیا تھا کہ میں خود اپنی نظروں میں گر گئی تھی...... اس راز کو سوائے میرے اور کوئی نہیں جانتا...... میں تمہارے ساتھ دغا نہیں کر سکتی۔ پلوی کے اندر سے آنسوؤں کا سمندر امڈ پڑا۔

بھرت نے اسکی آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا...... کیا تم واقع مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ میں تم کو اس بھنور میں اکیلا چھوڑ دونگا...... تم مجھ سے یہ راز چھپا بھی سکتی تھی...... تم دنیا کی پہلی لڑکی تو نہیں جو ایک وحشی درندے کا شکار ہوئی ہو...... افسوس تو مجھے یہ ہے کہ تم نے کوئی خطا نہیں کی اور اپنے آپ سے اتنی سخت نفرت کرنے لگی ہو...... ایک پاگل مرد کی بے جا اور بیہودہ حرکتوں کے باعث تم اپنے آپ کو غلاظت کا ڈھیر قرار دے رہی ہو...... تم بے قصور ہو...... مجرم تو وہ شیطان تھا جو دیکھنے میں تو انسان لگتا تھا لیکن تھا ایک وحشی جانور سے بھی بدتر......

اس قسم کی لڑکیاں اندر ہی اندر بکھر جاتی ہیں...... اپنی زندگیوں میں زہر گھول لیتی ہیں اور سماج بھی انہیں دوشی کہہ کر سنگ سار کرتا ہے۔ ان پر پتھر برساتا ہے اور حالات اتنے بگڑ جاتے ہیں کہ لڑکی خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے......

میں تمہارے ساتھ ہوں...... تم ایسا کچھ نہیں سوچو گی...... میں تم کو یہ زہر کا پیالہ پینے نہیں دونگا...... تم کو بکھرنے نہیں دونگا...... مصیبت کو مصیبت سمجھ لینا ہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ گنہگار کو اس کے گناہوں کی سزا مل چکی ہے۔ وہ ہمارا دوست تھا...... پاگل تھا...... اگر وہ پاگل نہ ہوتا تو کیا وہ یہ نیچ حرکت اپنی دوست کے ساتھ کرتا...... جسے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ تم ڈاکٹر ہو تم سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے۔ اس حادثے کو ذہن سے مٹانا تمہارے لئے از حد مشکل ہے پر میری خاطر سب کچھ بھلانا ہوگا۔

انسان میں معاف کرنے کی صلاحیت بڑی مشکل سے آتی ہے۔سب سے عظیم انسان وہ ہے جو دوسروں کی خطائیں بخش دے......اور میری نظروں میں میری پلوی سب سے عظیم تر ہے......لوگ دشمنوں کو معاف کردیتے ہیں ہم تو اس کے دوست تھے......ہمیں اسے معاف کرنا ہی ہوگا......مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ تمہارے اوپر ایک ناگہانی آفت آن پڑی تھی لیکن تم کو اس مصیبت سے باہر نکلنا ہوگا۔پلوی اس کا منھ تاکتی ہی رہ گئی

ہمیشہ یادرکھنا میرا جینا اور میرا مرنا تمہارے ساتھ ہے......تم بار بار دلہن بن کر میرے خوابوں اور خیالوں کو سجاتی رہی ہو......اب تو ان خوابوں کو پورے ہونے کا وقت آیا ہے......میرا پیار تمہارے اندر کی ساری کی ساری تپش کو ٹھنڈا کردے گا......اس نے تمہارے پیار کی راہوں میں کانٹے بچھائے......میں ان راہوں میں اپنی محبت کے اتنے پھول بچھادونگا کہ تم ان کانٹوں کی چبھن کو محسوس بھی نہ کرپاؤ گی......اپنے اس ماضی کے ورق کو زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر پھینک دو......کہ زندگی تو صرف جینے کے لیے ہے......

آؤ ہم دونوں مل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں......جس میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں......تم میری آرزو......میری خواہش......میرا ارماں اور میری چاہت ہو......میری ماں کا انتخاب ہو......تم سے ہی میری زندگی ہے میری ہر خوشی ہے۔

یاد نہیں ماں نے کہا تھا ہمارا رشتہ اٹوٹ ہے......مجھے فرشتہ نہ سمجھنا......میں ایک بہت ہی معمولی سا انسان ہوں......اگر فرشتہ ہوتا تو خدا اس رات مجھے ضرور تمہاری مدد کے لیے بھیجتا......بھول جاؤ اس کربناک رات کو......زندگی خوش ہوکر جینے کا نام ہے......زندگی کی بہاریں تمہارا انتظار کررہی ہیں......اب مسکرا بھی دو......وہ مسکرائی تو بھرت کو لگا سارا جہاں مسکرا اٹھا......بولا بس ایسے ہی مسکراتی رہنا......یادرکھو تم مجھے دل سے پیاری ہو......دونوں کی آنکھوں میں محبت کی جوت جاگ اٹھی......وہی محبت......پرانی......سچی......سارے جہاں کا نور پلوی کے چہرے پر چھلک آیا تھا......وہ بولا......اب رونا دھونا بند......جلدی سے تیار ہوجاؤ......ہم دونوں کو منوج کے گھر جانا ہے......وہاں جانا بہت ضروری ہے......وہ جیسا بھی تھا ہمارا دوست تھا......جو اس دنیا سے چلے جاتے ہیں ان کے بارے میں کبھی برا نہیں سوچتے......

وہ اٹھی......اور تیار ہونے چلی گئی......سوچتی رہی بھرت کتنا اچھا انسان ہے......اگر سب ایسے ہوجائیں تو دنیا کے کتنے ہی دکھ کم ہوجائیں......ایسے اچھے لوگ ہی تو اس دنیا کو جنت بنادیتے ہیں۔

☆☆☆

میں پاگل نہیں ہوں

ہائے میری قسمت پھوٹی ،نصیب ٹوٹے ۔عمر بھر کی محنت کا یہ معاوضہ ملا ہے۔نگوڑی میری آنکھوں کے تارے کو لے گئی ۔ارے وہ تو پرائی تھی ۔ بیٹے کی آنکھوں پر محبت کے ایسے پردے پڑے کہ ماں کے آنسو بھی دکھائی نہ دیئے۔نوکری تو یہاں بھی بہت اچھی تھی۔آج کل کی بہوئیں لڑکوں کو ماں باپ کے ساتھ ٹکنے کب دیتی ہیں۔اچھا دور ختم ہوگیا۔ جب بچے والدین کی خدمت کرنا اپنا فرض اور عبادت سمجھتے تھے۔ ماں باپ کے مسائل سے باخبر رہتے تھے۔آج کل کی جوان نسل کا اخلاقی زوال ہمارے معاشرے کو تباہ کر دے گا۔برابر والے مکان کی تائی جی چھاتی پیٹ رہی تھی۔ماں کے تڑپتے دل کو کس طرح تسلی نہیں ہورہی تھی۔

یہ رات میرے لئے بھی بہت بھاری تھی ۔بار بار وہ کربناک منظر آنکھوں کے سامنے آرہا تھا جب میری ماں سخت بیمار تھیں اور ڈاکٹر ان کو بچانے کی ہر چند کوشش کررہے تھے ۔ہم بھائی بہن ،عزیز ،رشتے دار پلنگ کے اطراف کھڑے ماں کا چہرہ بے بسی سے تکتے رہتے تھے۔زندگی بخشنے والے سے اپنی ماں کی زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ بابا کی اندرونی پریشانی پسینہ بن بن کر چہرے سے ٹپک رہی تھی۔دنیا کالی سیاہ چادر میں لپٹی...... چپ چپ...... بالکل خاموش تھی۔نہ جانے اس گھپ اندھیرے میں موت نے ہمارے گھر کا راستہ کیسے کھوج لیا تھا۔وہ تو دہلیز پر کھڑی دستک دے رہی تھی۔بس میری ماں کو بلا رہی تھی اور ماں کی مجبوری کہ اپنے گلستان کو چھوڑ کر اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی تھیں۔پھر جانے والے کو کون روک سکتا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔سانسوں کے آنے جانے کا سفر تمام ہوگیا ......جسم ساکت ہوگیا......اور پل بھر میں ہمارے گھر کی بہاریں لٹ گئیں...... دیوتی میرا ہاتھ زور سے تھامے تھی......اس کا ہاتھ جھٹک کر میں جا کر اپنی ماں سے لپٹ گئی تھی...... بہت روئی تھی۔دیوتی خود میرے ساتھ میری ماں کے جانے کا سوگ منارہی تھی اور مجھے تسلیاں دے رہی تھی ...... میرے آنسو پونچھ رہی تھی......لیکن یہ پہلا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ مجھے کہیں دور اندھیروں میں کھینچ لیے جارہا تھا۔۔میت اٹھائی تو ایسا لگا کہ ماں اپنے ساتھ ہمارا پورا کا پورا گھر بھی لئے جارہی تھیں ......اور پیچھے ایک ویران ......سنسان ،اداس اینٹوں کا مکان چھوڑے جارہی تھیں......اگر دیوتی کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں ان ویران اندھیروں

میں کھو جاتی۔

فون پر بھابھی کہہ رہی تھیں، منیشا تم میرے پاس آجاتیں تو بہتر ہوتا۔ میں جانتی ہوں تم رات بھر جاگی ہوگی۔ خوب روئی ہوگی...... میں نے کہا آپ کے پیار نے رونے ہی نہیں دیا...... اس وقت آپ کے پیار اور سہارے نے گھر کی ہلتی دیواروں کو تھام لیا تھا۔ ساری مشکلیں آسان کر دی تھیں...... بھابھی نے بہت سی تسلی بخش باتیں کر کے فون رکھ دیا...... میں پھر اس دنیا میں لوٹ آئی جس میں سب کچھ تھا لیکن ماں کی ممتا کی خوشبو نہ ہونے کی وجہ سے میری چھوٹی سی دنیا میں پھر کبھی خوشبوؤں اور خوشیوں کا موسم نہیں آیا تھا۔ میری ماں تو سب کچھ ادھورا سا چھوڑ گئی تھیں۔ وہ ادھورا پن آج تک میرے اندر موجود ہے۔ اس خلاء کو کون بھر سکتا ہے۔ خود ماں ہوں لیکن آج بھی اس ممتا کے لیے دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے۔

میرے آنسو بہہ رہے تھے...... دروازے کی گھنٹی بجی...... میں دیوتی کا پریشان چہرہ دیکھ کر گھبرا گئی...... تم...... ابھی ابھی تمہارا خیال دل میں آیا تھا...... وہ مجھ سے لپٹ گئی اور اس کے دل میں جو غموں کے بادل گرج رہے تھے سارے کے سارے میرے سینے پر برس پڑے۔ وہ سسک رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ وہی لڑکی ہے جو خود ہنستی رہتی تھی اور سب کو ہنساتی تھی۔ آج وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ یہ کتنی بدل گئی ہے...... وہ تو سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی...... یہ دیکھ مجھے دھکا لگا اور میں خود بھی اندر ہی اندر خوف سے لرز اٹھی...... میں نے کہا بس روتی ہی رہوگی۔ کچھ بولو گی نہیں۔ آخر ایسا کون سا سنگین مرحلہ درپیش آگیا جس کا حل تمہارے پاس نہیں۔ سب کے آنسو پونچھنے والی آج خود بے حد پریشان ہے۔ وہ میرا ہاتھ زور سے تھام کر بولی...... ایک ایک حادثہ ایسا دل چاک کرنے والا ہے...... سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں...... اپنے اتنا دکھ دے سکتے ہیں...... یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ غیروں کی دی ہوئی چوٹ انسان رفتہ رفتہ بھول جاتا ہے لیکن اپنوں کے دیئے دکھ نشتر کی طرح رگ رگ کو کاٹتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا یہ بتاؤ ابھی کہاں سے آرہی ہو...... وہ کچھ دیر کو خاموش ہوگئی...... پھر رک رک کر بولی...... پاگل...... خانے...... سے...... یقین کرو میرے سینے میں اتنی وسعت نہیں کہ اتنے دکھ اور غم سما جائیں...... لگتا ہے سینہ پھٹ جائے گا...... اس کی درد بھری آواز اور چہرے پر پھیلے شدید کرب کو دیکھ کر میرے دل کو بھاری جھٹکا لگا...... میں نے بے یقینی سے کہا میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کھل کر بات کرو...... وہ بولی سچ کہہ رہی ہوں...... اور جانتی ہو ان پاگل اور مفلسوں کی انجمن میں...... کون ہے اب تو

ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے تاک رہے تھے...... وہ خاموش تھی...... کافی وقفہ کے بعد ایک گہری سانس لے کر بولی...... میری ماں...... اب تو اس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے...... مجھے تو ایسا لگا کہ میرے سر پر بم پھٹ گیا ہو...... میں اس کو کیا سہارا دیتی۔ اس بم کی کرچیں میرے دماغ کو چھید رہی تھیں اور خون آنسو بن کر بہہ نکلا تھا۔ اب میری اور دیوتی کی حالت یکساں تھیں...... دونوں خاموش...... بس آنسوؤں کے دریا بہے جا رہے تھے۔

پھر میں نے اس خاموشی کو توڑا...... امریکہ سے فون تو کرسکتی تھیں...... میں ماسی کی خبر تمہیں دیتی...... میرا اور تمہارا رشتہ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط اور گہرا ہے...... دوستی اور پیار کا رشتہ۔ وہ افسردگی سے بولی...... مجھے خون کے رشتوں پر بھروسہ ہے اور نا یقین...... بچپن کے پیار کے رشتے پر زیادہ اعتماد ہے۔ اس لئے تو تمہارے سامنے اپنے دل کے زخم کھول کر رکھ دیئے ہیں...... فون تو جب کرتی جب مجھے یقین آجاتا...... دل بار بار کہتا...... نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا...... یہ سب جھوٹ ہے...... شاید اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دے کر بہلانے کی کوشش کررہی تھی۔ آج اپنی آنکھوں سے حقیقت دیکھی تو ایسا لگا میرے جسم میں خون کا ہر قطرہ جم گیا ہو...... ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے تھے...... زمین پاؤں تلے سے کھسکتی جا رہی تھی اور میں ڈگمگا رہی تھی...... اپنے دل ودماغ اور پورے وجود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کررہی تھی...... کہ جانکی نے آکر مجھے تھام لیا...... میں نے اسے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا...... اب میں تمہارے ساتھ ہوں...... حوصلہ رکھو...... اپنے آپ کو سنبھالو...... اور یہ بتاؤ ماسی کی حالت کیسی ہے...... وہ سر اٹھا کر بولی...... اگر پاگل ہوتی تو شاید ان کو وہاں دیکھ کر میرے دل کو صبر آجاتا...... خدا کا شکر ہے وہ اپنے پورے ہوش وہواس میں ہیں...... مجھے دیکھتے ہی بولیں...... مجھ سے ڈرنا نہیں...... میرے پاس آؤ یقین کرو میں پاگل نہیں ہوں...... ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر روتے رہے...... پھر میں نے بڑی مشکل سے اپنے من کو سنبھالا۔

میں نے کہا...... ماں مجھے جانکی نے سب بتادیا ہے...... میں جانتی ہوں تم بالکل ٹھیک ہو...... میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی ...... اور یکا یک میرے دماغ میں ایک بھیانک سوال اٹھا...... کہاں لے کر جاؤں گی ...... ماں بولی مجھے تو یقین ہوگیا تھا کہ زندگی کے دروازے میرے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہوگئے ہیں اور میں تمہیں کبھی بھی دیکھ نہیں پاؤں گی اور نا ہی تم کبھی یہ معلوم کرسکو گی کہ تمہاری ماں

اس پاگل خانہ میں تنہا زندگی کا آخری سفر طے کر کے چلی گئی...... بے نام...... بے شناخت...... لیکن جب گوتم نے مجھے ماں کہہ کر پکارا تو میرے دل میں امید کی ایک ننھی سی کرن روشن ہوئی...... جانکی کو تم جانتی ہو...... وہ یتیم لڑکی جسکی پرورش اور شادی ماں نے کی تھی۔ گوتم جانکی کا شوہر ہے اور وہیں کام کرتا ہے...... دونوں نے ماں کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی......

جھگڑے اور نفاق تو سب ہی خاندانوں میں ہوتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کے میرا خون...... میرا اپنا بھائی اپنی سطح سے اتنا گر گیا ہے...... وہاں کا منظر بہت ہیبت ناک ہے۔ کچھ تو واقعی پاگل ہیں اور کچھ ایسے بدنصیب بھی ہیں جن کو ماں کی طرح ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان کی بے چارگی کا ذکر کیا کروں...... اپنوں نے محبت سے محروم تو کر دیا ہے...... ان کی آزادی بھی چھین لی ہے۔ وہ زندہ تو ہیں پر زندہ رہنے کے سارے حق چھن چکے ہیں۔ وہ تو سب کے سب زندہ درگور ہیں...... زن...... زمین اور زیور کے لالچ نے کتنی ہی مجبور عورتوں کی زندگیاں برباد کردی ہیں۔ کیوں عورت ہی ان زہریلے تیروں کی ہدف بنائی جاتی ہے۔ عورت ہی پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔

کسی نے دوسری عورت کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنی بیوی کو...... اپنے بچوں کی ماں کو وہاں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جانے کو چھوڑ دیا ہے...... تو کسی نے دولت کی لالچ میں۔

ماں کو تو ساری عمر دوسروں نے عزت اور عظمت بخشی...... زندگی کے آخری ایام میں اپنے ہی بیٹے نے ذلیل وخوار کر دیا...... اسے دوزخ کی آگ میں جلنے کو چھوڑ دیا...... کیا عورت کی عزت کبھی بھی کہیں بھی کسی کے بھی ہاتھوں میں محفوظ نہیں رہ سکتی...... ذرا سا طوفان کا جھونکا آیا اور عورت کی عزت اور غیرت کی چادر اڑا لے گیا...... افسوس تو یہ ہے کہ طوفان ان کے اپنے ہی آنگن میں اٹھتے ہیں...... ماں کی وسیع وعریض کوٹھی میں سومناتھ اپنی ماں کو ایک کونے میں پناہ نہ دے سکا۔ کیا عورت کا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا...... اپنی کوکھ سے پیدا کی ہوئی اولاد بھی نہیں...... آڑے وقت پر وہ بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

میں نے کہا جب ہم بچھڑے تھے اس وقت تو تمہارے خاندان میں خوشحالی ہی خوشحالی تھی...... وہ بولی آفتوں اور مصیبتوں کا آغاز تو جب ہوا جب رچا شادی ہو کر گھر میں آئی...... خاندان اچھا تھا...... سب کا کہنا تھا لڑکی ہیرا ہے...... بس شادی ہوتے ہی ہیرے کی چمک جاتی رہی...... ماں باپ کی لاڈلی...... نازوں نخروں میں پلی اکلوتی بیٹی ہے...... مغرور...... تند مزاج...... اس کی ماں نے تعلیم تو بہت اچھی

دی...... تربیت نام کو نہ دی...... اچھی تعلیم اچھی تربیت کے ملاپ سے ہی تو اخلاق میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ان کی آنکھوں میں بڑوں کا لحاظ اور پاس ہی نہیں۔شادی کے بعد الگ رہنے کی ضد پکڑ لی...... ماں نے سنا تو بلا کر کہا یہ تمہارا ہی گھر ہے...... گھر چھوڑ کر نہ جاؤ...... کڑک کر بولی مجھے گھر نہیں آزادی چاہیئے اور پیٹھ موڑ کر چل دی۔ماں بیٹے کے سامنے گڑگڑائیں...... تمہارے بغیر ایک ایک پل جینا محال ہو جائے گا...... تم بڑے ہو...... بڑا بیٹا تو باپ کا سہارا ہوتا ہے...... تمہارے پتا بھی اتنی بڑی بزنس اکیلے کیسے سنبھالیں گے۔وہ تو ایسا نا خلف نکلا۔ماں کے آنسوؤں کا بھی لحاظ نہ کیا۔

بیٹے کی جدائی کا غم اور شدید ذلت کے احساس نے میرے والدین کو وقت سے پہلے ضعیفی کی کھردری راہوں پر چلنے کو مجبور کر دیا...... بیٹا جو بیگانہ ہوا میرے بابا کی ساری یاس اور امیدیں ٹوٹ گئیں ...... وہ اسی صدمے میں بیمار پڑ گئے...... بیٹا تو ایسا بدل گیا تھا بیمار باپ کو دیکھنے بھی نہیں آیا...... بابا دل میں یہی دکھ لے کر چل بسے۔پھر دنیا والوں کو دکھانے کے لیے اُرن کو آنا ہی پڑا...... اُس کو نہ بابا کے مرنے کا کوئی غم تھا نہ ماں کے ساتھ کوئی ہمدردی تھی۔دونوں بھائیوں کے طرز عمل دیکھ کر مجھے ڈوبنے کے آثار نظر آرہے تھے۔مجھے ڈر تھا الگ رہنے کے شوق میں ایک دن اُرن اپنوں کو اور اپنی منزل کو بھی کھو دے گا......

اس دنیا میں جو انسان اپنے قافلے کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے وہ راستے کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں...... پھر اُن کو اپنا کوئی بھی نظر نہیں آتا...... اور وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے...... بابا کی موت اور اُرن کی بے وفائی اور بے اعتنائی نے ماں کو بالکل پسپا کر ڈالا۔پندرہ دن میں ماں کے ساتھ رہی...... جاتے وقت یوں لگ رہا تھا کہ اپنا دل وجان ماں کے ساتھ ہی چھوڑے جا رہی ہوں۔

اب چھوٹے کو مکمل آزادی مل گئی تھی۔وہ کلب سے آدھی رات گئے واپس آتا۔نا ماں کا خیال اور نا ہی بزنس کی فکر۔کلب میں غلنی سے ملا...... وہ ماڈل تھی...... اُس کے چاہنے والے اُسے گلیمر گرل کے نام سے پکارتے تھے۔اس گل بدن کا لب ولہجہ بھی بہت دلکش تھا...... ادائیں ایسی دل لبھانے والی کہ مردوں کے دل مچل مچل جاتے۔بڈھے جوان سب مرد اُس کے گرویدہ تھے۔ناز واداؤں کی دنیا میں وہ ایسی گم بھی نہ تھی کہ آنے والے کل کی فکر نہ ہو۔خوب جانتی تھی کہ حُسن اور جوانی کے ڈھلتے ہی وہ اور اُس کی تصویر مردوں کے ذہنوں سے مٹ جائے گی...... اُس کو اپنی رنگ برنگی خواہشوں اور عیش وعشرت کے لیے ایک حسین جوان کی تلاش تھی...... سومناتھ کو اُس کی مشتاق نظروں سے گھیر لیا۔سومناتھ کو یقین دلایا شہر کے

کئی دولت مند...... زندگی کے سفر میں اُس کے ہم سفر بننے کے خواہش مند ہیں...... لیکن وہ اُس کی خاموش نگاہوں کی اسیر ہوگئی ہے۔ سب مجھ پر مرتے ہیں لیکن میں تم پر مرمٹی ہوں۔ دل کے ہاتھ مجبور ہوں...... یہ دل تم کو دے بیٹھی ہوں۔ حُسن کی شہزادی جو سب کے دلوں پر سکونت کرتی تھی۔ اپنی محبت اور اپنے وجود کو سومناتھ کے قدموں میں ڈالنے کو تڑپ رہی تھی...... نشیلی آنکھوں میں خود سپردگی کی دعوت لیے جواب کی منتظر تھی۔ سومناتھ بھی اُس کی متلاشی نظروں سے بچ نہ سکا۔ پیار کا سلسلہ شروع ہوا...... عشق کے چرچے ہر زبان پر ہونے لگے۔

ماں کو خبر ہوئی تو خاندانی وقار اور عزت کا واسطہ دے کر بولیں تم اپنے مقام کو بھول رہے ہو۔ تمہیں خود اپنی پہچان نہیں رہی۔ ہمارے سماج میں ایسی لڑکیاں قابلِ عزت تصور نہیں کی جاتیں۔ ایسی لڑکیوں کے رشتے قائم نہیں رہتے۔ کسی کی تابعداری قبول نہیں کرسکتیں۔ شادی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ محبت کرنا نہیں جانتی...... صرف دولت کے لالچ میں تمہارے قدم چوم رہی ہے...... یہ لڑکی اس گھر کی زینت کبھی نہیں بن سکتی...... وہ بھی کھڑا سنتا رہا...... وہ تو نلنی پر دیدہ و دل سے نثار ہو چکا تھا اور نلنی کو ہم سفر بنانے کی ٹھان لی تھی۔

ماں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ اُن کا بیٹا اتنی پستیوں میں اتر جائے گا۔ بس اُس کے منحوس قدم گھر میں آئے اور ہمارا سب کچھ غرق ہوگیا۔ اب تو سومناتھ کا زیادہ وقت ناچ رنگ اور مے خواری میں گزرنے لگا...... گھر میں بھی عجیب قسم کے لوگوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ ماں نے اعتراض کیا تو نلنی نے ماں کے خلاف سازش شروع کردی۔ اُسے تو تکرار کرنے کا شوق تھا...... وہ ایک نیچ اور پسماندہ گھرانے سے ایک بڑے گھر میں آئی تھی۔ سومناتھ کو تو اُس نے بڑی آسانی سے حاصل کرلیا تھا، اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا...... ماں کی دولت دیکھ کر اُس کے دل میں نئی خواہشات بیدار ہوگئیں...... دولت کی بھوک اور ہوس حد سے زیادہ بڑھ جائے تو انسان کا ضمیر مرجاتا ہے اور وہ حیوان بن جاتا ہے۔ نلنی ماں کی ساری دولت ہڑپنا چاہتی تھی اور ماں کی صورت گھر میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

نلنی بات بات پر طوفان کھڑا کردیتی۔ چیختی چلاتی...... نوکروں کو ڈانٹتی...... پہلے تو سومناتھ نے سوچا وقتی ناراضگی ہے۔ دھیرے دھیرے حالات بہتر ہوجائیں گے، تم جانتی ہو سومناتھ خاموش مزاج انسان ہے۔ اُس احمق نے نلنی کی چال کو وقتی غصہ سمجھا...... جب حالات بد سے بدتر ہوئے تو ایک دن وہ

زور سے چیخا...... بڑے تیوروں سے نلنی کو دیکھا اور بولا تم نے اس گھر کا چین ہی لوٹ لیا...... کیا تکلیف ہے تمہیں ۔ میری ماں سے اتنی بے زار کیوں ہو...... اُس کے اندر تو حشر برپا ہو چکا تھا...... وہ بے قابو ہو گئی ۔ بڑے غرور سے گردن اونچی کر کے زہر خند لہجے میں بولی...... چلاؤ تم...... میں کسی کی باتیں سُننے کی عادی نہیں ہوں ۔ میں بھی سب کو چلا چلا کر بتاؤں گی کہ تمہاری ماں پاگل...... میں پاگل عورت کے ساتھ رہ کر خود پاگل ہونا نہیں چاہتی ۔ ان کو علاج کی ضرورت ہے...... سو ان کو کسی پاگل خانے میں بھیج دو...... میں نے تم سے شادی اس لیے نہیں کی کہ ساری جوانی اس پاگل خانے میں گزار دوں ۔ اگر میری شرط منظور نہیں تو مجھے طلاق دے دو...... وقت کی ستمگری تو دیکھو...... ٹھہر گیا تھا...... بیٹا گم صُم کھڑا سُن رہا تھا اور ماں آنکھیں پھاڑے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں...... سوچ رہی تھیں ہائے یہ بڑھاپا اور یہ تنہائی انسان کو اتنا بے بس اور حقیر بنا دیتی ہے کہ بیٹوں کی نگاہوں میں بھی کوئی عزت اور وقعت نہیں رہتی...... میرے بیٹوں کو ماں میں ایک بھی خوبی نظر نہیں آتی...... کیا بیٹا بھی مجھے پاگل سمجھتا ہے...... روز روز کے ہنگاموں سے سومناتھ ناداں ہو گیا تھا...... اور اگر طلاق دیتا تو دوست قدم قدم پر مذاق اڑاتے...... رسوا کرتے...... کہتے کیسا جوان مرد ہے ایک عورت کو بھی سنبھال نہ سکا ۔ تم سوچتی ہو طلاق صرف عورتوں کے لیے عذاب ہے ۔ مردوں کی زندگی پر بھی اس کا برا اثر پڑتا ہے ۔ لوگ ہزاروں سوال کرتے ہیں...... جینا محال کر دیتے ہیں ۔

ایک دن سومناتھ نے نلنی کے قاتلانہ فیصلے کے سامنے سر جھکا ہی دیا...... ماں کو اٹھایا...... سوٹ کیس میں کچھ کپڑے ڈالے...... اُس نے ماں کو سوچنے اور بولنے کا وقت ہی نہیں دیا...... رات کے اندھیروں میں یہاں چھوڑ گیا...... میں بولی دوست تو اب بھی سخت ملامت کرتے ہوں گے...... وہ بولی سب جانتے ہیں ماں اپنے کزن سے ملنے امریکہ گئی ہیں ۔

یہ سنتے ہی خوف اور مایوسی میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی ۔ دیوتی کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرتے رہے اور پھر کچھ دیر کے لئے ہم دونوں خاموش ہو گئے...... پھر وہ کچھ سوچ کر بولی وہ ماں کیا کرتی جس کا بیٹا خود ماں کو سولی پر چڑھانے کو تیار کھڑا تھا...... جس کے ایک ایک لفظ نے ماں کے جسم کو کیلوں کی طرح چھید ڈالا تھا...... دُکھ اور ندامت سے ماں کا سر جھک گیا تھا اور آنکھیں زمین سے لگ گئی تھیں...... جب ماں نے نظریں اٹھائیں تو بیٹا ماں کو اژدھے کے منہ میں جھونک کر جا چکا تھا...... ایسے عذاب سے خدا سب ماؤں کو محفوظ رکھے ۔ جب دُکھوں اور مصیبتوں کی بھیڑ میں ایک بے گناہ ، کمزور اور

مجبور انسان بھٹکتا پھرتا ہے تو آسمان سے فرشتے آکر اُسے تھام لیتے ہیں۔ بیٹا تو اپنی ماں کو بے سہارا اور کنگال کر گیا تھا۔ گو تم نے آکر ماں کو سہارا دیا...... میں نے کہا میں تو مردوں کو ہی الزام دوں گی...... یوں تو کہتے ہیں ہم ہیں تو زمانہ ہے...... زمانے کے مالک اتنے کمزور کیوں ہیں...... اپنی خوشیوں کی خاطر دوسروں کے ناجائز ارادوں پر سر جھکا دیتے ہیں۔ اپنے فرائض بھول کر حیوانی سطح پر اتر آتے ہیں۔ دیوتی میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی...... تم ہر سال کی طرح ماں کی یاد میں آج تک آنسو بہاتی ہو...... میرے دو جوان بھائی اپنی ماں کی حفاظت نہ کر پائے اور ماں کی ممتا کی گہرائیوں کو دیکھ رو کر بولیں بچوں کی یاد ساری ساری رات جگاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے اُن کو بنا دیکھے ایک عمر بیت گئی ہے۔ شاید میں ہی قصوروار ہوں...... اُن کی تربیت دینے میں مجھ سے ہی کوتاہی ہوئی ہوگی۔ بیٹوں کی تقصیروں کا ذمہ بھی اپنے ہی سر لے لیا۔ ایسی ماں کے بیٹے اتنے بے ضمیر کیسے ہو گئے...... وہ تو روئے جا رہی تھی۔

میں نے کہا عورت ہو...... دل بھر کر رو لو...... بس رو ہی تو سکتی ہو...... لیکن رونے سے نصیب نہیں بدلتے۔ ایک دو روز کا رونا ہوتا تو رو کر تمہارے دِل کو تسلی ہو جاتی...... یہ تو زندگی بھر کا رونا ہے۔ تم کیا سوچتی ہو تمہارے آنسو اس داغ کو دھو سکتے ہیں۔ بس یہ سوچ کر صبر کر لو کہ قسمت کا لکھا مٹایا نہیں جا سکتا اور انسان خود اپنی قسمت لکھ نہیں سکتا۔ جو خدا کو منظور ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ اب یہ آنسو پونچھ ڈالو...... اور کچھ کرنے کی سوچو...... وہ بڑی نا امیدی سے بولی...... کیا سوچوں...... میرا ذہن تو ماؤف ہو گیا ہے...... کام ہی نہیں کر رہا۔

میں نے اُسے اٹھایا...... ذرا اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھو۔ آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر پہلے اپنے آپ کو سنبھالو...... کچھ کھا پی لو...... پھر چلتے ہیں...... وہ بولی کہاں...... ہسپتال میں، جانتی ہوں ان حالات میں تم ماں کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں...... کیا میں اُن کی بیٹی نہیں ہوں...... کیا یہ گھر ان کا نہیں ہے...... بولو...... پرے ہوتے ہوئے وہ وہاں نہیں رہ سکتیں...... آج اور ابھی اُن کو گھر لے آئیں گے...... وہ میرا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی...... یہ کیسے ہو سکتا ہے...... میں نے کہا دیوتی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شدّتِ غم سے تمہاری یادداشت بھی کم ہو گئی ہے۔ تم سارے پُرانے رشتے بُھول گئی ہو...... میں نہیں بھولی...... ایک ایک دن اور ایک ایک پل کا حساب میرے دماغ میں تازہ ہے...... میری ماں کا جانا اور پھر تمہاری ماں کی محبت میں کیسے بُھول سکتی ہوں۔ ہزاروں بار تو انہوں نے میرے آنسو پونچھے اور سینے

سے لگایا ہوگا۔ کونسی مصیبت آئی جس میں انہوں نے آ کر میرا ہاتھ نہ پکڑا ہو...... یاد ہے میرا جنم دن وہ کبھی نہیں بھولتی تھیں...... کیوں...... وہ یہ سب کیوں کرتی تھیں۔ بس میرے اس ایک سوال کا جواب دو تو تمہارے سوال کا جواب تمہیں خود بخود مل جائے گا۔ وہ گھبرا کر بولی پہلے پرتھوی سے تو اجازت لے لو...... میں نے کہا ارے...... یہ گھر میرا اور پرتھوی دونوں کا ہے...... میرا بھی اس گھر پر اتنا ہی حق ہے جتنا پرتھوی کا ہے۔ اپنوں کو گھر میں لانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ وہ تو ماسی کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے...... جانتی ہو اُن کی ماں نے اُن کی باہوں میں آخری سانسیں لی تھیں۔ وہ تو ماں کے پیار کے لئے تڑپتے ہیں...... پرتھوی بزرگوں کو عزت دینا اور پیار کرنا جانتے ہیں...... وہ اس بات کے قائل ہیں بزرگوں کے قدموں سے گھر میں برکت رہتی ہے۔ ابھی تو کام سے لندن گئے ہیں...... واپسی میں کچھ دن اور لگیں گے۔ دیوتی نے مشکور نگاہوں سے مجھے دیکھا...... آنکھیں جھپکا رہی تھی...... شاید اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے کہا مجھ پر اعتماد کرو...... تم بڑی ہی نایاب چیز میرے ہاتھوں کے سپرد کر کے جاؤ گی...... یہ نہ سمجھنا کہ میں تم پر اور ماسی پر کوئی احسان کروں گی...... مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ مدت کے بعد میری اپنی ماں میرے گھر آ رہی ہیں...... وہ دھیرے سے بولی...... مسلسل صدموں سے شکستہ دل...... خستہ جاں ہو گئی ہیں...... بیٹوں کی بے وفائی اور بے اعتنائی سے زخموں کے درد چہرے پر کالے بادلوں کی طرح چھائے ہوئے ہیں...... کتنی خوبصورت تھیں...... اب دیکھو گی تو صدمہ سے تمہارے آنسو نکل پڑیں گے...... بالکل بدل گئی ہیں۔

واقعی ماسی افسردگی میں گھری بیٹھی تھیں...... مجھے دیکھ کر دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے ان آنسوؤں کو روکا جو آنکھوں میں بھرے ہوئے تھے...... وہ رو پڑیں...... بولیں بڑے کھوٹے نصیب ہیں میرے...... میں بولی...... نہیں ماسی دو بیٹیوں کی ماں کے نصیب کھوٹے کیسے ہو سکتے ہیں...... آپ تو قسمت والی ہیں آپ کی دو بیٹیاں آپ کے سامنے کھڑی ہیں...... یہ بیٹیاں ماں پر جان دیتی ہیں...... جو ہو چکا اسے مٹایا نہیں جا سکتا...... بھلانا ناممکن ہے...... اب میرے آنسو بہنے لگے تھے...... میں آپ کو لینے آئی ہوں...... ماسی نے ایک سرد آہ بھری...... مجھے اب اس قید سے رہائی نہیں مل سکتی۔ گوتم بولا کیوں...... نہیں مل سکتی...... آپ کا تو کوئی وارث نہیں جو یہاں آ کر آپ کے بارے میں کبھی بھی کچھ دریافت کرے...... آپ کا نام تو لاوارثوں کی فہرست میں ہے...... اتہ پتہ کچھ

بھی نہیں ...... اپنا نام کیسے بتاتی ...... میرے نام کے ساتھ میرے سارے خاندان کی عزت جڑی ہے ...... کل سب کو معلوم ہوتا ہے تو بیٹوں کی بے عزتی ہوتی ...... ماں تو ہمیشہ اپنے بچوں کی خطاؤں پر پردہ ہی ڈالتی ہے۔

وہاں کا ماحول بہت دردناک تھا ...... ہر چہرہ رنج والم کی تصویر ...... چہروں پر غضب کی اداسی اور خوف چھایا ہوا ...... میرے تو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے ...... گوتم کی مدد سے ماسی کو اس قید سے رہائی مل گئی ...... گھر لوٹتے وقت ماسی کے لئے نئے کپڑے خریدے ...... دیوتی نے انہیں نہلا دھلا کر صاف شفاف کپڑے پہنائے تو ماسی کا چہرہ ہی بدل گیا ...... کھانا کھا کر وہ تو آرام سے سو گئیں ...... دیوتی ان کے پاس بیٹھی کبھی روتی اور کبھی ان کا چہرہ گھورتی ...... ریما گھر آئی ...... اپنی ماسی اور نانی جی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی ...... دیوتی کے ساتھ دن کتنی جلدی بیت گئے پتہ ہی نہیں چلا ...... دیوتی کے جانے کا وقت آ گیا ...... اسی دن پرتھوی بھی لوٹے ...... میں نے پرتھوی کو تھوڑا سا ماسی کے لیے بتا دیا تھا ...... وہ آئے ...... دیوتی سے ایسے ملے جیسے بہت پرانی جان پہچان ہو ...... بولے تمہارا ذکر تو ہمارے گھر میں روز ہی ہوتا تھا ...... تم سے ملنے کی بہت خواہش تھی ...... منیشا تو نصیبوں والی ہے ...... پیار کرنے والے بھائی بہن ہیں ...... میرا ہی اپنا کوئی نہیں ...... ایک چھوٹی بہن تھی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی ...... مجھے اس کے بغیر بہت اکیلا سا لگتا ہے۔ کیا تم میری چھوٹی بہن کی جگہ ...... پرتھوی کی آواز رندھ گئی ...... آنکھیں بھر آئیں ...... دیوتی آگے بڑھی اور پرتھوی نے اس کے سر پر پیار بھرا ہاتھ رکھ دیا ......

دیوتی کے جانے کا وقت ہو گیا تھا ...... وہ تو ایک قدم آگے بڑھتی اور مڑ کر ماں کو دیکھتی ...... دروازے تک گئی اور پلٹ کر آئی اور ماں سے لپٹ گئی ...... وہ تو ایسے رو رہی تھی جیسے اب کبھی دوبارہ ماں سے ملنا ہی نہ ہو گا ...... بولی کیسے برے نصیب ہے میرے اپنی ماں کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی ...... میرا دل ڈرتا ہے ...... دل میں بڑی ہولناک سی پہیلی ہوئی ہے ...... پرتھوی نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے ...... بولے بے فکر ہو کر جاؤ ...... تم ماں کو ان کے بیٹے کے گھر چھوڑ کر جا رہی ہو ...... اپنے اس بھائی پر بھروسہ رکھو ......

ماں نے اپنے اندر کی مضبوطی کا اظہار کرتے ہوئے دیوتی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا پرتھوی اور منیشا پر مجھے پورا بھروسہ ہے ...... تم بھی اس ہی یقین کے ساتھ اپنے گھر واپس جاؤ ...... تمہارے چھوٹے

چھوٹے بچوں کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے اور جانا بہت ضروری ہے۔ تمہارا خوشحال خاندان ہے۔ نیک شوہر ہے۔ آئندہ اپنے نصیبوں کو کبھی برا نہ کہنا...... خدا تم کو ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے...... لڑکی اپنے ہی گھر میں اچھی لگتی ہے......

دیوتی ماں سے لپٹ گئی...... ماں نے بیٹی کے آنسو پونچھے...... بولیں خوش خوش جاؤ...... دیوتی نے مجھے گلے لگالیا...... ریما کو پیار کیا...... ماں اور اپنے بھائی کے چرن چھوئے...... اب نہ آنکھوں میں آنسو تھے نہ چہرے پر خوف تھا...... وہ موٹر کی طرف بڑھ گئی......

دیوتی فون پر ماں سے باتیں کرتی...... ماں کی زبان پر بیٹوں کا نام کبھی نہ آیا...... میں زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتی...... ماسی ریما کو کہانیاں سناتیں...... میں نے کئی بار چور نظروں سے دیکھا...... وہ بڑی محبت سے ریما کے سر پر ہاتھ پھیرتیں...... پرتھوی ان سے بہت نرمی اور محبت سے پیش آتے...... لیکن اکیلے میں ان کی اداس آنکھوں میں محرومیوں اور غموں کے سایے نظر آتے تھے۔ ماں تو خاموش تھی۔ ممتا تڑپ رہی تھی۔ اب بھی انتظار تھا۔ آنکھیں دروازے کی طرف یوں تکی رہتیں جیسے ابھی کوئی آنے ہی والا ہو...... اور آنے والے تو اس دنیا کے رنگین نظاروں میں کھو گئے تھے۔

میں نے لاکھ جتن کیے...... لیکن میری توجہ اور پیار میں اتنی طاقت کہاں تھی جو ایک مجبور ماں کے دل کی آگ بجھا سکتی۔ وہ تو اندر ہی اندر خاک ہوئی جارہی تھیں...... ایک دن اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی...... مجھے پاس بلایا...... ہزاروں دعائیں دیں...... من ہی من میں سوچ رہی تھی ماسی نے اپنے بچوں کے لیے خدا سے کیا نہ مانگا ہوگا۔ بیٹوں کے عظیم گناہوں کی تلافی تو ضرور مانگی ہوگی...... وہ دھیرے سے بولیں...... تم نے ایک ماں کی خالی جھولی پیار سے بھردی...... پیار ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ دیوتی کا خیال رکھنا...... وہ ڈاکٹر کے آنے کا انتظار نہ کرسکیں...... ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور چلی گئی...... میں دیکھتی ہی رہ گئی وہ تو اپنی زندگی کا ناہموار سفر طے کرچکی تھیں...... چہرے پر سکون تھا...... آج قفس سے رہائی مل چکی تھی......

دیوتی آئی...... بہت روئی...... بولی میں جانتی تھی ماں چلی جائیں گی...... بیٹوں نے انہیں جینے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا...... کتنا دکھ اٹھا کر گئی ہیں...... نا جانے مر کر بھی چین ملے گا یا نہیں...... جب سب کام پورے ہوگئے تو ہم نے ان کا سوٹ کیس کھولا...... بیٹوں کے نام جو خط بھیجے تھے ان کی ایک ایک نقل

شاید دیوتی کے لیے رکھ گئی تھی......لکھا تھا......

آج کل یہ تو عام بات ہے کے بیٹے اپنے والدین کو بھول جاتے ہیں......ان کے مسائل سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں......ماں اپنے بیٹوں کو دل سے بھلاتی کیسے......ماضی کو چھیڑنے میں میری ہی رسوائی ہے۔ حالانکہ پاگل ہونا ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ پھر بھی ہمارے وطن میں لوگ پاگلوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر کسی پاگل کو سڑک پر بچے دیکھ لیں تو اس پر پتھر پھینکتے ہیں......خاندان میں ایک انسان کا پاگل ہونا پورے خاندان کے لیے ایک دھبہ اور غیر معتبر بات سمجھی جاتی ہے......دنیا والے اس خاندان سے رشتے نہیں جوڑتے......اپنے عزیز دور بھاگنے لگتے ہیں اور رشتے توڑ ڈالتے ہیں......

زندگی کا سفینہ جب تک طوفانی موجوں سے نہ ٹکرائے تب تک طوفاں کی تیزی کا علم نہیں ہوتا......میں نے مصیبتوں کے بھنور پار کیے ہیں......مجھے اپنی اور ان سب عورتوں کی تنگ دستیاں اور تنگ حالی کا احساس ہوا جو وہاں تھیں......ایک ایک عورت قابل رحم تھی......کاش تم وہ بے بسی کا عالم دیکھ سکتے......یہ دیکھ سکتے کے تمہاری ماں وہاں کتنی بے سہارا اور بے یار و مددگار تھی......خدا نہ کرے کوئی بھی ان اذیت ناک حالات سے گزرے۔ صرف ایک ماں سمجھ سکتی ہے مجھے تم دونوں کتنے پیارے ہو......ماں اپنے بچوں کی بہبودی اور خوشیاں چاہتی ہے۔ اس بے کثیر دولت نے ہمارے نشیمن کو پھونک ڈالا......اس لیے میں نے اپنی ساری دولت ان ضرورت مند، مجبور اور مظلوم عورتوں کے لیے دے دی ہے۔ وہ عورتیں جن کے عزیزوں نے انہیں اس پاگل خانے میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے......ان کے اپنے اور ساری دنیا والے ان کے مسئلوں سے بے خبر ہیں......

صبر اور تحمل سے میری بات پر غور کرو گے تو جانو گے ماں نے دانائی سے کام لیا ہے۔ دولت کی بہتات بہت نقصان دہ اور خطرناک ثابت ہوئی ہے......دنیاوی چیزوں کی ہوس بڑھنے سے باہمی جھگڑے اور فساد پیدا ہوتے ہیں......فساد تباہی کا اعلان کرتے ہیں......میری آخری خواہش ہے میرے بیٹوں کی خوشیاں اور سکون بحال رہے......میں نے زندگی بھر اتنی دعائیں نہیں مانگی تھیں جتنی تم دونوں سے بچھڑنے کے بعد اس قید میں مانگی تھیں......اب ہر لمحے خدا سے اپنے بچوں کی خوشیاں اور عمر درازی کی دعا مانگتی ہوں......میں نے تمہارے سارے قصور......ساری خطائیں معاف کیں......میری ہی تربیت اور نصیحتوں میں غلطی ہو گی......میں اپنی زندگی کے آخری دن پر سکون ماحول میں گزار رہی ہوں......جہاں پیار اور عزت مل جائے وہی

ٹھکانہ اپنا ہوتا ہے۔ میں یہ سب پورے ہوش وحواس میں لکھ رہی ہوں...... میں پاگل نہیں ہوں......

اس پر درد سنسنی خیز خط نے ہم دونوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا...... دیوتی کے اندر درد کا ایک مدوجزر اٹھ رہا تھا...... بولی میری ماں کی زندگی کی جنگ ختم ہوئی...... بڑے صبر سے اپنے غموں کا سامنا کیا...... میرے بھائیوں کو تو ان کے ضمیر کی خلش ستاتی بھی نہیں...... سونے کیسے دیتی ہے...... کیا خاندان تھا ہمارا...... شہر میں جانا مانا...... اب تو بس قابل تضحیک ہو کر رہ گیا ہے...... ماں معاف کر گئیں لیکن عامل منصف جو سب کا انصاف کرتا ہے۔ دونوں کو ان کے کاموں کے موافق ضرور بدلہ دے گا...... وہ دیر تک بولتی رہی...... اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی...... اور میں بیٹھی سنتی رہی...... دیوتی کو جلدی واپس جانا تھا...... وہ تو چلی گئی......

دو مہینے بھی نہ گزرے تھے دیوتی نے بتایا پچھلے مہینے رچا کے پتا جی کو دل کا دورہ پڑا تھا...... ان ہی دنوں ان کو مدراس والی کوٹھی خالی کرنے کا آرڈر ملا تھا...... دونوں کے تعلقات میں کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی بیزار ہو چکے تھے ایک دوسرے سے۔ رچا ان کو چھوڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی،...... موقع ملتے ہی بیٹی کو لے کر اپنے میکے چلی گئی...... پھر ان کی خبر نہیں لی...... بس فون پر کہہ دیا میری بزنس بہت بڑی ہے اور مجھے اپنے بابا کی دیکھ بھال بھی کرنا ہے...... اکلوتی جو ہوں...... مجھے چھوٹے فلیٹ میں رہنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ یوں بھی اب ہم دونوں کا ساتھ رہنا ممکن نہیں۔

اب جب خود پر آفت آن پڑی تو ماں کی یاد آئی۔ ان کو تلاش کر رہے ہیں...... اپنے کو اس چھوٹے سے فلیٹ میں قید کر لیا ہے...... بزنس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ بہت پریشاں ہیں۔ اپنا دماغی اور قلبی سکون کھو بیٹھے ہیں......

میں نے کہا ہر انسان جانتا ہے کہ نا اتفاقی اور باہمی اختلاف سے صرف تباہیاں اور بربادیاں نصیب میں آتی ہیں۔ انسان دوسروں کو دیکھ کر بھی عبرت نہیں لیتا...... جب خود ٹھوکر کھاتا ہے تب سمجھتا ہے اور سنبھلتا ہے۔ میں جانتی ہوں اب تم ان کے لیے آنسو بہاؤں گی...... وہ جوان ہے...... ساری زندگی اس کے سامنے ہے۔ سنبھل جائے گا...... تم پریشان نہ ہو......

ایک دن جانکی میرے پاس آئی بولی چھوٹے بابو ہسپتال ماں کو کھوجنے گئے تھے...... سارے رجسٹر دیکھے مگر ماں کا نام کسی رجسٹر میں نہیں ملا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ مدد نہ کر سکے...... تو مایوس ہو کر چلے گئے...... میں بڑی کوٹھی گئی تھی...... بڑے بابو جی کے زمانے میں بات ہی کچھ اور تھی...... اب تو سناٹا چھایا ہوا

تھا...... چوکیدار بتارہا تھا چھوٹے بابو اور نلنی میں بہت جھگڑے فساد ہوتے تھے...... پھر وہ کسی اور کے ساتھ چلی گئی...... شہر کا کوئی بڑا رئیس ہے۔ بیوی بچے بھی ہیں اس کے...... چھوٹے بابو دوسرے فلیٹ میں چلے گئے تھے...... بس شراب کے نشے میں جھومتے تھے...... ان کے ذہن پر نا قابل برداشت بوجھ تھا...... کلب جانا بند کر دیا تھا...... کسی سے بات نہیں کرتے تھے...... ایک رات شراب کے نشے میں سیڑھیوں سے گر گئے...... بہت چوٹ آئی تھی...... بس جان ہی بچ گئی...... چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہیں...... پورے ہوش وہواس میں ہیں...... بڑے دردناک حال میں ہیں...... سر جھکائے گہری گہری سوچوں میں کھوئے رہتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں...... موت کا سا عالم طاری ہے...... لیکن دیدی جو اپنے ماں باپ کی عزت نہیں کرتا...... اپنے فرائض سے منہ موڑ لیتا ہے وہ خوشیوں کا حقدار نہیں ہوتا...... پرانا مالی جسے نلنی بھابھی نے نکال دیا تھا واپس آ گیا ہے...... وہ ہی چھوٹے بابو کی دیکھ بھال کر رہا ہے...... سنا ہے بڑے بھیا مدراس سے واپس آ رہے ہیں......

میں نے دیوتی کو فون لگایا...... سب کچھ اس کو بتانا چاہتی تھی لیکن بتا نا سکی...... وہ دونوں بھائیوں کو بہت چاہتی تھی...... ان کا دکھ برداشت کر رہی تھی...... سومناتھ کا دکھ برداشت نہ کر پائے گی......

وہی بولی ابھی بھی میرے بھائی ماں کو کھوج رہے ہیں...... اس ماں کو جس کی راکھ ہم دونوں گنگا میں بہا آئے تھے...... اس کی سسکیوں کی آواز مجھے فون پر سنائی دے رہی تھی اور ادھر میرے آنسو گر رہے تھے......

☆☆☆

یادوں کے خزانے

اشوک بابو......انہوں نے چونک کر سر اٹھایا......اب تم گھر جا سکتے ہو......اشوک بابو نے گھبرا کر کہا اتنی جلدی؟ ڈاکٹر ہنس کر بولے گھر جا کر آرام کرنا......ڈاکٹر نے ان کا شانہ تھپکا اور آگے بڑھ گئے۔ کچھ دوری سے بولے اکیلے نہ چل پڑنا......بیٹے کو ضرور بلا لینا۔

اشوک بابو کو خود بھی گھر جانے کا شدت سے انتظار تھا۔ ڈاکٹر کی بات سنتے ہی بے چین اور مضطرب دل دہل گیا۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بیٹے کے نہ آنے پر انہیں حیرت اور تجسس ہو رہا تھا۔ اب تو دل کے گہرے سمندر میں زبردست طوفان برپا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں خوف اور مایوسی چھا گئی۔ دل چیخ رہا تھا۔ تو جو میری پل پل کی خبر رکھتا تھا اب اتنا لاپرواہ اور غافل کیسے ہو گیا۔ تیری نظروں میں تیرے بوڑھے ماں باپ کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ تیرے بغیر سارا جگ اندھیرا ہے۔ چار دنوں سے اس بے بس باپ کے دل کی دنیا میں سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ بوڑھی آنکھیں اپنے لاڈلے کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ آج باپ کا غمگین دل بیحد خوفزدہ تھا۔ ایک ٹیس تھی جو دل وجان کو تڑپا رہی تھی۔ اس کربناکی کے عالم میں باپ کا خون پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کریں تو چادر تان کر لیٹ گئے۔

اشوک بابو اپنے غموں کے سمندر کے بھنور میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ بیٹے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے بھاگتا دوڑتا نظر آنے لگا۔ اس کی آواز کانوں میں گونجنے لگی......آنکھیں کھولیں تو دور دور تک صرف ویرانی اور سناٹا ہی سناٹا تھا۔ کوئی بھی اپنا نظر نہ آیا۔ کس کو پکارتے۔ کس کو آواز دیتے۔ تنہائی کے احساس سے دم گھٹنے لگا تھا۔ جس بیٹے کو خون دل دے کر پالا تھا وہ جب سایہ دینے کے لائق ہوا تو باپ کو بھول گیا تھا۔ پھر بھی باپ کا دل بیٹے سے کیسے بدظن ہوتا۔ انہوں نے سومیا کو مجرم ٹھہرایا۔ شادی کے بعد ہی تو گھر کی فضا میں اجنبیت سی پھیل گئی تھی۔

اشوک بابو کا دماغ ماضی کی طرف پلٹا۔ ایک کے بعد ایک دروازے کھلتے گئے۔ یادوں کی راہوں میں بھٹکتے بھٹکتے دور تک نکل گئے۔ بچپن کے خوش رنگ زمانے یاد آئے۔ وہ دن یاد آئے جب ان کے ان پڑھ والدین صبح سے شام تک اپنے پشتینی کھیت میں محنت کرتے تھے۔ دونوں کی دلی تمنا تھی کی ان کا اکلوتا بیٹا پڑھ لکھ کر افسر بنے۔ انسان کی ساری خواہشات کب پوری ہوئی ہیں۔ دونوں یہ سوچتے یہ

دنیا ہی چھوڑ گئے۔ اشوک بابو افسر تو بن نہ سکے۔ ہاں نوکری بری نہیں تھی۔ اپنا پکا مکان تھا۔ کھیت تھے۔ گزر بسر بڑے آرام سے ہورہی تھی۔

اشوک بابو کا بیٹا شرون کمار جب کالج پہنچا تو ان کے گھر پر اچانک ایسا زبردست بھونچال آیا کہ شرون کے سر سے ماں کے آنچل کا سایہ ہی اڑا لے گیا۔ اشوک بابو کے لیے یہ بھاری غم سہنا دشوار ہوگیا۔ بہت دنوں تک بیوی کے انتقال کا سوگ مناتے رہے۔ پھر بیٹے کے مستقبل کے خیال نے چونکا دیا تو ہوش سنبھلے۔ ہانپتی کانپتی زندگی پھر دوبارہ راہ پر چل پڑی۔

شرون محنتی اور ذہین تھا۔ علم کی سیڑھیاں کھٹا کھٹ چڑھتا گیا۔ بیٹے کا درخشاں مستقبل دیکھ کر باپ کا ناشاد دل کھل اٹھا۔ اس بدلتے دور میں بھی یہ لائق، فرمانبردار افسر بیٹا اپنے بابو جی کے ہر فیصلے کا مان رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ وقت ملنے پر اپنے بابو جی کے ساتھ کھیت کی دیکھ بھال بھی کرتا...... وہ ابھی اپنے لہلہاتے کھیتوں کی سیر کر رہے تھے کہ وارڈ بوئے کی آواز پر چونکے...... بابو جی کھانا حاضر ہے...... آنکھ جو کھولی تو نا کھیت تھے نا بیٹا...... تپتے صحرا کی تیز دھوپ میں اکیلے بھاگتے بھاگتے ان کا سارا بدن تپ رہا تھا۔ پسینے پسینے ہورہے تھے۔ ٹوٹے دل کی ایک ہی آواز تھی۔ میرے لال تجھ سے بچھڑ کر میں جی نہیں سکتا۔ تو میری زندگی ہے۔ کیا میں یہ سوچ لوں تیری زندگی میں اب بوڑھے باپ کا کوئی مقام نہیں رہا، تو اپنے باپ کی ساری خوبیاں بھول گیا۔ تیرے مضبوط کاندھے اتنے کمزور ہوگئے کہ اپنے ناتوان اور کمزور باپ کی بوڑھی ہڈیوں کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتے۔ بوڑھے باپ کے لیے تو جوان بیٹے کے قوی بازو ہی سائبان ہوتے ہیں۔ اشوک بابو پل پل تنہائی اور انتظار کی غضبناک آتش میں سلگ رہے تھے۔ وارڈ بوئے دوبارہ حاضر ہوگیا۔ بابو جی آپ کل جارہے ہیں۔ یہاں تو سب آپ کے گرویدہ ہوگئے ہیں۔ ایک بار جو آپ سے ملتا ہے بس آپ ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ گاؤں والے تو آپ کو بہت یاد کرتے ہونگے۔ وہ بولے جا رہا تھا اور باپ کے دل میں گہری خاموشی طاری تھی۔ سارا جہان گورستان سا معلوم ہورہا تھا۔ زندگی میں ایسی ہولناک گھڑی بھی آسکتی ہے یہ تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ویران دل کی رہ گزر میں بیٹے کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔

اشوک بابو کا ذہن پھر ماضی میں جھانکنے لگا۔ ان کے بچپن کا دوست بستر مرگ پر پڑا بڑی امیدوں سے ان کا چہرہ گھور رہا تھا۔ ان کے جواب کا منتظر تھا۔ یہ کچھ سوچنے کا نہیں کچھ کر گزرنے کا وقت تھا۔ فرض پکار رہا تھا۔ اشوک بابو نے سومیا کے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا کہ سومیا کی شادی ان کے بیٹے شرون

سے ہی ہوگی۔ سنتے ہی سومیا کے بابا کے دل کو سکون ملا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان دکھائی دی اور زندگی کی آخری لو آنکھوں میں چمکی ...... پھر ...... سب کچھ تمام ہوگیا ...... سومیا اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔

اب سومیا اپنے چاچا چاچی کے رحم وکرم پر زندہ تھی۔ اشوک بابو بس شرون کی نوکری کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا سومیا کے آتے ہی ان کے سونے آنگن میں خوشیاں ڈولیں گی۔ پھر بچوں کا شور وغل ہوگا۔ گھر میں بہاروں کی آمد ہوگی۔ اور وہ سب فکروتردد سے آزاد ہوجائیں گے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ پاس والے مریض نے آواز دی۔ سارے خیالات پھر بکھر گئے۔ اشوک بابو کل چلے جاؤ گے۔ آج کچھ باتیں کرو۔ اشوک بابو نے کچھ سنا، کچھ کہا بھی لیکن دل کا درد دل میں ہی دبائے رکھا۔

شرون کمار ذہین، حسین اور بیحد اسمارٹ جوان تھا۔ کالج میں حسین اور دولتمند لڑکیاں اس کے اردگرد گھومتی تھیں۔ شرون کمار نے کسی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ اس کے تو ہر پل ہر لمحے کی ساتھی سومیا تھی ...... پھر برسوں کے بعد اس کے گھر پر بہار اتری تھی۔ نئی دلہن کا بڑی چاہتوں اور محبت سے نئے گھر میں استقبال کیا گیا تھا۔ گھر خوشبو اور خوشیوں سے مہک اٹھا تھا۔ روشنیوں اور رنگوں کا میلا لگا تھا۔ شرون اپنی سومیا سے ملنے کو بیقرار تھا۔

شرون دبے قدموں سے آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوا تو پھولوں کی سیج خالی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سومیا اس نئی نرالی بہاروں کی دنیا سے بالکل بے خبر دریچے سے باہر ویران اندھیروں میں جھانک رہی تھی۔ کچھ گھڑیاں بیت گئیں۔ وہ بڑی لاپرواہی سے مڑ کر کچھ دیر شرون کو دیکھتی رہی۔ شرون اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جس کا برسوں صرف تصور کیا تھا۔ بس سوچوں اور خوابوں میں دیکھا تھا۔ وہ سامنے کھڑی نئی دلہن کے روپ میں غضب ڈھا رہی تھی۔ واقعی وہ بیحد حسین تھی۔ کالی کالی لمبی پلکوں سے ڈھکی بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں گورا گورا چمکتا چہرہ، لچکدار بدن، دیکھتے ہی شرون تو ایک نرالی سرشاری میں ڈوب گیا تھا۔ سومیا جیسے سکتے کی سی کیفیت میں وہیں گم صم سی کھڑی تھی۔ اسکا چہرہ ہر مسرت اور خوشی کے آثار سے عاری تھا۔ ناں ہی وہاں نئی دلہن والی شرمیلی ادائیں تھیں۔ نہ مسکراہٹ اور ناں ہی آنکھوں میں محبت کی جگمگ۔ اس کے پھول جیسے چہرے پر آنسوؤں کی لڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ آگے نہیں بڑھی۔ بڑی بے نیازی سے گردن گھما کر پھر باہر جھانکنے لگی۔ اس کی لاپرواہی اور لاتعلقی دیکھ کر شرون دنگ رہ گیا۔ بمشکل اپنے آپ پر قابو پایا۔ سومیا کے قریب جا کر بڑی محبت سے بولا تم ہم سے روٹھی ہو۔ بھلا کیوں ...... ہمیں

روٹھوں کو منانا آتا ہے...... وہ والہانہ انداز اس پر نچھاور کرنے لگا۔ سومیا فوراً شروَن کے بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہو کر دور جا کر کھڑی ہوگئی۔ شروَن ہکا بکا ایک ٹک اسے تاکتا ہی رہ گیا۔ وہ بڑی معصومیت سے بولی، میری قسمت مجھ سے روٹھی ہے۔ بچپن سے ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ بد نصیبی میرا مقدر ہے۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں...... شروَن کے دل پر زبردست دھچکا لگا...... اسے اس مظلوم لڑکی پر بے حد ترس آرہا تھا۔ اس کے سارے ارمانوں کو بڑی بیدردی سے کچل دیا گیا تھا۔ شروَن نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا اب سب کچھ بھول کر میرے ساتھ ساتھ خوشیوں کی نئی راہوں پر چلو۔ شادی دو روحوں کا بندھن ہوتا ہے۔ ہم دونوں کا پیار کا رشتہ ہے۔ سومیا کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ شروَن کو الجھی الجھی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ پیار کا رشتہ...... نہیں...... میں کسی بھی پیار کے رشتے سے واقف نہیں ہوں۔ پیار کیا ہوتا ہے میں نہیں جانتی۔ میرا دل تو نفرتوں کی سلاخوں سے چھیدا گیا ہے۔ زخموں سے بھرے میرے دل میں اب سب کے لیے نفرت کا زہر ہے...... شاید تم نہیں جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو...... اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔ نفرت کرنے والے لوگ ہمیشہ تنہا رہ جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں خوشیاں کبھی بسیرا نہیں کرتیں۔ تم اپنے دل سے نفرت کو نکال کر دل میں محبت کو آباد کرو۔ میں تمہارا دل اپنی محبت سے بھر دوں گا۔ سومیا نے تو جیسے نہ کچھ سنا نہ کچھ سمجھا ہو۔ بولی شادی۔ شادی تو زندگی بھر کی غلامی ہے...... شروَن نے محبت آمیز لہجے میں کہا شادی تو عورت کی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ تم میری ہو...... میری زندگی کی ہمسفر ہو...... اب ہم دونوں کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ اس نے چہرہ گھما لیا۔ چہرے پر پھیلا کرب گواہ تھا کہ ماضی کے کانٹے اس وقت بھی اس کے بدن کو چھید رہے تھے۔ شروَن کے لیے یہ صورتحال انتہائی غیر متوقع تھی۔ وہ تو آج تک یہی سوچتا آیا تھا کہ گاؤں کی بھولی بھالی خوبصورت سی لڑکی برسہا برس سے چراغ جلائے بیٹھی اس کی راہ تاک رہی ہے۔ آج وہ عجیب و غریب جذبات کے بھنور میں گھر گیا تھا۔ آج تو ان کی سہاگ رات تھی۔ شروَن کی برسوں کی تمنا پوری ہونے کی رات، سارے کومل خواب پورے ہونے کی رات۔ وہ شرما کر اس کی باہوں میں چھپ جائے گی۔ یہاں تو حال ہی کچھ اور تھا۔ وہ اپنی ازلی بے نیازی اور لاپرواہی سے باہر جھانکتی رہی اور شروَن اپنی تمام تر توجہ سے اس کو ہی دیکھ رہا تھا۔ رات خاموش تھی۔ دل بے سکون تھا۔ یہ لڑکی اس کے بچپن کی مانگ تھی۔ بچپن سے آج تک صرف اس کے لیے سوچا تھا اسے ہی چاہا تھا۔ اور وہ برف کی سل کی طرح ٹھنڈی کھڑی تھی۔ جیسے اس کے دل میں کوئی حسین و نازک دھڑکن زندہ ہی نہیں ہو۔

محبت ایک عجیب ہی شے ہے۔ کسی سے محبت ہو جائے پھر رعایتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔سومیا تو شروَن کی سوچوں کی ملکہ تھی۔ وہ اسے ہر حال میں یقین دلانا چاہتا تھا کہ آئندہ کوئی اور دکھ اسے چھو نہ سکے گا۔ دل کہہ رہا تھا...... یہ بالکل ناسمجھ ہے۔ چاہت کی لذت سے ناآشنا، ظلم کی شدت نے اس کی اعتماد کی ڈور توڑ دی ہے۔ اسے پیار دے۔ اپنی محبت ابر بن کر مسلسل برسنے دے۔ اس کے دل کے سارے زخم دھل جائیں گے۔ پھر اس کے دل میں اعتماد پیدا کر۔ آرزوؤں اور تمناؤں سے بھرا دل تڑپ رہا تھا اور سومیا کو شروَن کے جذبات کا بالکل علم ہی نہ تھا۔ شروَن کے دل کی راہوں میں اندھیرا پھیل گیا۔ بہت وقت گزر گیا تھا۔ سارے ارمان جی کے جی میں ہی رہ گئے تھے۔

وہ اب بھی دور خلاؤں میں دیکھتی رہی۔ شروَن نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ بڑی نرمی سے بولا اب کیا سوچنے لگیں...... وہ بنا کسی جھجھک کے بولی سوچ رہی ہوں چاچی تو غیر تھیں۔ چاچا تو میرے اپنے تھے۔ انہوں نے بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ اس بھری دنیا میں میرا ہی کوئی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور خالی خالی نظروں سے شروَن کو دیکھ رہی تھی۔ شروَن کی آنکھیں تو محبت برسا رہی تھیں۔ باہوں میں تھام کر بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا...... تم اب اکیلی نہیں ہو۔ میں سر سے پاؤں تک تمہارا ہوں۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ اس گھر کی ہر شے پر اب تمہارا اختیار ہے۔ تمہاری ہر خوشی میرا مقصد ہے۔ سومیا نے کسی بھی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ادھر ادھر نظریں گھما کر بولی۔ میرا کچھ بھی نہیں ہے۔ چاچی نے میری زمین، گھر، زیور اور کپڑے سب ہی چھین لئے۔ ایک دن تم بھی سب چھین لو گے۔ شروَن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے کہ وہ تو اپنا دل و جان اس پر نثار کر چکا ہے۔ وہ سوچنے لگا یہ محبت جیسی خوبصورت شے سے بالکل ناآشنا ہے۔ شاید اس نے میری طرح کوئی حسین خواب نہیں دیکھا۔ اس کے دل میں میرے لیے کوئی محبت کا نرم و نازک جذبہ نہیں ہے۔ شاید اس نے کبھی میرے اور شادی کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہو۔ ادھر شروَن اسے پانے کے لیے بے حد بے چین تھا۔ آج ایک لمبے انتظار کے بعد وہ ملی بھی تو بالکل اجنبی کی طرح۔ آج شروَن کو احساس ہوا وہ تو ملنے سے پہلے بھی اس سے بہت دور تھی۔ محبت کی دنیا سے بہت دور۔ وہ تو نفرت، بے یقینی اور بے اعتباری کی دنیا میں سانسیں لے رہی تھی۔ کچی عمر میں اس لڑکی پر اتنے ظلم ڈھائے گئے تھے کہ اس کے اندر کی لڑکی جل کر خاک ہو چکی تھی۔ آج بھی تازہ گھاؤ کے درد کی شدت اس کے ذہن میں ہنگامہ برپا کیے تھی۔ اس دوری نے شروَن کو بے کل کر دیا تھا۔

کسی طرح شرون نے سومیا کو سنبھال رکھا تھا۔ایک دن دودھ والے پر برس پڑی ۔بس کرو...... اتنے دودھ کا کیا ہوگا...... وہ دھیرے سے بولا بہو جی بڑے بابو جی دوبار دودھ پیتے ہیں...... وہ اونچی آواز میں بولی کام نہ کاج...... گھر بیٹھے ہیں تیرے بڑے بابو جی...... اس مہنگائی کے زمانے میں بوڑھے انسان کو دودھ پینے کی کیا ضرورت...... بابو جی نے سنا تو ان کا سارا وجود سن ہی پڑ گیا...... دودھ والا حیران تھا...... گاؤں میں بہو بیٹیاں اونچی آواز سے بات نہیں کرتی تھیں ۔ چیخ پکار سن کر شرون باہر آیا اور سومیا کو اندر جانے کا حکم دیا۔سومیا کی ذہنی حالت دیکھ کر اس کے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی ۔وہ کچھ بول نہ سکا...... جب بابو جی باہر چلے گئے تب شرون نے سومیا سے کہا ہمارے خاندان کا ہمیشہ سے پہلا اصول رہا ہے۔"بڑوں کا احترام کرنا اور سب سے محبت سے پیش آنا۔تم مجھے بہت پیاری ہو۔ بابو جی کی خدمت کروگی تو اور بھی زیادہ پیاری ہو جاؤ گی ۔وہ بولی کچھ نہیں بس غائب دماغی کی کیفیت میں شرون کو گھورتی رہی ۔کندھے جھٹکا کر اندر چلی گئی جیسے اسے کسی کی پرواہ ہی نہ ہو۔

سومیا کو سسرال میں بھر پور پذیرائی ملی تھی ۔شرون کی بے پناہ محبت اور توجہ کے صلے میں اس کا فرض تھا کہ سارے پرانے دکھ درد بھول کر اپنی نئی زندگی کا آغاز خوشیوں سے کرتی ۔محبت کے نئے مہکتے ۔مسرت بھرے جہاں میں ہنستی چہکتی داخل ہوتی۔شرون کی والہانہ محبت کا جواب محبت سے دیتی ۔لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کچھ زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ ان کے گھاؤ کبھی نہیں بھرتے اور لہو کی بوندیں آہستہ آہستہ ٹپکتی ہی رہتی ہیں۔

شرون اپنی ساری توجہ اور محبت سومیا پر لٹا رہا تھا۔اب سومیا ایک بیٹے کی ماں بھی تھی ۔شرون کو یقین تھا اس ماحول میں رہ کر سومیا اپنا ماضی ضرور بھول جائے گی ۔ بابو جی سب کچھ دیکھ کر خاموش تھے۔ سارے گاؤں کے جھگڑے نمٹانے والے بابو جی اپنے گھر کے طوفان کو نہ روک سکے۔اس گھر کی خوشیوں کو اداسی میں بدلتے دیکھ رہے تھے۔

ہسپتال میں اشوک بابو کی تمام رات بڑی بے چینی سے گزری ۔صبح لمحہ فکر قریب تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہا...... تم گئے نہیں...... بیٹے کو جلد از جلد بلاؤ...... پلنگ کم ہیں...... مریض زمین پر پڑے ہیں۔ اشوک بابو کا سر شرم سے جھک گیا۔اب تو جان مصیبت میں پھنس گئی تھی ۔ بیٹا آیا نہیں اور وہ اکیلے گھر جا نہیں سکتے تھے۔انہوں نے اپنے کپڑوں کی پوٹلی سنبھالی اور لڑکھڑاتے قدموں سے چل کر ہسپتال کے دروازے پر جا کر بیٹھ گئے ۔ ہر جوان مرد کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتے لیکن کوئی چہرہ بھی جانا پہچانا نظر نہ آیا...... یہ

آفت نہایت سخت تھی۔ ہولناک انتظار میں بہت وقت بیت گیا۔ فکر مند اور کمزور دماغ پھر ماضی کی اور چل پڑا۔ انہیں لگا کہ شرون سامنے ہی بیٹھا ہے۔ وہ دن یاد آیا جب شرون نے زمین بیچنے کی صلاح دی تھی۔ ان کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے آسمان سے سر پر آگ برس پڑی ہو۔ آج بھی وہ ان ہی خیالات میں ڈوبے اپنے احمق بیٹے کی نادان سوچ پر آنسو بہا رہے تھے۔ گرم گرم آنسو مٹی میں جذب ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگے۔ لگتا ہے تیری عقل کند ہوگئی ہے۔ احمق بے غیرت اپنے آپ کو نصیحتیں دے رہا ہے۔ شہر کے عیش وعشرت کے لالچ میں جو بھی گاؤں چھوڑ کر گیا بڑے خسارے میں رہا۔ تباہ ہو کر واپس لوٹا۔ نا شہر والوں کا کوئی اعتبار۔ اور نا نوکری کا کوئی بھروسہ۔ آج ہے کل نہیں...... رشوت اور دھوکا دھڑی کا بازار گرم ہے۔ ہماری زمین سونا اگلتی ہے سونا۔ ہماری کئی پشتوں کی جڑیں اس مٹی کی گہرائی میں پنہاں ہیں۔ ہمارے پرکھوں نے اپنے خون پسینے سے سینچی ہے یہ زمین...... ان کے پسینے کی بوندیں آج بھی اس مٹی میں موتی کی طرح چمکتی ہیں۔ اس مٹی میں وفا ہے...... بڑی مہمان نواز ہے ہماری مٹی۔ تو کہیں بھی جائے گا چین سے نہ رہ پائے گا۔ اس مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو تجھے واپس یہاں ہی کھینچ لائے گی...... یہ مٹی تیرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی اور تو زمین بیچنے کی بات کر رہا ہے۔ تیرا سب کچھ یہی ہے۔ تیرا بچپن...... تیرے دوست یار...... تیرے دکھ سکھ...... سب کچھ...... یہ کھلی فضا...... یہ خوبصورت جھومتے درخت...... یہ لہلہاتے کھیت۔ سب تیرے ہی تو ہیں۔ یہاں کے سادہ دل لوگوں میں اپنائیت ہے۔ دردمندی ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ سمجھنے کا احساس ہے ان میں۔ یہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا...... انہیں کبھی چھوڑ کر نہ جانا...... ہماری بنیادیں اس زمین کے اندر ہیں...... یہ مٹی ہماری جان ہے...... وہ رونے لگے...... لوگ ارد گرد جمع ہوگئے۔ کیا ہوا اشوک بابو۔ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ چاروں طرف سے سوالوں کی بارش ہونے لگی۔ اشوک بابو چپ چاپ دکھی دکھی نظروں سے سب کو دیکھنے لگے۔ کس کس کے سوال کا جواب دیتے۔ ہر سوال میں ان کی عزت کا سوال چھپا تھا۔ ان کو آزردہ اور پریشان دیکھ کر سب کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ باپ کے آنسو اور آہوں میں درد بھی تو بے انتہا تھا۔

شرون سومیا کے ناز ونخرے اٹھاتا رہا...... لیکن سومیا کے دل میں کوئی بھی نیا احساس نہیں جاگا...... اب بھی شک وشبہ کی دنیا میں جی رہی تھی...... ذرا ذرا بات پر قیامتیں برپا کرنے لگتی...... ایک دن اتفاقاً شرون کا ایک ڈاکٹر دوست گھر آ گیا...... اس وقت سومیا کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک دم شرون

سے کہا کہ سومیا کے ذہن پر کچھ بھاری دباؤ ہے۔اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔سومیا کے بچپن کی درد بھری داستان سن کر وہ بولے۔جن بچوں کے نصیب میں والدین کا پیار اور تحفظ نہیں ہوتا وہ بچارے اسی ہی طرح ستائے جاتے ہیں۔محبت سے محروم بچے اپنے احساسات کا اظہار بھی کرنا نہیں جانتے۔چاچی کے بے انتہا ظلم وتشدد کی وجہ سے سومیا کے دماغ میں خلل پیدا ہوگیا ہے۔چاچا کی بے توجہی نے سومیا کے اعتماد کو زیادہ ٹھیس پہنچائی۔حقیقت تو یہ ہے کہ یتیم اور لاوارث بچوں پر ان کے رشتے دار ہی ناقابل برداشت ظلم و جبر کرتے ہیں۔ان کے احساسات اور جذبات کا خون کر دیتے ہیں۔بے حد جسمانی اور ذہنی اذیت دیتے ہیں۔کچھ بچے گھبرا کر گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور کچھ خودکشی کر لیتے ہیں۔لڑکیوں کو تو یوں بھی انسان نہیں سمجھتے۔ان کے ساتھ بہت سنگدلی سے پیش آتے ہیں۔اتنا کہ ان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔سومیا کے دل میں بھی ڈر اور وہم سما گیا ہے۔اسے کسی پر اعتماد نہیں رہا تو پھر تم پر کیسے اعتبار کرے۔سن کر شرون تو دہشت سے کانپ اٹھا۔سارے جسم میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔بہت دکھ اور الجھن سے ڈاکٹر کو دیکھ کر بولا ...... یار...... سومیا میرے بیٹے کی ماں ہے۔مجھے بہت عزیز ہے۔یقین کر مجھے وہ میری جان سے پیاری ہے۔عمر بھر کے لیے اسے اپنایا ہے۔اس کے بغیر میری دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔اب تو ہی کچھ علاج کر ...... ڈاکٹر نے سمجھایا کہ علاج کرانے سے سومیا جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ایک دن تیرے شانہ بشانہ چلے گی۔سن کر شرون کے دل کو تسلی ہوئی تو چہرے پر سکون کی کیفیت نظر آئی۔دن یوں ہی گزرتے گئے۔اب تو پڑوسیوں نے بھی شکایتیں کرنا شروع کر دیں۔روز روز کی تکرار سے شرون عاجز ہوگیا تھا۔وہ سومیا کو شہر لے جا کر علاج کروانا چاہتا تھا۔علاج کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔بابو جی نے زمین بیچنے سے انکار کر دیا...... پھر شرون کو بابو جی کی طرف سے کچھ توقع نہ رہی ...... اس نے اپنے بابو جی سے سومیا کے علاج کا ذکر بھی نہیں کیا۔اس کے چاروں اطراف مسائل ہی مسائل پھیلتے جا رہے تھے اور اسے کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسی دوران بابو جی گر پڑے۔ٹانگ ٹوٹنے کی وجہ سے انہیں ایک طویل عرصے ہسپتال میں رہنا تھا۔شرون نے یہ موقع غنیمت سمجھا ...... بابو جی کی غیر موجودگی میں مکان اور زمین بیچ کر شہر میں جا بسا۔سومیا کا علاج دفتر کی نوکری ...... بیٹے کی دیکھ بھال ...... شہر کی گہما گہمی میں اسے اپنا ہی دھیان نہیں رہا۔آہستہ آہستہ اور باقی فرائض کا احساس دل سے نکلتا گیا۔یہاں تک کہ وہ ہسپتال جانا بھی بھول گیا۔

بوڑھے باپ کی طرف سے غافل ہو کر اس نے بڑی نیچ اور وحشیانہ حرکت کی تھی۔لیکن آج کل

کی خودغرض اور مطلبی دنیا کی روش ہی یہی تھی۔ معاشرے کے رویے تبدیل ہو رہے تھے۔ خاندان ٹوٹ رہے تھے۔ ایسا خطرناک اور سازشی دور آیا تھا کہ اپنا خون بھی اپنا نہیں رہا تھا...... ذرا مشکل آئی اور اپنوں نے سب سے پہلے آنکھیں پھیریں۔ ان گنت کمزور، بیمار اور ضعیف والدین اپنے ہی بچوں کے ہاتھوں رسوا کیے جا رہے تھے۔ کتنے ہی گھر سے بے گھر کر دیئے گئے تھے۔ جو پہلے کبھی نہیں دیکھا اور سنا تھا اب دیکھ رہے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں اولڈ ہوم بنائے جا رہے تھے۔ یعنی بزرگوں کی رہائش کے انتظام کیے جا رہے تھے اور دیکھنے والے شہ دے رہے تھے کہ موجودہ نسل آج کل کے حالات سے مجبور ہو گئی ہے۔ اس مہنگائی اور بے روزگاری کے زمانے میں وہ اپنی خانگی ذمے داریاں نہیں سنبھال سکتے تو بوڑھے ماں باپ کی کس طرح دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ کسی نے اس موجودہ نسل سے یہ سوال نہ کیا کہ کیا کبھی تمہارے بوڑھے ماں باپ نے تمہارے ساتھ اس طرح کی بے انصافی کی تھی۔ کبھی ایسی لاپرواہی اور لاتعلقی برتی تھی جو تم آج ان کے ساتھ برت رہے ہو۔ تم یہ کیسے بھول گئے کہ چوٹ تم کو لگتی تھی اور درد انہیں ہوتا تھا۔ دنیاوی عیش وعشرت میں پھنس کر تم اتنے غافل اور بے غیرت ہو گئے کہ اپنے بزرگوں کی ضروریات اور تکلیفوں کا احساس تک نہیں رہا۔ تم نے ان بیماروں کے خواب کھو دیئے۔ دولت کی ہوس نے تمہارے ضمیر کچل ڈالے ہیں۔ بے جا ہوس نے رشتوں میں زہر گھول دیا ہے۔ سارے رشتے ناطے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی کا نہ رہا...... تم کو تو نئی نسل کو بیدار کرنا تھا۔ آنے والی نسلوں کا مستقبل تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ تم ہی میں اپنے فرائض کی ادائیگی کی صلاحیت نہیں رہی۔ تم خود مجرموں کی صف میں کھڑے ہو تو تم بھلا آنے والی نسلوں کو کیا سبق سکھاؤ گے۔

اشوک بابو کی آنکھوں میں اب نیند کہاں تھی۔ بیٹے کی یاد رات بھر باپ کی رگ رگ سے خون چوستی رہی۔ سارا جسم دہکتی آگ ہو رہا تھا...... وہ روز ہی سڑک پر جا کر بیٹھ جاتے اور ان کی پھٹی پھٹی بیقرار نظریں ہر جوان کے چہرے پر اٹک کر رہ جاتیں...... ناامید ہو کر شام تک ان کے چہرے پر مردنی چھا جاتی۔ آزردہ دل اندر ہی اندر سسکتا رہتا۔ وہ تو پریشانیوں اور دکھوں کو دل میں چھپا لینے والے لوگوں میں سے ایک تھے۔ لیکن یہ غم برداشت کرنا ان کے بس میں نہ تھا...... غموں نے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی انہیں اڑا کر لے جا سکتا تھا۔ ان کی بری حالت دیکھ کر ہسپتال والوں کو فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے آدمی گاؤں بھیجا۔ اشوک بابو نے اپنے گھر کا اتہ پتہ سمجھایا۔ گھر کا حلیہ بتایا کہ بھئی پرانی وضع کا معمولی سا گھر ہے۔ برسوں سے در و دیوار پر رنگ و روغن بھی نہیں کر سکا ہوں لیکن میری نظروں میں وہ کسی محل سے کم نہیں۔

اس طرح کا خستہ حال مکان تو وہاں نظر نہیں آیا۔ وہاں تو ایک شاندار عمارت کھڑی تھی۔ چمکتی درو دیوار والی۔ بجلی کے بلب دمک رہے تھے۔ جالے سے اندر جھانکا۔ ٹی وی پر کوئی انگریزی فلم آرہی تھی۔ خوشیاں لوٹی جارہی تھیں۔ قہقہے بے حساب تھے۔ دروازہ پر دستک دی...... کافی دیر انتظار کے بعد ایک کرخت نسوانی آواز سنائی دی۔ دروازہ پر قدرت کا عجیب وغیرب نمونہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ کٹے بال، سفید چہرہ، لال ہونٹ، بیحد وزنی قسم کی عمر رسیدہ خاتون عجب لمبا سا چوغہ پہنے سامنے کھڑی بھیانک انداز میں اسے گھور رہی تھیں۔ بڑی ''درشتی سے سوال کیا''۔ کون ہو تم اور کیا مانگتا ہے تم''...... وہ خاموش تھا بس اشوک بابو کا لکھا پرچہ سامنے کر دیا۔ بڑے اکھڑے لہجے میں بولیں ایڈریس ٹھیک ہے لیکن اب یہ گھر ہمارا ہے۔ اس نے دھیرے سے سوال کیا...... جو آپ سے پہلے رہتے وہ...... کہاں...... وہ سختی سے بولیں جہنم میں...... دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا...... وہ حیرانی سے بند دروازے کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اس قسم کے لوگ ہمارے گاؤں میں کیوں آکر بس گئے۔ ضرور ڈرگس کا چکر ہوگا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ پڑوسیوں سے معلوم ہوا کہ شرون مکان فروخت کر کے روپوش ہو گیا ہے۔ سنا ہے زمین بھی بیچ دی ہے۔ شرون کی کوئی خبر نہیں ملی۔

دوسرے دن یہ قیامت خیز خبر اشوک بابو نے سنی تو ان کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح منجمد ہو گئے۔ دل رکتا ہوا محسوس ہوا...... ہستی تو کب کی متزلزل ہو چکی تھی آج تو جان پر آبنی تھی۔ دل لہولہان ہو گیا تھا۔ بس چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ اب تیرا محتاج فقیر باپ کہاں جائے۔ اس گھر کے سوا میرا کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا۔ تجھ سے بچھڑ کر زندہ رہنا میرے لیے کار محال ہے۔ تو نے باپ کو نہیں خود اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ تو نے اپنی دنیا الگ بسالی۔ تو جو میری آنکھوں کی روشنی ہے میرے دل کا سکون ہے۔ تری نظر میں بوڑھے ماں باپ کی وقعت اور اہمیت نہیں رہی۔ میرے لال تو ہی تو میرا سب کچھ ہے۔ جو تو نہ آیا تو میں مرجاؤں گا۔ ان کی سانسیں گھٹنے لگیں۔ پاس کھڑے وارڈ بوئے نے کہا۔ بابو جی آپ فکر نہ کریں۔ میں ہوں نہ آپ کا دوسرا بیٹا۔ میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ لیکن اس باپ کو کیسے قرار آتا۔ وہ تو شش و پنج میں پڑ گئے تھے کہ آخر ان کا بیٹا کہاں غائب ہو گیا اور ایسا کیوں کیا...... بہت دنوں سے دماغ میں ان خیالوں نے ایک ہیجان برپا کیا ہوا تھا۔ آج وہ اپنے غموں پر قابو نہ پا سکے۔ چہرے سے رنج و ملال ٹپک رہا تھا اور بوڑھی مایوس آنکھیں تر تھیں۔ اب تو ایک ایک پل گزرنا مشکل ہو رہا تھا وہ اس بے چارگی اور بے

بسی کے عالم میں سڑک پر جا کر بیٹھ گئے۔ تھانے میں رپورٹ لکھوانے کا خیال آیا تو مایوس ہو گئے۔ اس محکمے میں رشوت کے بغیر تو کوئی انگلی بھی نہیں اٹھاتا۔ اور آج اس کنگال باپ کے پاس دینے کے لیے بوڑھی ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہوں نے ناامید ہو کر گہری سانس لی اور پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ جو انہیں آج بڑی ویران نظر آ رہی تھی۔ پھر سوچا کبھی نہ کبھی اسے میری یاد ضرور تڑپائے گی۔ شاید میری کھوج میں گاؤں جائے۔ گاؤں میں جھونپڑی ڈالنے کے خیال سے وہ کانپ اٹھے۔ گاؤں میں وہ ذمہ دار ہستیوں میں شامل تھے۔ بڑا مان تھا۔ بڑی عزت تھی۔ ایک دم احساس ہوا گاؤں والوں کی ہمدردیاں بٹورنے اور دوسروں کے رحم و کرم پر جینے سے بہتر تو مر جانا ہے۔ پناہ گاہ ڈھونڈ ھتے ڈھونڈ ھتے وہ ناامید اور ہراساں ہو گئے۔ دل ٹوٹ گیا تھا۔ ساری آرزوئیں اور امیدیں ختم ہو گئی تھیں پھر جینے کے لیے ہی کیا رہ گیا تھا۔ اس بے وفا مطلبی اور خود غرض دنیا سے جانا ہی بہتر ہے۔ اب تو صرف موت ہی ان کے سارے دکھوں کا آخری علاج تھا۔

وہ رات بڑی سیاہ تھی۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اشوک بابو کو ایک ایک پل گزارنا عذاب لگ رہا تھا۔ مایوسی اور غم اپنی معراج پر پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے دور سے گاڑی آتی دیکھی۔ سوچا لوگ تو محض اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جائیں گے اور مجھے میرے عذابوں سے نجات مل جائے گی۔ بے بس اور مجبور زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ اب موٹر بہت قریب پہنچ گئی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیاں فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔

موٹر اور قریب آئی ...... انہوں نے موٹر کے سامنے چھلانگ لگا دی۔ ڈرائیور نے بریک مارا...... جھٹکے سے گاڑی رکی۔ بڑی پھرتی سے ڈرائیور نے ان بوڑھی ہڈیوں کو موٹر میں ڈالا اور گاڑی یہ جا اور وہ جا...... سڑک پر لوگ دیکھتے ہی رہ گئے......

شروَن نے شادی کے بعد اک اک لمحہ بس سومیا کے لیے ہی سوچا تھا۔ اس کے علاج میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سومیا تو حقیقی رشتوں کی محبت کی مٹھاس سے محروم تھی۔ علاج کے بعد اس کے دل میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ محبت کے لطیف اور نازک جذبوں نے جنم لیا تو رشتوں کی محبت اور گہرائیوں کو سمجھنے لگی تھی۔ وہ شام بھی بڑی سہانی تھی ...... ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان پر کالے بادل منڈلا رہے تھے۔ بارش کی آمد آمد تھی۔ سومیا پورے دھیان سے شروَن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے گلابی رخساروں پر مسکراہٹیں مچل رہی تھیں۔ آنکھوں میں محبت کی چنگاریاں جھلمل کر رہی تھیں۔ شروَن نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اور وہ تو اسے دیکھ کر حیرتوں میں ڈوب گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور سومیا

مسکراتی ہوئی شرون کی باہوں میں سمٹ گئی۔ اسی لمحے کا تو شرون کو انتظار تھا...... آج حقیقی معنوں میں دونوں نے ایک دوسرے کو پالیا تھا۔ شرون کے کومل سپنے آج پورے ہو گئے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مسرور اور شاداں تھے کہ اچانک بابو جی کی یاد نے جھنجھوڑ ڈالا۔ دل میں ایک محشر سا برپا ہو گیا۔ دل و جان بے چین تھے۔ ساری خوشیاں پل بھر میں کافور ہو گئیں۔ سومیا کو پانے کی جدو جہد میں وہ اپنا اولین فرض بھول گیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ بھولا نہیں تھا۔ اس نے دیدہ دانستہ اپنے بابو جی کو دھوکا دیا تھا۔ فریب دیا تھا...... ان کے ساتھ بے انصافی کی تھی...... اتنا بڑا گناہ کیا تھا کہ اس عظیم گناہ کی تلافی تو خدا کے گھر میں بھی نہیں ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ ایک بھاری دیوار اس کے اوپر آ گری ہو اور دیوار کا بھاری بوجھ اس کے وجود کو کرچی کرچی کر رہا تھا۔ دل میں ایسی زبردست ٹیس اٹھی کہ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھا...... اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت اور گھبراہٹ دیکھ سومیا فون کی طرف دوڑی۔ شرون کی دوسری چیخ پر وہ پلٹی۔ میرے درد کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے یہ درد مجھے زندگی بھر تڑپائے گا۔ وہ مسلسل کانپ رہا تھا۔ لرزتی آواز میں بولا...... تم بیمار تھیں...... تمہیں بچانا میری زندگی کا واحد مقصد بن گیا تھا۔ میں اپنے مقصد میں تو کامیاب ہو گیا۔ تمہیں پالیا اور سب کچھ کھو دیا...... اپنے مفاد کے لیے میں نے اپنے بابو جی کے ساتھ دغا کی ہے۔ آج سارے احساسات اچانک بیدار ہو گئے تھے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ میرے بابو جی مجھے بلا رہے ہیں...... بجلی کی گرج چمک کے ساتھ بہت تیز بارش بھی اس روک نہ سکی۔ آج شرون کی قوت ارادی مضبوط ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی ہسپتال کی طرف دوڑا دی۔

بمشکل چوکیدار نے اندر جانے کی اجازت دی۔ خالی پلنگ دیکھ کر شرون کے اوسان گم ہو گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے بابو جی کو پکارتا رہا لیکن آج اس کی آواز کمرے میں ہی گونج کر رہ گئی تھی۔ وہ پچھتاوے کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ سب حیران تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی تو بابو جی کو سب نے ہسپتال میں دیکھا تھا۔ سارا ہسپتال کھوج ڈالا۔ بابو جی نہیں ملے۔ ایک انجانی آواز پر شرون چونکا...... واہ صاحب...... بڑی دیر میں تم کو احساس ہوا کہ تمہارے بزرگ پتا جی بھی یہاں ہیں۔ انہیں دس دن پہلے گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ تمہارے اتنے عالم فاضل ہونے سے کیا فائدہ جب یہ ہی نہیں معلوم کہ والدین محترم اور تعظیم کے لائق ہوتے ہیں۔ والدین کی خدمت کرنا اولاد کا اولین فرض ہے۔ اتار پھینکو اس شرافت کے چوغے کو۔ تم نے تو وہ نیچ حرکت کی ہے جس کا کوئی مہذب انسان تصور بھی نہیں

کر سکتا۔ صاحب آپ جیسے شریف لوگوں سے تو ہم گنوار بھلے جو اپنے ماں باپ کی پوجا کرتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ بابو جی ہمارے معاشرے سے شرافت اور تہذیب کا جنازہ کب کا اٹھ چکا ہے۔ عیش وعشرت کی دنیا میں ایسے ڈوبے کہ اپنی ذمے داریاں بھی بھول گئے۔ کیا بوڑھے باپ کو ہسپتال میں مرنے کے لیے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ کبھی یہ بھی سوچا اگر بڑھاپے میں تمہارا بیٹا تمہیں سایہ نہ دے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ تمہارے پتا جی بڑے بھلے آدمی تھے۔ تم نے ان کی زمین بیچ دی۔ بے سائبان کر دیا۔ تم نے انہیں بھلا دیا لیکن وہ تم کو اپنے دل سے جدا نہ کر سکے۔ ارے بوڑھے باپ کا سب کچھ تو تم نے لے لیا تھا۔ ان کو دو وقت کی روٹی دینے سے تمہارے خزانے میں کمی تو نہیں ہو جاتی۔ بڑا ظلم ڈھایا ہے تم نے اپنے باپ پر...... چاروں طرف سے سنگ باری ہو رہی تھی اس کے عظیم جرم کی یہ سزا تو بہت کم تھی۔ وہ بے حد شرمندگی سے سر جھکائے سن رہا تھا۔ اس کے پاس کہنے کو تھا بھی کیا۔ ایک اور آواز آئی ...... جاؤ...... جلدی جاؤ بابو جی ...... سڑکوں پر دیکھو ...... پل کے نیچے فقیروں میں ڈھونڈھو...... شرون تیزی سے باہر نکل گیا۔

شرون کی ساری کوششوں کے باوجود بابو جی کا کوئی پتا نہیں چلا...... وہ سوچ سوچ کر ہار گیا۔ بڑے صدمے کے دور سے گزر رہا تھا۔ خیالات کے تانے بانے میں الجھا رہتا۔ سوچ کر کہ کہیں وہ اس دنیا میں نہیں رہے ہوں وہ سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگتا کبھی روتا تو کبھی سر پٹکتا۔ اب تو شہر بنجر اور ویران سا لگنے لگا تھا۔ یہ حالت ہوگئی تھی کہ اگر بابو جی نہ ملے تو وہ جان سے گزر جائے گا۔ ہر پل اس کا ضمیر اسے اندر ہی اندر کچل رہا تھا۔ وہ خوش رہنا، ہنسنا سب بھول گیا تھا، اندر سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ جلد بازی میں اٹھایا ہوا یہ قدم اتنا دکھ، اتنی بربادی کا باعث ہوگا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بابو جی کا دل زخمی کر کے اور انہیں کھو کر اب چین کیسے آتا۔

انسان منصوبے تو بناتا اور یہ بھول جاتا ہے کہ خدا کی رضا کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ اشوک بابو نے جب آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک صاف شفاف پلنگ پر پایا۔ پاس بیٹھی بچی ان کا چہرہ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ انہوں نے سوال کیا...... میں کہاں ہوں ...... اور یہ کونسی جگہ ہے۔ وہ ان کے قریب جھک کر بولی ممی نے بتایا تھا جب وہ چھوٹی تھیں تو آپ راستہ بھول گئے تھے۔ بہت دنوں بعد آپ اپنے گھر واپس لوٹے ہیں۔ بچی نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا میرے بابا بھی راستہ بھول گئے ہیں...... نانو اتنے بڑے بڑے لوگ بھی راستہ بھول جاتے ہیں...... وہ بڑی دکھی آواز میں ہولے سے بولے میری بچی بڑے لوگ صرف

راستہ ہی نہیں وہ تو اپنوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ لکشمی پاس کھڑی اشوک بابو کی پریشان کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی سامنے آ کر بڑے خلوص و محبت سے بولی ...... بابو جی یہ آپ ہی کا تو گھر ہے۔ اب آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں اور منی ہے نہ آپ کے ساتھ۔ اتنے دنوں کے بعد یہ زبردست سہارا اور اپنائیت بھرے الفاظ سن کر بابو جی کے ٹوٹے دل کو بڑا سکون ملا تھا۔ کبھی کبھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اشوک بابو نے تو موت کی باہوں میں ہمیشہ کی نیند سو جانا چاہا تھا ...... اس محبت بھرے ماحول کو دیکھ کر وہ واقعی دنگ رہ گئے تھے۔ روح اب بھی بیٹے کی یاد میں تڑپ رہی تھی۔ کیسے گمراہ ہو گیا۔ کیوں روٹھ گیا۔ اپنے باپ کو کیسے بھلا دیا۔ کہاں ہے تو میرے لال۔ ایک سوال کا بھی جواب نہیں مل رہا تھا۔

چاہتوں کے بھی دکھ سکھ عجیب ہوتے ہیں سب کے جدا جدا۔ لکشمی کو خدا نے حسن، دولت اور دنیا کی ساری ہی نعمتوں سے نوازا تھا۔ ایک بہت چاہنے والا شوہر بھی دیا تھا۔ شادی کے دو سال کے بعد اس کا شوہر بزنش ٹرپ پر گیا تھا۔ یہ حرمان نصیب آٹھ سال سے اپنے گمشدہ شوہر کے انتظار میں زندگی گزار رہی تھی۔ وقت کاٹنے اور دل بہلانے کے لیے گھر میں اس نے بچوں کے لیے اسکول کھول لیا تھا ...... شام کی شفٹ میں بستی کے غریب بچوں کو مفت پڑھاتی تھی ...... خود مظلوم تھی سو دوسروں کے دکھ سمجھتی تھی۔ اس حادثے سے اسے کسی غیر معمولی صورتحال کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا۔ حادثے کی وجوہات معلوم کر کے بابو جی کے درد کو مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ ان کا کمزور جسم دیکھنے سے لگتا تھا کہ ان کی زندگی کچھ ہفتوں کی ہی باقی ہے۔ اپنا کوئی تھا نہیں سو اس بے ضرر انسان کو اپنے گھر میں پناہ دے کر ماں بیٹی دونوں خوش تھیں۔

اس ماحول میں بابو جی کی صحت تھوڑی سنبھل گئی۔ ایک دن اچانک آکاش کو اسکول میں دیکھا تو ان کی اندھیری دنیا میں سورج کی کرن چمکی۔ دل چاہا دوڑ کر جائیں اور اسے سینے لگائیں۔ لیکن اپنے ہی لہو میں ڈوب گئے۔ آکاش کو دیکھتے رہے۔ بس دیکھتے رہے۔ دل تو یوں ہی بہت مایوس تھا آج مایوسی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جس دن سے وہ اپنوں سے بچھڑے تھے انکی نیندیں ان سے بچھڑ گئی تھیں۔ راتیں تو یوں بھی بہت لمبی ہوتی تھیں۔ لیکن یہ رات ان کی سب سے لمبی رات تھی ...... رات بھر اداس آنکھوں سے آنسو متواتر بہتے رہے تھے۔ محرومیوں کی شدت کا کرب دل کو بے چین کرتا رہتا تھا۔ بڑی بیقراری سے پو پھٹنے کا انتظار کرتے رہے۔

دن میں چہرے پر شکن نہ آنے دیتے۔ سب کے سامنے اپنے جذبوں کو انتہائی ضبط سے چھپائے رکھتے روز صبح سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کرتے۔ ایک دن دیکھا سامنے سے موٹر تیزی سے آ رہی

تھی اور آکاش اپنی موٹر سے نیچے کودنے کی کوشش کر رہا تھا...... وہ تیزی سے آکاش کی طرف لپکے۔ آکاش کو تو بچا لیا لیکن ان کے کمزور پاؤں ڈگمگا گئے۔ زمین پر گرے۔ کئی گہرے زخم آئے۔ خون بہنے لگا۔ فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا گیا۔ وہ کسی صورت میں بھی ہسپتال جانے کو راضی نہ ہوئے۔

ڈرائیور نے گھر جا کر سارا قصہ شرون اور سومیا کو سنایا۔ دونوں کو اس نیک انسان سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی جس نے اپنی جان کی پروا نہ کر کے ان کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ اسی وقت دونوں اسکول پہنچے۔ جب دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو بابو جی کی آنکھیں بند تھیں۔ کمرے کی فضا میں شرون کے جسم اور سانسوں کی خوشبو تحلیل ہوئی تو باپ کا دل مہک اٹھا۔ قدموں کی چاپ سماعتوں سے ٹکرائی تو بے چراغ دل میں روشنی پھیل گئی۔ شرون پلنگ کے قریب پہنچا۔ یک بیک قدم ٹھہر گئے۔ او میرے خدا...... حیرت اور استعجاب سے بھری نگاہیں اس لاغر پژمردہ وجود پر اٹک کر رہ گئیں۔ اس کے پورے وجود پر ایک لرزہ طاری ہو گیا۔ دوسرے ہی پل وہ اپنے بابو جی کے ناتواں وجود سے لپٹ گیا۔

''تم آ گئے بیٹے...... بڑی دیر کر دی آنے میں'' آواز اتنی ضعیف اور کمزور تھی لگتا تھا کسی پاتال سے آ رہی ہو۔ شرون کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ دم گھٹتا سا لگا۔ ''تم تینوں تو میری کل کائنات ہو'' ہر پل ہر ساعت میری سوچوں میں۔ میری آنکھوں میں تھے۔ کیا بتاؤں تم لوگوں سے جدا ہو کر کس کس طرح تڑپا ہوں۔ جب ساری ہمتیں اور انتظار کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور کوئی دوسرا آسرا دکھائی نہ دیا تو اکیلے زندگی کی راہ پر جو دو چار قدم باقی رہ گئے تھے بڑھانے کی طاقت بھی شل پڑ گئی۔ جینے کی آرزو ہی ٹوٹ گئی تھی۔ قدرت کا کرشمہ دیکھو...... تم لوگوں سے ملنا تھا...... لکشمی نے موت کے منہ سے نکال لیا۔ مجھے جینے کا سہارا دیا۔

ناراضگی اور غصے کے بجائے ان کے چہرے پر باپ کی محبت اور شفقت کی نرمی چھائی ہوئی تھی۔ شرون سے بولے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں بھی خاندانوں کا تصور ٹوٹتا جا رہا ہے۔ مجھے تم جیسے سعادتمند، تابعدار اور تعلیم یافتہ بیٹے سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ ایک دن اپنے بوڑھے باپ کو بے بسی کی دلدل میں دھکیل کر اکیلا مرنے کے لیے چھوڑ دو گے......

یہاں آکاش کو دیکھا...... میری انا تو مجروح ہو ہی چکی تھی...... یہاں حقیقت سے کوئی واقف نہیں تھا...... میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے رشتے کی کسی کو خبر ہو...... خاص طور سے آکاش کو...... حقیقت فاش ہونے کے بعد اس بچے کی زندگی میں طوفان اٹھ جاتا...... پھر تمہاری انا کا مسئلہ میرے لیے عذاب بن گیا

۔دل تو بہت چاہا اسے سینے سے لگالوں۔لیکن میرا دہشت زدہ دل اندر ہی اندر کانپ اٹھا یہ سوچ کر کہ تم کو ہمارا ملنا پسند نہیں آئے گا۔ دل تو مجبور تھا زبان بھی مجبور ہوگئی۔ میں نے اپنی آہوں کو سینے میں دفن کرلیا اور ہونٹ سی لیے۔ انہوں نے آکاش کو اپنے سینے سے لگایا...... میرے لال...... تجھے چوٹ تو نہیں آئی ...... آکاش نے اپنی چھوٹی باہیں اپنے دادا جی کے گلے میں ڈالیں اور سر ہلا کر نفی میں جواب دیا تو بوڑھے دل کو راحت ملی۔

لکشمی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اسے آشیرواد دیا۔ بولے تم خود تنہا بیزاری کے اندھیروں میں جی رہی ہو اور دوسروں کو روشن راہیں دکھانے میں کوشاں ہو صرف ٹوٹے دل ہی دوسروں کے درد کی صدا سن سکتے ہیں۔تمہاری محبت نے میرے بوڑھے جسم میں ایک نئی طاقت پھیلادی تھی اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں دوسروں کے لیے جینا ہی اصل جینا ہے۔ان کی آواز گھمبیر ہوگئی۔ بیٹی دولت اور علم ہونے سے عورت کی حیثیت نہیں بدل جاتی۔عورت تو بس عورت ہوتی ہے۔ ہمیشہ مرد کے سہاروں کی محتاج ۔باپ،شوہر، بھائی کسی ایک کا سایہ ضروری ہوتا ہے۔شرون بیٹا تم بھائی بن کر میری بیٹی کی رکھشا کروگے۔

سومیا کے آنسوؤں سے بابو جی کے پاؤں تر ہوگئے تھے۔اسے اپنے قریب بلایا۔وہ رورو کر بولی بابو جی یہ سب میری بیماری کی وجہ سے ہوا ہے۔وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے نہیں بیٹی ...... میں اپنے بیٹے کی خطاؤں کو چھپانے کے لیے تمہیں قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا۔تم اپنے کو مجرم ٹھہرا کر شرون کے گناہوں کو ڈھانکنے کی کوشش نہ کرو۔آخری فیصلے ہمیشہ مردوں کے ہوتے ہیں۔شرون اپنے فعلوں کی وجہ سے مصیبتوں کے اندھے غار میں اتر گیا تھا۔جو شخص اپنی مٹی سے بے وفائی کرتا ہے وہ بالکل خالی اور بے وزن ہوتا ہے۔خود غرض ہوتا ہے صرف اپنے مفاد کی سوچتا ہے۔جو اپنے بزرگوں کا احترام نہیں کرتا اور ان کی دی ہوئی تعلیم پر قائم نہیں رہتا اس کے پاس کچھ نہیں رہتا۔سومیا رورو کر اپنے گزشتہ رویہ کی معافی مانگتی رہی۔ بابو جی بولے گاؤں ضرور واپس چلی جانا ۔شہر میں دربدر کی خاک کب تک چھانتی رہوگی۔میرے بینک میں اتنا ہے کہ تم آسانی سے اپنا گھر اور زمین واپس لے سکتی ہو۔شرون تو ساکت دیکھتا ہی رہ گیا......وہ اپنی حماقت پر مزید شرمندہ ہو رہا تھا۔

شرون کے آنسو تھمتے نہ تھے۔وہ گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔بابو جی اپنے خصوصی انداز میں بولے...... میرے بیٹے باپ کی تو ہر سانس کے ساتھ اپنی اولاد کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔تم باپ ہو کر بھی باپ کے دل کی گہرائیوں باپ کے خیالوں اور ارادوں کو نہیں سمجھتے۔ میں نے تو تمہیں

معاف کر دیا لیکن کیا تم خود اپنے آپ کو معاف کر پاؤ گے۔ تم نے بزرگوں کے بنائے اصولوں کو توڑ کر مجھے نہیں خود اپنے آپ کو کنگال کر لیا۔

میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا...... اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا...... وہ گھر نہیں رہا ہم جسے ہمارے پرکھوں نے بڑی امیدوں سے بنایا تھا...... بسایا تھا...... اس گھر کے گوشے گوشے سے ان کی آوازیں آتی تھیں۔ ایک ایک اینٹ اور ایک ایک ذرے کے ساتھ ان کی یادیں جڑی تھیں وہ زمین نہ رہی جس میں ہماری کئی نسلوں کی بنیادیں تھیں۔ ان قیمتی لوگوں کی خوبصورت یادوں کے خزانے چھپے تھے۔ تم نے تو یادوں کے سلسلے ہی توڑ دیے۔ اب تو نہ جڑیں رہیں نہ یادیں۔ وہ یادیں ہی تو تم کو اپنی نئی نسل کو ورثے میں دینی تھیں۔ تاکہ یادوں کے سلسلے کا تسلسل قائم رہتا۔ نسل در نسل...... پیڑھی در پیڑھی...... ان یادوں سے جڑی تھی ہماری قدیمی روایتیں، ہماری تہذیب، شرافت، رسم و رواج، اور ہماری زندگی کے بنیادی اصول...... تم اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے

یہ تو ایسی چیزیں ہیں جو ایک بار ٹوٹ جائیں پھر کبھی نہیں جڑیں۔ بہت ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے۔ سب کچھ بدلتا جا رہا ہے۔ چاروں طرف شدید تباہی، بے چینی اور بدامنی پھیلی ہے۔ موجودہ نسل بے حد کمزور اور بے انتہا خود غرض ہو گئی ہے۔ سب کے قدم تیزی سے بربادی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے سنبھلنے کا۔ موجودہ نسل کو تو قربانیاں دے کر نئی نسل کو انسانیت کا سبق سکھانا تھا۔ ہمارے اس چمن کی باغبانی اور نگہبانی کرنی تھی۔ نئی نسل کی رہنمائی کرنی تھی...... بولتے بولتے بابو جی بہت تھک گے تھے۔ سو کچھ وقفے کے بعد گہری سانس لے کر بولے...... بڑی ذمے داریاں ہیں ہماری موجودہ نسل کے کندھوں پر...... ہمارے طرز زندگی کے بنیادی اصولوں کو قائم...... دائم رکھنے کی ذمے داری...... لیکن کہنے کو تو ابھی بھی بہت کچھ تھا اور کہنا تھا، لیکن بابو جی پست ہو چکے تھے...... وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد بہت دھیمی آواز میں بولے...... مجھے اب آگے جانا ہے، دور بہت دور...... میں تو جڑ سے اکھاڑا ہوا درخت ہوں...... کوئی اپنی جڑوں سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جہاں جڑیں نہیں وہاں زندگی نہیں...... یکایک تھرتھراتی، لرزتی زندگی کی لو تھم گئی۔ بے جان ساکت جسم رہ گیا۔ ان کی روح لمبے سفر پر رواں دواں ہو گئی۔ شرون زار و قطار رو رہا تھا۔ لکشمی متحیر سی کھڑی آنسو بہا رہی تھی...... اس کا ایک اور بڑا سہارا ٹوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

کچی دیواریں

لالہ برج بہادر۔ارملا دیوی اور شاداب خان کی کوٹھیاں پاس ہی تھیں ۔ برسوں کا دوستانہ تھا۔ جب بچوں کے کھیل کود کا دور تمام ہوا اور شاداب نے لڑکپن کو خیر آباد کہا تو اس کا دل چاہتا کہ موہنی اس کی نظروں کے سامنے بیٹھی بولتی رہے اور وہ سنتا رہے اور وہ سماں کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ جب شاداب جوانی کی دہلیز پر پہنچا تو کمسنی کی معصوم سی یہ چاہت دل میں محبت کی شمع بن کر چمکی ۔عشق تو اندھا ہوتا ہی ہے۔ دو دیوانے دلوں کو ہوش کہاں تھا...... بنا کسی خوف وفکر کے محبت کی شاہراہ پر قدم بڑھتے ہی گئے۔ جب شعور کے در کھلے اور خوابوں اور تخیلات کے دریچوں سے باہر جھانکا تو حقیقت سے دوچار ہوئے کہ منزل تو ایک ہے بس راہیں جدا جدا ہیں ...... اب یہ مرحلہ حل کرنا بڑا کٹھن تھا یا یوں کہو کہ ناممکن ہی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے لامحدود توقع وابستہ کرلی تھیں ۔ وہی پرانے عقیدے کی سنہری لڑی دو دلوں کو باندھے رہی کہ رشتے تو اللہ کے گھر سے بن کر آتے ہیں۔ گو راہیں کتنی ہی پیچیدہ ہوں منزل تک وہی ہی لے جائے گی ۔ ملاقاتیں جاری رہیں اور دو دلوں میں محبت پھولتی پھلتی رہی ۔شاداب خان نے آرمی جوائن کرلی اور موہنی کالج جانے لگی۔

ابھی انگریزوں کے دیے گہرے گھاؤ تازہ ہی تھے۔شہیدوں کے خون کی لالی سے وطن کی مٹی دمک رہی تھی کہ اچانک یہ کیسا کہرا اور دھواں اٹھا تھا جو سارے آسمان پر چھا گیا تھا۔ ہندوستان کی زمین کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہی اس پر رہنے والوں کا بھی بٹوارا ہوگیا...... خاندان تقسیم ہوگئے ۔کوئی ادھورا تو کوئی بالکل تنہا رہ گیا...... نفرت کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں جو بھی آیا خاک ہوگیا...... اس دھرتی ماں کا آنچل اپنے ہی دلاروں کے خون سے لال ہوگیا......

لالہ برج بہادر کا محلہ بھی دہشت گردوں نے گھیر لیا تھا۔ حالات کے رخ بدلتے ہی سب کے سب بیگانے اور پرائے ہوگئے تھے۔ خنجر بھالے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔اب بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس قیامت کی گھڑی میں شاداب خان نامی فرشتہ نے لالہ جی کے دروازے پر دستک دی...... چاچی جلدی کریں ......اور منٹوں میں ملٹری ٹرک بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا ہندوستان کی سرحد کی طرف دوڑ رہا تھا۔ٹرک میں

سب رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے۔......بس مونی کے گھر والوں کی چیخیں بڑی دردناک تھیں ان کی آہوں نے شاداب خان جیسے نڈر اور بہادر جوان مرد کا کلیجہ ہلا کر رکھ دیا۔ سفر تمام ہوا......ٹرک رکا......شفالی رو کر بولی......''بھائی جان اب کب ملو گے'' شاداب نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا......''بہن جب اللہ کی مرضی ہوگی'' لالہ جی نے شاداب کو سینے سے لگا کر کہا بیٹا تم نے برسوں پرانی دوستی کا حق ادا کر دیا......دونوں گلے لگ کر رو پڑے......چلتا ہوں چاچا......بڑے کام پڑے ہیں میرے سر پر، شاداب نے لالہ جی کے ہاتھوں میں کچھ دیا......وہ ٹرک کی طرف بڑھا ہی تھا۔''شاداب بھائی میری دیدی کو بچا لینا'' شاداب نے پھر پلٹ کر دیکھا......کتنا درد تھا اس بہن کی آواز میں یہ شاداب کے دل کو تار تار کر گئی تھی۔

ہمارے وطن پر تو آفت بر سی تھی۔ ادھر بھی وہی وحشت ناک سماں تھا۔ ڈرتا کانپتا یہ قافلہ ملٹری کیمپ تک پہنچ ہی گیا......لیمپ کی ہلکی سی روشنی میں لالہ جی نے کاغذ کا وہ پرزہ پڑھا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے انگلیوں سے مسل ڈالا۔ ایک گہری طویل سانس کھینچی دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں زور سے بھینچ گئیں۔ اندر ایک زبردست بھونچال آکر ٹھہر گیا تھا۔ آنکھوں سے لہو کی بوندیں برسنے لگیں۔

شہر میں بغاوت کی بو پھیلتے ہی شاداب کو ایک بڑے طوفان کے آنے کا شور سنائی دیا تو اس کے دل میں خوف کی آہٹ ہوئی......وہ سیدھا کالج پہنچا......شاداب کو دیکھ کر مونی کا دل دھک سے رہ گیا وہ شاداب کے ساتھ جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن اب کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس نے حیرانی سے شاداب کے چہرے پر آنکھیں جما کر سوال کیا......''ہم کہاں جا رہے ہیں۔'' وہ بہت جلدی میں تھا اور اس کے چہرے پر سوچ اور تفکر کے نشاں نمایاں تھے۔ جواب دینے کے بالکل موڈ میں نہیں تھا۔ جب مونی نے زیادہ اصرار کیا تو بولا......''اپنے گھر......''مونی نے شاداب کو چونک کر دیکھا......میں نے تم سے ہمیشہ یہی کہا تھا کہ ایک دن میں تمہیں چرا لے جاؤں گا......آج وہ دن آ گیا ہے......ٹرک شاداب کے گھر کے سامنے رک گیا......وہ بولا......''جلدی کرو مجھے بہت ضروری کام کرنے ہیں'' وہ حیرت زدہ روتی ہوئی ان کا چہرہ ہی دیکھتی رہ گئی دل میں شور اور ہنگامہ اتنا زبردست تھا کہ آگے کچھ بول ہی نہ سکی۔ شاداب تو جا چکا تھا۔

مونی کو اپنی کوٹھی کے باہری گیٹ کے اندر چھوڑ کر شاداب اپنے فرض منصبی انجام دیتے تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ اب تو حسد کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی تھی۔ گلی گلی میں بے ہنگم خوفناک شور تھا جس کی گونج ایک بہت خطرناک حملے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ لوگوں کا اژدہام سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ ان کے

نعروں اور خوفناک پکاروں سے دل دہل رہے تھے۔ ایسے خوفناک حالات میں شاداب کا ٹرک سڑک پر دوڑ رہا تھا۔

شاداب کی امی روشن خیال خاتون تھیں۔ وہ اپنی شادی سے بالکل خوش نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا ہر انسان کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کا حق ضرور ملنا چاہیئے۔ وہ یہ جان کر خوش تھیں کہ بیٹے نے اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا تھا۔ یہ اس کا حق بھی تھا۔ وہ یہ تو جانتی تھی شاداب موہنی سے شدید ترین محبت کرتا ہے انہیں اپنے اکلوتے شہزادے کی، خوشیاں بہت پیاری تھیں۔ سوامی نے چپکے سے دل ہی دل میں موہنی کو شاداب کی ذات سے بہت پہلے ہی منسوب کرلیا تھا۔ اگر شاداب کے ابو ہوتے تو شاید امی کی اتنی جرات نہ ہوتی لیکن ابو تو شاداب کو بہت برسوں پہلے ہی اپنی محبتوں اور شفقتوں سے محروم کر کے دور چلے گئے ہیں۔ امی کو طلاق دے کر کسی اور کے ہو گئے تھے۔ ایک بار ایسے گئے کہ پھر کبھی اس گھر کا رخ بھی نہ کیا...... بیٹے کا بھی خیال نہ آیا ان کو......

امی تو بس موقع کی تلاش میں تھیں...... آج ایسے خطرناک وقت میں موہنی کو دہلیز پر کھڑا دیکھ کر ان کا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ انہوں نے اس گوہر مراد کو گلے لگالیا۔ موہنی گھبرا کر بولی ''چاچی یہ سب کیا ہوگیا'' امی بڑے پیار سے بولی بیٹی اب میں تمہاری چاچی نہیں امی ہوں۔ اپنائیت کا احساس ہوا تو موہنی کے دل کو تھوڑا سا قرار ملا...... حالانکہ موہنی غیر معمولی حالات کا سامنا کرنے کی کافی صلاحیت رکھتی تھی لیکن آج جیسی قیامت کی گھڑی میں وہ بے حد خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اس کو اپنوں کی فکروں نے گھیر لیا تھا۔ غم کی شدت سے اس کا پورا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے بولی ''امی میرے بابا'' آگے آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دکھے دل کی دکھی آواز تو آسمانوں کا جگر پھاڑ دیتی ہے...... امی کا بھی دل رو اٹھا...... اسے یقین دلاتے ہوئے بولیں تم ڈرو نہیں...... شاداب ہے نہ ان کی فکر کرنے والا...... اللہ نے چاہا تو خیر کی خبر ہی لائے گا ......ان کا رویہ روایتی ساسوؤں سے مختلف سا تھا...... امی نے اپنی ہونے والی بہو کو اپنے قریب بٹھا کر کہا بیٹی اب یہی تمہارا گھر ہے...... تمہاری ساری دنیا اس ہی گھر میں ہے۔ تم ہی اس گھر کی رونق ہو......

میری بیٹی تو ہندوستان میں رہ گئی اب نہ جانے کب ملنا ہو۔ دنیا میں کوئی بھی انسان غموں سے خالی نہیں ہے۔ ہم عورتوں کے دلوں میں تو کتنے ہی گھاؤ چھپے رہتے ہیں۔ ہم سسک تو سکتے ہیں لیکن آنسو بہا کر رو نہیں سکتے۔ کیونکہ عورتوں کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کم عمری میں اتنا بھاری دکھ جھیلنا بہت

دشوار ہوگا۔لیکن اب تو ہمیں اپنوں سے جدا کر دیا گیا۔زمین کے بٹوارے کے ساتھ ساتھ ہمارے جسم بھی بٹ گئے۔اماں بھی بلک پڑیں۔آنسو ٹپکنے لگے......اور یہ سدا کی تحمل مزاج لڑکی جو آج بے حد غمگین اور بے چین تھی من ہی میں سوچتی رہی مجھے اس طرح میرے اپنوں سے الگ کر کے ذبح ہی کرڈالا۔میری روح کو بھی موت کے گھاٹ اتارڈالا......وہ تو اپنوں سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔اس کا آہ و نالہ دیکھا نہ جاتا تھا۔

گھنٹوں پر گھنٹے گزر گئے۔جب عوام میں جذبہ انتقام تھوڑا سرد پڑا اور شہر میں حالات سدھرے تو شاداب نے گھر کا رخ کیا۔کپڑوں پر خون کے دھبے،بکھرے بال،افسردہ چہرہ آئینہ میں دیکھا تو قتل وغارت کے دہشت انگیز نظارے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔اس نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور پھر امی سے ملنے گیا۔بیٹے کو صحیح سلامت دیکھ کر ماں کے دل کو تسکین ہوئی۔وہ بولیں جاؤ اسے تسلی دو۔کسی طرح اس کے دل کو سکون پہنچانے کی کوشش کرو۔اپنی جڑوں سے الگ ہوئی۔اچانک ایک ساتھ سب کو کھودیا ہے۔یہ چوٹ بڑی گہری ہے۔جس کا دل ٹوٹے وہی اس درد کو سمجھ سکتا ہے۔کرب کی شدت سے رو رو کر جان دیے جارہی ہے۔صبر سے کام لینا......اس کا غم واقعی ناقابل برداشت ہے۔

شاداب آہستہ آہستہ موہنی کے کمرے کی طرف بڑھا۔امی کی باتوں سے ہی دل بھاری ہوگیا تھا۔پھر موہنی کے گھر والوں کی چیخیں اب بھی دماغ میں شور برپا کیے ہوئے تھیں۔وہ کرب ناک منظر اب بھی اس کا مضبوط دل ہلا رہا تھا۔شاداب نے اندر جھانکا......وہ بے بس سی بیٹھی ادھر ادھر جھانک رہی تھی اور اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔وہ دبے پاؤں بڑی احتیاط سے اندر آیا......اس نے بری طرح چونک کر شاداب کو دیکھا تھا۔وہ تو منٹ منٹ پر اس کی منتظر تھی......بڑا لمبا جان لیوا انتظار ٹوٹا تھا۔اندر کے سارے عذاب ابل پڑے۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......شاداب اس سے تھوڑی دور بیٹھ گیا اور بڑی فکرمندی سے اس کے آنسوؤں کے بہتے جھرنے دیکھتا رہا۔اس کے دل سے آہیں نکل رہی تھیں۔اُسے شدت کرب سے یوں تڑپتا دیکھ کر شاداب کے دل کو ایک زور کا جھٹکا سا لگا......عجیب سی یاسیت بھرے لہجے میں کہا،یہ عظیم دکھ میں نے تم کو دیا ہے۔میں نے تم کو اس لہو میں ڈبویا ہے۔تم میری جان بھی مجھ سے طلب کرلو۔بس رونا بند کردو۔میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔اس کے لہجہ میں پیار ہی پیار بھرا پڑا تھا۔موہنی تو غموں کی دھند میں لپٹی بیٹھی تھی۔دل میں ہزاروں وہم وگمان تھے......دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔سوال کرنے کی ہمت نہ تھی کہ نہ جانے جواب کیا ہوگا۔کپکپاتے لب بمشکل تمام کھلے......گھبراہٹ سے بھری کانپتی آواز نکلی

......"میرے بابا" پھر آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی...... شاداب نے یقین سے کہا تمہارے خاندان کے سب لوگ ہندوستان پہنچ گئے ہیں۔ آگے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زیادہ کہنے سننے کا وقت نہ تھا۔ میں نے تمہارے بارے میں بھی چاچا جی کو اطلاع دے دی ہے۔ خدا بڑا کارساز ہے۔ ان کے لیے بھی کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا...... وہ تڑپ کر بولی...... "میں اپنے گھر میں سب کی پیاری ہوں۔ میرے بنا ان لوگوں کا کیا حال ہو رہا ہوگا...... انہیں سب کو کھو کر میں کتنی تنہا ہوگئی ہوں۔ وہ بولا...... اس میں شک وشبہ نہیں۔ یہ تو خون کا تقاضہ ہے۔ سب تم سے محبت تو ضرور بیحد کرتے ہیں لیکن بیٹیاں باپ کے گھر میں مہمان ہوتی ہیں۔ ایک دن تو ہر لڑکی کو اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔ وہ جھکی نظروں کے ساتھ افسردگی سے بولی، اس طرح...... کون سی بیٹی باپ کی دہلیز چھوڑتی ہے۔ وہ لاجواب ہو گیا...... کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔ وہ بولی جو زندگی میں سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں ان سے بچھڑ کر جینا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ مجھے یوں چرا کر تم نے جو وعدہ پورا کرنے کا عہد کیا تھا کر لیا...... یہ نہیں سوچا اپنے خون سے کٹ کر اپنوں سے جدائی کا غم اور گھر ٹوٹنے کا درد بڑا گہرا ہوتا ہے۔ مجھے تو ان کا غم مار ہی ڈالے گا...... اب آئندہ نہ ہی ان کے چہرے کبھی دیکھ پاؤں گی اور ناں ہی ان کی آوازیں سن پاؤں گی۔ صرف ٹوٹے ہوئے دل ہی زخم جدائی کا درد سمجھ سکتے ہیں۔ غموں کی وارث میں ہی کیوں بنائی گئی۔ میری ہی قسمت میں اتنے ڈھیر سارے دکھ کیوں آئے۔ قسمت کا ستم تو دیکھو تمہیں پایا اور سب کھو دیا۔ شاداب کچھ تو بولو...... میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا...... آنسو متواتر بہہ رہے تھے۔ وہ پھر چپ بیٹھ گئی۔

شاداب نے بڑی سادگی سے کہا، کس کو معلوم تھا حالات یوں بدل جائیں گے۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی۔ تب موہنی نے خالی اور اداس نظروں سے شاداب کو دیکھا۔ ناراض ہو مجھ سے۔ میرا تو اتنا قصور ہے کہ تم سے محبت ہی جنوں کی حد تک کر بیٹھا ہوں۔ تم میری چاہت اور میری زندگی، ہر روح اور ہر خوشی کا عنوان ہو...... میں وہ زندگی ہرگز قبول نہیں کر سکتا تھا جس میں تم نہ ہو...... اور مجھے اس بات کا بھی قوی یقین تھا کہ یہ بات تمہارے دل میں بھی ہے۔ تمہیں حاصل کرنے کی اس سے بہتر ترکیب سمجھ میں نہیں آئی وقت ہی کہاں تھا کہ چاچا سے جا کر تمہارا ہاتھ مانگتا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیتا۔ تمہیں کھو کر میں بھی تو بالکل تنہا ہو جاتا...... تم میرے دل کی دھڑکنوں میں سمائی مجھے صدائیں دے رہی تھیں اور میری جان مجھے تمہاری طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔ پھر میں اپنے آپ پر اور اپنے دل پر قابو نہ کر پایا۔

جب دو دلوں کی ایک ہی آرزو اور ایک ہی لگن ہوتی ہے تو وہ ایک ہی انداز میں دھڑکتے بھی ہیں...... پھر یہ تو ہونا ہی تھا...... بھئی یقین کرو ہمیں گوہر مراد نہ ملتا تو ہماری یہ زندگی کیسے کٹتی۔ شاداب کا حرف حرف محبت برسا رہا تھا۔ چند لمحے ساکت وصامت رہنے کے بعد وہ دھیرے سے بولی ہاں یہ تو سچ ہے ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے جان سے گزر جانے کے عہد و پیمان تو کیے تھے...... لیکن بھلا کوئی اپنے خون کو کبھی بھلا سکتا ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن سب ہی چھوٹ گئے۔ بڑا جان لیوا دکھ ہے۔ وہ خاموش ہوگئی لیکن چہرے سے ظاہر تھا اندر دردوکرب کی لہریں موجزن تھیں۔ وہ روتی رہی...... کچھ وقفہ کے بعد شاداب بولا ...... دو دلوں کی تمنائیں پوری ہوئی تھیں شاید اس ہی لیے میں زندہ واپس لوٹ آیا ہوں۔ وہ تو غموں سے گھری تھی۔ کچھ سوچ کر بولی تم نے اپنی جان کی پروانہ کرکے میرے خاندان کو بچایا ہے میں زندگی بھر تمہارے اس احسان کو نہیں بھولوں گی۔ وہ ہولے سے مسکرایا...... احسان...... ارے احسان تو تم نے مجھ پر کیا ہے۔ میری محبت کی خاطر اپنا وطن اور اپنوں کی محبتیں قربان کردیں...... تم جیسی محبت کرنے والی کے لیے میں اگر اپنی جان بھی دے دیتا تو کم تھا۔ اب جہاں میں ہوں گا وہاں تم ہوگی...... ہر وقت میرے ساتھ ...... کل ہمارا نکاح ہوگا...... موہنی نے بری طرح چونک کر شاداب کا چہرہ دیکھا...... وہ بے ساختہ بولی...... نکاح...... وہ بولا کتنی مدت سے ہم دونوں نے اس گھڑی کا انتظار کیا ہے...... کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کردی...... وہ اب بھی اپنے خیالوں میں ڈوبی تھی بولی یہ گھڑی آئی بھی تو اتنی مصیبتوں کے ساتھ...... شاداب نے بڑی نرم نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا یہ تو نہ بھرنے والے گھاؤ ہیں لیکن اب تمہارا ہر دکھ اور سکھ میرا ہے۔ وہ بلک کر بولی کاش تم سمجھ سکتے۔ میرے دل میں زخموں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا...... لگتا ہے ان کی یادوں سے دل پھٹ جائے گا۔ شاداب جب ساری امیدیں اور انتظار ختم ہوجاتا ہے تو پھر انسان کے اندر کچھ نہیں بچتا...... کچھ بھی نہیں۔ کیوں آسمان کے سارے عذاب ایک ہی ساتھ ہمارے وطن پر برس پڑے۔ بڑا ظلم برپا ہوا ہے۔ دیکھو چاروں طرف تباہی پھیلی ہے۔ شور، ماتم، دھواں، جلتے بدن، ساری زمین شمشان بن گئی ہے۔

شاداب آج ماتم کی طویل سیاہ بھیانک رات ہے۔ آؤ اس تاریک شب میں ہم دونوں مل کر راستے پر بھٹکتے ہوئے ان سب مسافروں کی سلامتی کے لیے دعا کریں جن کے بدن اذیتوں سے نڈھال ہوچکے ہیں۔ چلتے چلتے ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ جن کے نصیبوں میں خانہ بدوشی کے بے انتہا

دکھ لکھے ہیں۔ جو نہ معلوم سمت کی طرف نکل پڑے ہیں۔ جن کا کوئی ہمدرد اور مددگار نہیں۔ کوئی اپنا نہیں۔ نہ زادراہ ساتھ ہے۔ نہ راستے کی خبر...... نا منزل کا کوئی ٹھکانہ۔ شاید رات کی تاریکی میں بے گھر آسمان کے تلے بیٹھے ہوں۔ جن کے ٹوٹے دلوں میں زخم جدائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں...... اپنوں سے دوری کے درد سے ان کے دل چیخ رہے ہوں گے۔ آؤ اپنے پیارے اور عزیز لوگوں سے بچھڑنے کا افسوس کریں۔ دیکھو صرف خون، آگ اور دھوئیں کے بادل ہی بادل دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں انسان جنگلی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ کہاں گئی انسانوں کی انسانیت...... آؤ ان کے لیے ماتم کریں جن کو موت نے نہیں ظالم انسانوں نے مارا ہے۔ بیدردی سے قتل کر ڈالا ہے۔ وہ ہمیں چھوڑ کر بہت دور چلے گئے ہیں اور وہاں سے اب کبھی واپس نہ آئیں گے۔ کیونکہ وہاں سے واپسی کی کوئی ڈگر ہی نہیں ہے۔ شاداب یہ ملن کی رات نہیں۔ یہ تو بچھڑنے کی رات ہے۔ سوگ منانے کی رات ہے۔ وہ بولے جا رہی تھی۔ شدت غم سے اس کا دل و دماغ بے قابو ہو گیا تھا۔ شاداب اس کے غمگین سراپے کو گھورتا رہا۔ بڑی دھیمے سے بولا...... میں مجبور تھا اپنی محبت کے ہاتھوں۔ یقین کرو میری طرف سے تمہارے لیے یہ آخری دکھ ہوگا...... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا...... اس کی آنکھوں میں بھی اشکوں کی نمی اتر آئی پھر وہ چلا گیا اور رات زینہ بہ زینہ اترنے لگی۔

دوسرے دن دونوں کا نکاح ہو گیا...... وہ موہنی سے ماہ بانو بن گئی...... اسے اپنے نصیبوں پر رونا آ گیا۔ جھکی پلکوں سے دو موتی سرخ رخساروں پر ڈھلک ہی گئے۔ ہر عورت کو یہ خوشی ایک بار ہی ملتی ہے۔ آج جب اس کی زندگی کی سب سے حسین رات آئی تو ماہ بانو کا دل بہت مضطرب تھا۔ دونوں کے چہروں پر دکھ کے سائے پھیلے ہوئے تھے اور اسی اضطرابی حالت میں دن گزرنے لگے۔ شاداب کی محبت کی پھوار ایسی اثر انداز ہوئی کہ آہستہ آہستہ اس کے جسم و جان میں عجیب سا سکون در آنے لگا...... ماہ بانو نے اپنے اس عظیم درد کو تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا۔ اپنے بیشتر احساسات کی قربانی دے دی اور اس ماحول میں ڈھلنے لگی۔ پھر اماں کا ڈھیروں پیار بھی ملا تو وہ سنبھل گئی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اس جان لیوا دکھ سے نکل ہی نہیں پائی۔ دل میں دھڑکا تو ہر وقت لگا ہی رہتا تھا نہ جانے سب کہاں ہوں گے، کیسے ہوں گے۔ تنہائی میں جب یادیں گھیر لیتیں تو سینے کی تہہ میں چھپے دکھ اوپر آ جاتے۔ چھپ چھپ کر گھٹ گھٹ کر خوب روتی۔ نہ ہی سکون واپس آیا اور ناں ہی بیتے دنوں کی وہ خوشیاں۔ سب ایسے بچھڑے جیسے بچھڑے ہوئے وہ سارے

لوگ......اور زندگی ہنستے روتے گزرنے لگی۔

ہندوستان میں بھی ابھی حالات سنبھلے نہ تھے۔ امن وامان کی کمی تھی۔ سب کچھ بدل رہا تھا۔ نئے نئے چہرے دکھائی دیتے تھے۔ نئی نئی بستیاں بس رہی تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں بڑی دہشت سا گئی تھی۔ خانہ بدوشی کے ہزاروں دکھ جھیلنے کے بعد کوٹھی میں رہنے والے لالہ جی کو ایک کمرے کی چھت نصیب ہوئی۔ وقت کی ستم ظریفی تو دیکھیے نوکری کی کھوج میں گدیوں پر بیٹھنے والے کے تلوے بھی چھلنی ہو گئے۔ ایک دن قسمت کا ستارہ چمکا۔ لالہ جی کو ایک ملازمت مل گئی۔ ان کا بیٹا بھارت دن میں کالج جاتا اور شام کو ایک دکان میں کام کرتا۔ شفالی بھی کالج جانے لگی۔ ارملا دیوی کے بھی بھاگ جاگے۔ انہیں اسکول میں ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ ان کا اکلوتا بیٹا اشون کاروباری دماغ کا لڑکا تھا اس نے چھوٹی سی بزنس شروع کی۔ قسمت جاگی اور بزنس روز بروز ترقی کرتی گئی۔

زمانہ خراب تھا......لالہ جی شفالی کی ذمے داری سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ رشتے تو بہت سے آئے لیکن جان پہچان نہ ہونے کی وجہ سے لالہ جی نے انکار کر دیا۔ شفالی کی صورت تو تھی ہی بڑی دلکش بڑی پیاری۔ رنگ سنہرا سنہرا...... مسکراہٹ اور بھی دلفریب تھی۔ مسکراتی تو دانت موتیوں کی طرح بکھر جاتے۔ آنکھیں اتنی پر کشش تھیں کہ لوگ اس کو رک رک کر نظر بھر دیکھتے تھے۔ ارملا دیوی کی نظریں اس خوبصورت اور خوش اطوار لڑکی پر بہت پہلے سے جمی تھیں۔ جب انہوں نے بڑی چاہ سے شفالی کو مانگا تو لالہ جی نے رشتہ مناسب اور واضح سمجھ کر ہاں کر دی۔ پرانی دوستی تھی اور لڑکا دیکھا بھالا تھا۔ شفالی شادی ہو کر ارملا دیوی کے دو کمروں کے مکان کی زینت بن گئی۔

صرف گھر ہی تو بدلا تھا۔ محلّہ وہی تھا۔ محلے والوں کو یہ شائستہ اطوار اور خوش اخلاق لڑکی بڑی بھلی لگتی تھی۔ وہ سب بزرگوں کی عزت کرتی۔ چھوٹوں سے پیار اور اپنی سہیلیوں پر جان چھڑکتی تھی۔ شفالی کو سسرال جا کر ہی احساس ہوا کہ بابا آدم کے زمانے سے آج تک کوئی بھی شخص وقت کا اتنا پابند نہ ہوگا جتنی اس کی ساسو جی ہیں۔ ساسو جی کا دماغ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ شادی کے دوسرے ہی دن سے یہ نئی دلہن ساس کی خدمت اور بیٹے کی غلامی کرنے پر مامور کر دی گئی۔ ان کا خیال تھا کہ بہو صرف گھر کے کام کاج سمیٹنے کے لیے آتی ہے۔ ماں اور بیٹے بڑے ہی خشک مزاج ثابت ہوئے۔ سدا کا کاہل اشون جب جب اسے پکارتا وہ دوڑ جاتی۔ دل دھڑک دھڑک جاتا۔ وہ ہزاروں ارماں چھپائے اس کے

چھوٹے بڑے کام انجام دیتی لیکن وہ ظالم اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہاں جب کبھی ماں گھر میں نہ ہوتیں تو ہنس کر ایک دو بات ضرور کر لیتا۔ وہ پریشان تھی کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

ماں تو ہر وقت جلی بھنی سی رہتی تھیں۔ شفالی کو دیکھتے ہی ان کا پارہ اور چڑھ جاتا۔ شفالی نے سوچا وقتی ابال ہے آہستہ آہستہ خود ہی بدل جائے گی۔ اشون کی بزنس عروج پر تھی۔ پیسے کی فراوانی تھی۔ اب تو آسائشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ماں کو بیٹے کی شادی کا ملال ہوا۔ بیٹا حسین جوان تھا۔ اب دولت بھی تھی۔ اس لیے بس وہ کسی طرح شفالی سے جان چھڑانے کے منصوبے بنانے لگیں۔

شفالی چاہتے ہوئے بھی اپنی ماں کے سامنے کچھ کہہ نہ سکی۔ جانتی تھی مونی کا دکھ ہی سب کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ اس کا صدمہ تو جان ہی لے لیگا...... دوسرے وہ اشون کو اپنے گھر والوں کے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شفالی سب حالات سے بے خبر دونوں کو خوش کرنے کی سعی میں ناکام ہی رہی...... ساس کی طعنہ زنی ڈانٹ ڈپٹ اور اشون کی بے نیازیاں اور لاپروائیاں دیکھ دیکھ کر اس کا دل ہلکان ہو گیا۔ ایک دن اشون سے سوال کر ہی لیا کہ آخر وہ کیوں دونوں کے ظلم کا شکار بن گئی ہے اور اشون کیوں چھوٹی چھوٹی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ اشون نے اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر بڑی لاپرواہی سے کہا تم کوئی نرالی تو نہیں سب بہوؤں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بہو کی آزادی پسند نہیں کرتے۔ تمہارے لیے تو شکر کا مقام ہے کہ کالج جانے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ آئندہ کوئی سوال کرنے کی جسارت نہ کرنا۔ وہ رات بھر سسک سسک کر روتی رہی۔ اشون نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے اپنے دل کو سنبھالا۔ اپنے نصیبوں سے سمجھوتا کر لیا کہ اس تپتے صحرا میں سایۂ دیوار کی خواہش ہی فضول ہے۔ ساس اور اشون کی بدسلوکیوں نے کالج کی سب سے اسمارٹ اور ذہین لڑکی کی شخصیت کو دبا کر رکھ دیا۔ وہ بہت اداس اور خاموش رہنے لگی تھی۔

ساسو جی کی دوستیں بھی ان کی ہی طرح ٹیڑھی مزاج کی تھیں۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانا ان کا مشغلہ تھا۔ جب جب گھر آتیں واپسی چنگاری چھوڑ جاتیں جو ذرا سی ہوا لگتے ہی شعلہ بن جاتی۔ اس دن سب ہی حاضر تھیں۔ شفالی چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو ساس کا تمتماتا چہرہ دیکھ کر دہشت کا احساس ہوا۔ عجیب ہی حادثہ ہوا...... بنا کسی لحاظ کے سب کے سامنے بکھر پڑیں۔ ان کا ایک ایک سلگتا حرف شفالی کے دماغ کو ہلا رہا تھا۔ سب کی مسکراہٹیں شفالی کے دل کو سوختہ کر گئیں۔ شفالی نے

بڑے صبر اور تحمل سے کام لیا۔ نیچی نظریں کیے ساس کے احکامات کی تعمیل میں مصروف رہی۔ دو سال سے وہ یہ ذلالت سہتے سہتے بیزار ہو گئی تھی اور آج کا حادثہ بیحد دل گرفتہ تھا۔ اس کے دل کو بڑا دھچکا لگا تھا...... اشون کو دیکھ کر وہ بھی گرج پڑی...... میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہو رہا ہے...... اشون نے پوری بات سننے بغیر ہی قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہا اگر ہم اتنے ہی برے لگتے ہیں تو ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ سنتے ہی شفالی کے بھی ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ دھیمے مگر سخت لہجے میں بولی...... میں خود تو اس گھر میں نہیں آئی تھی۔ تمہارے بھی دل میں میرے لیے ذرا سی ہمدردی اور پیار نہیں ہے۔ اشون نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''جہاں پیار ملے وہاں چلی جاؤ'' شفالی کے وجود میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ اشون کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ کتنے سنگدل اور کٹھور ہو تم...... یہ میرا گھر ہے...... بھلا میں تمہیں چھوڑ کر زندہ بھی رہ سکتی ہوں۔ ذرا میری ایک بات سنو...... تمہارا غصہ اتر جائے گا...... بڑی امید سے اس کے چہرے کی جانب دیکھ کر بولی مجھے روتا چھوڑ کر نہ جاؤ...... آج نہ جاؤ...... میرے آنسو تو تھمنے دو...... میری بات سن لو...... پھر چلے جانا۔ اشون نے اس کی التجا کو قطعی نظر انداز کیا۔ ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گیا۔ وہ دن بھر کی تھکی ہاری تھی۔ نیند کو شکست دے کر تمام رات اس بیدرد کا انتظار کرتی رہی۔ پیاسی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ رات گزر گئی...... وہ نہیں آیا۔

دوسرے دن کام میں مشغول رہی لیکن بیتے دن کے واقعات ذہن سے نہ مٹے۔ پھر اپنے دل کو خود ہی تسلی دی کہ روایتی شادیوں کی سماج میں قدر اور اہمیت ہے۔ اگنی اور بھگوان کے سامنے ساری زندگی ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہے یہ رشتہ ہرگز ہرگز ناپائیدار نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ سوچ کر رو پڑی کہ اس رشتے میں کوئی جذباتی لگاؤ ہی نہیں ہے۔ شادی تو دو دلوں کا میل ہوتا ہے۔ اور اشون نے کبھی کسی چاہت اور لطیف جذبے کا اظہار ہی نہیں کیا تھا۔ یہاں پیار اور محبت کا سنگ میل ہی نہیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا...... آنسو پونچھ کر چائے کی ٹرے لئے دروازے پر پہنچی اندر ماں اور بیٹے میں کسی خاص موضوع پر بحث جاری تھی۔ اشون کہہ رہا تھا...... آخر اماں آپ کیا چاہتی ہیں...... اس کا دماغ گھوم گیا...... سہم گئی...... ایک نامعلوم خوف اور دہشت اس پر حاوی ہو گئی۔ بہت سے اندیشے اسے ڈرانے لگے...... بہت سوچا۔ اشون کے سوال کا جواب ہی نہ ملا۔ لیکن آج وہ بہت دہشت زدہ تھی۔

دن تو ان کی سوچوں میں گزرا۔ شام ڈھلے وہ اپنی ساس اور اشون کے ساتھ بابا کے سامنے مجرم

بنی کھڑی تھی دہشت، خوف اور رنج کی کیفیات ایک ساتھ اس کے دماغ پر حملہ آور ہوئیں تو وہ سسک اٹھی۔ ساسوجی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شکوے اور شکایتوں کا پٹارہ کھول دیا۔ زہر آمیز لہجے میں گرجیں۔ میں نے شادی کے وقت کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ صرف خالی لڑکی لی تھی۔ آج آپ کی خالی لڑکی واپس کرنے آئی ہوں۔ شفالی کا دل چاہا چیخ چیخ کر ساری دنیا کو سنا دے وہ خالی نہیں ہے۔ یہ جھوٹ ہے...... لیکن اشون کی سرد اور اجنبی نگاہیں اسے ڈرانے لگیں...... ساس اتنی تلخی اور روانی سے بولے جا رہی تھیں کہ وہ بالکل حوصلہ شکن ہوگئی...... کچھ بھی نہ کہہ سکی اور دم سادھے سنتی رہی۔ اسی انداز میں بولیں میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرواؤں گی۔ شفالی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا...... لالہ جی کی تھرتھراتی آواز نکلی...... بڑے ارمان سے آپ نے میری بیٹی مانگی تھی۔ یہ رشتہ آپ کی خواہش سے طے ہوا تھا...... اس پس ماندگی کی حالت میں میرے پاس سوائے لڑکی کے اور آپ کو دینے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں بدنصیب باپ ہوں ایک لڑکی وہاں کھو چکا ہوں۔ اب دوسری کا دکھ نہ سہہ سکوں گا۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ ارملا دیوی کرختگی سے بولی، اب یہ میری چھت کے نیچے نہیں رہ سکتی۔ میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔ ان کے خوفناک منصوبوں نے لالہ جی کو ڈرا دیا۔ ہمت باندھ کر بولے ہمارے جیسے شریف گھرانوں کو ایسی باتیں گراں گزرتی ہیں۔ ہمارے خاندانوں میں لڑکیوں کے معاملے عدالت تک کبھی نہیں گئے۔ آپ پرانی دوستی کا لحاظ کر کے ہی اپنا فیصلہ بول دیں۔ ورنہ میں غارت ہو جاؤں گا...... باپ نے ہاتھ جوڑے۔ منتیں سماجتیں کیں۔ ارملا دیوی کا دل نہ پسیجا...... اچانک ماں اور بیٹا کھڑے ہوگئے۔ چہرے پر ظالمانہ مسکراہٹ لیے بولیں۔ ہمارا رشتہ آج سے ختم ہوا۔ اشون کی نظریں شفالی کی طرف اُٹھیں جن سے صرف بیگانگی، حقارت اور ظلم ٹپک رہا تھا۔ سب حیرانی سے ساکت دیکھتے ہی رہ گئے۔ بلا کی خاموشی طاری ہوگئی۔ ایک اور کچی دیوار ایک ہی ٹھوکر میں ڈھے گئی تھی۔

اچانک زور کی آندھی کا ایک تیز جھونکا آیا تھا اور اس گھر کی جو تھوڑی سی خوشیاں باقی تھیں وہ بھی اڑا کر لے گیا تھا۔ لالہ جی کے پیروں تلے سے زمین کھسکی اور جسم میں سے جان ہی نکل گئی۔ وہ وہیں کرسی پر ڈھے گئے۔ بھارت کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے غصہ سے سرخ ہوگیا تھا اب زرد ہو کر بے جان سا دکھائی دے رہا تھا۔ اماں کی بیقراری اور غم چہرے پر واضح تھے۔ شفالی تو اس دکھ کی اذیت سے نیم جان سی ہوگئی تھی۔ اماں نے سب کو ٹوٹتے دیکھا تو اپنے کو سنبھال کر بولیں۔ جس کے رحم سے مصیبتوں کے عمیق اور گہرے سمندر پار

کئے ہیں وہ ہماری صدا ضرور سنے گا۔ شفالی نے اماں کو دیکھا اور بے حواس سی ہو کر انکی گود میں منھ چھپا کر بے تحاشا رونے لگی۔ اماں بھی زیادہ دیر اپنے کو سنبھال نہ سکیں۔ آنسو بہہ بہہ کر بیٹی کے بالوں میں جذب ہونے لگے...... ارملا دیوی کی لگائی آگ میں سب کے تن من جل رہے تھے۔ ٹک ٹک بس گھڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی اور یہ منحوس رات بھی بیت گئی...... صبح ساری دنیا روشن ہوگئی لیکن اس گھر پر گہری تاریکی کے بادل چھائے رہے۔

شفالی نے دو گھونٹ چائے پی اور الٹی کرنے نل کی طرف دوڑی۔ کچھ دیر بعد تھوڑا کھایا اور وہ بھی الٹ دیا...... اماں نے حیرت سے بیٹی کو دیکھا اور لالہ جی کو پکارا۔ یہ کیا...... کل یوں ہی جھوٹا الزام لگا کر چلی گئیں اور تو نے بھی زبان نہیں کھولی...... اشارتاً تو ان کے سامنے ذکر کر ہی سکتی تھی۔...... شفالی کو روتا دیکھ لالہ جی بولے...... تو رو نا میری بچی تیری خوشیوں کی بھیک مانگنے میں خود ان کے در جاؤں گا۔ اشون ضرور سمجھ جائے گا...... تب شفالی نے سارا قصہ ترتیب وار بیان کیا کہ کس طرح ساس قطرہ قطرہ اس کا خون پیتی رہیں۔ بدمزاج ساس کی تیز مزاجی کا اور اشون کی بے توجہی کا حال سن کے دل رنج وغم سے چیخ اٹھے۔ وہ بولی اس گھر میں ساس کے حکم کے بنا تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا اشون کی کیا مجال جو ان کے سامنے چون چرا بھی کر سکے۔ وہ خود غرض اور خود پرست لوگ ہیں ان کے سامنے دامن پھیلانے سے کچھ بھی نہ ملے گا سوائے رسوائی کے۔

حالات کی جدوجہد نے لالہ جی کو یوں بھی کمزور کر دیا تھا...... مجبور باپ ارملا دیوی کے سامنے بھکاری بنے کھڑے رہے۔ کچھ دیر تو سر بھی نہ اٹھا سکے۔ پھر بمشکل بولے شفالی ماں بننے والی ہے۔ ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگی۔ بہت گڑگڑائے۔ ارملا دیوی کی طرف سے شکایات کا سلسلہ جاری رہا۔ گردن تان کر غرور سے بولیں آپ کی بیٹی ہمارے توقعات پر پوری نہیں اتری۔ کھڑی ہو کر بولیں میرا فیصلہ اٹل ہے۔ یعنی یہ کہ اب آپ جا سکتے ہیں۔ خون کا گھونٹ پی کر لالہ جی واپس لوٹ آئے۔ اب آگے کوئی امید نہ تھی۔

وقت کا دریا دھیمے دھیمے بہتا رہا...... اچانک لالہ جی کو سرکار کی طرف سے معاوضہ ملا۔ بھارت کو بہت عمدہ نوکری مل گئی اور سنگیتا بہو بن کر اس گھر میں آ گئی۔ شفالی کو اب خود اپنی زندگی کا بوجھ ڈھونا تھا سو اس نے بھی نوکری کر لی۔ مالی حالت تو سدھری لیکن گھر کے ماحول میں تبدیلی نہ ہوئی۔ تقدیر نے شفالی کے

ساتھ بہت ظالمانہ مذاق کیا تھا وہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھال نہ پائی۔ وہ تو ہر شے سے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ سی ہوگئی تھی۔ لوگ اس کے حال زار پر ترس کھاتے تھے۔

ابھی دو سال قبل ہی تو وطن پر آفت ٹوٹی تھی۔ بے انتہا خونریزی کے ساتھ عورتوں کو بے حرمت کیا گیا تھا۔ اب بھی لوگوں کے دلوں میں دہشت چھائی ہوئی تھی۔ پھر ایک بڑا انقلاب آیا۔ سماج کے رہنماؤں اور بزرگوں نے سماج سدھارنے کے لیے قدم اٹھائے۔ عورتوں کی حفاظت ان کی توجہ کی مرکز بن گئی۔ لالہ جی کی بربادی سے سب ہی پریشان تھے۔ ارملا دیوی سے ملے۔ ان کی ظالمانہ حرکت کی مزاحمت کی گئی۔ بولے ہم کسی لڑکی پر تشدد برداشت نہیں کریں گے اور آپ جیسی تعلیم یافتہ خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا کورٹ کچہری کا خیال دل سے نکال دیں اور اس بے قصور لڑکی کو واپس بلالیں ''ورنہ''...... نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ارملا دیوی مغرور اور سرکش خاتون نے جھکنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ سب بزرگوں کی نصیحتیں رائیگاں گئیں ...... انہوں نے ''ورنہ'' جیسے معنی لفظ پر قطعی توجہ نہ دی۔

کورٹ میں ساس کو دیکھتے ہی شفالی کا دم رکنے لگا تھا۔ وہ شدید خوفزدہ تھی اور ساس بیحد پرسکون نظر آرہی تھیں جیسے ان کے سارے ارادے پایہ تکمیل کو پہنچ چکے ہوں۔ لالہ جی اور بھارت تو کسی سے نظر ملانے کے قابل ہی نہ تھے۔ بیٹی پر الزام بھی اتنا گھناؤنا اور بیہودہ قسم کا لگایا تھا۔ جس نے سنا دانتوں تلے انگلی دبالی۔ اشون نے اس الزام کی تائید یہ کہہ کر کی کہ ''میں اس کے بچے کا باپ نہیں ہوں۔ اس کا جواب یہ ہی دیں گے'' سارے سننے والوں کو ایسا لگا کہ ساری کائنات میں ہلچل مچ گئی ہو۔ شفالی ماں کے شانے پر گر کر بیہوش ہوچکی تھی۔ اشون اور ارملا دیوی سب کی غضب آلودہ نظروں کا شکار ہوگئے۔ جج نے فیصلہ بھی دھیمی اور اداس آواز میں سنا دیا۔ لالہ جی پسینے سے شرابور تھے۔ آنکھیں لال انگاروں کی طرح سرخ ہوگئیں۔ ایک معصوم لڑکی پر یہ گھناؤنا الزام موت کی سزا سے کہیں زیادہ تھا۔ پھر کورٹ روم میں کہرام مچ گیا۔ لالہ جی کا ناسوروں بھرا دل سسک اٹھا۔ دو سال ہی تو ہوئے تھے ایک بھیانک طوفان بڑی بیٹی کو بہالے گیا تھا اور آج یہ وحشت ناک سیلاب ایک ہی ریلے میں سب سے قیمتی شے بہالے گیا تھا۔ خاندان کی عزت لٹ گئی تھی۔ اب تو کچھ بھی نہ بچا تھا۔ لالہ جی میں تو چلنے کا بھی مقدور نہ رہا...... بڑی مشکل سے اپنے لرزتے جسم کو گھسیٹ کر باہر لائے تھے۔ پھر محلے کے دوستوں نے تھام لیا تھا۔

اس عجیب سے ماحول میں ارملا دیوی فتح مندی کے احساس سے سرشار سر اونچا کرے کورٹ

سے باہر نکلیں۔ بھارت کے اندر کا دہکتا ہوا خون پسینے کی بڑی بڑی بوندیں بن کر ٹپک رہا تھا۔ سنگیتا سے بولا ایک پل میں یہ کیسی قیامت آئی، اشون کے دو جملوں نے ہمارے خاندان کی دھجیاں بکھیر دیں۔ یہ ندامت تو ہمیں نگل جائے گی۔ میرا خون بھی اس داغ کو مٹا نہیں پائے گا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سنگیتا سہمی سہمی سی تو تھی گھبرا کر بولی واقعی یہ وار بڑا گہرا ہے ہماری روحوں تک کو گھائل کر گیا ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ کو سنبھالنا تو ہوگا۔ ستون ڈھے جائے تو عمارت کا حشر کیا ہوتا ہے...... بھارت گھر پہنچا اپنا دروازہ بند کر کے دھاڑیں مار مار کر رویا لیکن اندر کا ابلتا الاؤ کم نہ ہوا۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ان سب کے تن من سلگ رہے تھے۔

ہسپتال میں شفالی کو ہوش آیا تو اماں کہہ رہی تھیں اب تو اکیلی نہیں ہے۔ خدا نے ہمارے ساتھ انصاف کیا ہے۔ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ تیرا بیٹا ہی بڑا ہو کر اپنے باپ سے بدلہ لے گا بجائے خوشی اور شادمانی کے شفالی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بڑی دلسوزی سے بولی۔ اماں غنیمت ہوتا جو مجھے موت آجاتی۔ میں تو خود اپنے آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔ موت کو بھی میرے اوپر ترس نہیں آیا...... یہ مرد بھی کیا شے ہے جب چاہے عورت کے سر تاج پہنا کر ملکہ بنا دے اور جب چاہے تخت شاہی سے گرا کر دنیا کی نظروں میں مجرم ٹھہرا دے۔ ایک مجرم ماں کے بیٹے کے لیے تو تمام دنیا کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ جس بچے کی شناخت ہی نہ ہو...... جس کا کوئی دامن ہی نہ ہو اس کا اس دنیا میں کیا مقام ہوگا...... ابھی وہ اسی بحران سے گزر رہی تھی کہ نرس بچہ لے کر آ گئی۔ دیکھتے ہی دونوں کی بہتی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ ماں کے اندھیرے دل میں ممتا کا چراغ جل اٹھا۔ بیقرار دل ٹھہر گیا...... اولاد بڑی نایاب چیز ہوتی ہے۔

بچے کی آمد نے اس سنسنان اور ویران گھر کے پژمردہ لوگوں کے دلوں میں پھر سے زندگی کا احساس جگا دیا محلے والوں کی محبت اور شفالی کی سہیلیوں کی ہمدردی نے ان کے ڈوبتے دلوں کو سہارا دیا۔ شفالی جو دل ہی دل میں ہر وقت موت کو پکارتی تھی اب اس میں جینے کی ہمت پیدا ہو گئی۔ لیکن رات کے سناٹوں میں جب ساری دنیا محو خواب ہوتی وہ اکیلی بیٹھی اپنے لاڈلے بیٹے کا معصوم چہرہ دیکھ کر حالات کی سنگینی کا جائزہ لگا کر خوفزدہ ہو جاتی۔ ندامت کا خیال رات بھر جگائے رکھتا۔ خیالوں میں اشون آ جاتا۔ دنیا میں ایک وہ ہی تو تھا جو اس بچے کو آنے والے عذابوں سے بچا سکتا تھا۔ اس کا ذہن مفلوج ہو جاتا پس دل سلگتا رہتا...... لیکن اب ایسا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ بہت سے دن ایسے ہی بیت گئے۔ اور اپنے کو سنبھال نہ سکی

اور نا ہی اپنی فکروں اور سوچوں کا کوئی حل نکال سکی۔ اس کے دل کی بے چینی میں مسلسل اضافہ ہوتا ہی گیا۔

محلے والوں نے ارملا دیوی اور اشون کے کارناموں کے چرچے نگر نگر پھیلا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنے ارادوں میں کامیابی نہ ہو سکی۔ ان کے لیے ہر گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔ اشون کے زیادہ تر دوستوں نے تو کنارہ کر ہی لیا تھا۔ ایک دو جو باقی تھے۔ وہ بھی اسی کو خطاوار سمجھتے تھے۔ اس کو بار ہا ایک صلاح دیتے تھے کہ ماں کی ضد اور ہٹ دھرمی نے اس کی زندگی تباہ و برباد کر دی ہے۔ بہتر ہے ماں کو سمجھا بجھا کر شفالی کو واپس لے آئے۔ کیونکہ سماج سے کٹ کر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر اشون کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو ہی گیا لیکن ماں کے سامنے بولنے کی جرات نہ تھی۔ وہ تو آج تک ان راہوں پر چلا تھا جن پر ماں نے انگلی پکڑ کر چلایا تھا۔

جب ارملا دیوی ٹس سے مس نہیں ہوئیں تو محلے کے چند بزرگ ان سے ملے جنہیں دیکھ کر وہ گھبرا گئیں۔ وہ بولے اخلاقی زوال سے ہی معاشرے کا زوال ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اب بھی ہم نہ سنبھلے تو آگے کی نسل کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ ہمارے مشرقی سماج میں بہوؤں اور بیٹیوں کی قدر ہوتی ہے۔ رشتوں کا احترام ہوتا ہے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عورت تھوڑا بہت بھی پڑھ لے تو مردوں کا مقابلہ کرنے لگتی ہے۔ اپنے کو مردوں کے برابر سمجھنے لگتی ہے۔ زیادہ آزاد خیال ہو تو سماج میں اپنا درجہ ہی بھول جاتی ہے۔ ہم سب روایت پسند لوگ ہیں۔ اور ہم سب کو اپنی روایت کی پاسداری کرنا ضروری ہے۔ آپ نے ایسا بے بنیاد اور بیہودہ الزام لگا کر ایک لڑکی کے ہی نہیں ہمارے سارے سماج کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ ارملا دیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ حیران حیران سب کے چہرے دیکھتی رہیں پھر تند اور تیز آواز میں گویا ہوئیں ...... فیصلہ میرا نہیں عدالت کا ہے۔ وہ بولے عدالت کا فیصلہ غلط اور انتہائی ظالمانہ تھا...... سچائی سے آپ واقف ہیں سو اپنے فیصلے پر خود نظر ثانی کریں۔ ایسی غیر اخلاقی حرکت کرنے سے قبل سوچ لینا بہتر تھا۔ آپ نے ہمارے سماج کے اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی کی ہے۔ انصاف کی اصل کنجی سماج کے رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ وہ اچانک کھڑے ہو گئے آخری الفاظ کچھ اس طرح سے کہے کہ ارملا دیوی حد سے زیادہ پریشان ہو کر حیرت زدہ کچھ دیر تو سناٹے کے عالم میں دروازہ ہی تاکتی رہ گئیں۔

شفالی غموں کی ماری آفس میں بھی بڑی محتاط سی رہتی ...... سب سے الگ تھلگ سی۔ اس کی پاکیزگی پر کبھی کسی نے شک و شبہ نہیں کیا۔ سب اس کے حال پر ترس ہی کھاتے تھے۔ ایک دن وہ آفس کے

قریب ہی تھی کہ ایک موٹر تیزی سے اس کے پاس سے گزری۔ دہشت سے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ بچ گئی تھی آج۔ نہ جانے کون تھا آنکھیں بند کر کے موٹر چلا رہا تھا۔ اس نے تیز قدموں سے سڑک پار کی اور آفس میں بیٹھ کر دم لیا۔ دو دن کے بعد پھر وہی واقعہ پیش آیا۔ کوئی جوان لڑکا تھا...... وہ پہچان نہ سکی۔ گھبرا کر شفالی نے آفس سے چھٹی لے لی۔

جب پورے چار دن کی غیر حاضری کے بعد وہ آفس گئی تو دیکھا موٹر کھڑی تھی اور موٹر والا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ شفالی نے ایک قہر بھری نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ شفالی کے بالکل برابر آگیا۔ اب تو لمحہ لمحہ بھاری تھا۔ صبر اور ضبط ساتھ چھوڑ گئے تھے۔...... وہ شفالی سے مخاطب ہوا۔ وہ ناگن کی طرح پھنکاری۔ ہمیں سرِ بازار رسوا کر کے، ٹاٹ اڑھا کر خاک میں بٹھا کر تمہارے دلوں کو چین نہیں ملا۔ میری زندگی زیر وزبر کر ہی دی ہے۔ بس ایک جان ہی تو باقی رہ گئی ہے۔ کم سے کم میرے بچے پر رحم کھا کر اس کی خاطر مجھے جینے دو۔ وہ اس کے سامنے آکر رک گیا۔...... جیسے شفالی ابھی بھی اس کی ملکیت ہو۔ وہ پاس سے کترا کر اپنے آفس میں دوڑ گئی۔ اشون کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کر گئی۔ بے ساختہ بول اٹھا...... واقعی عورت پنجرے ہی میں بھلی لگتی ہے۔ مرد کے اشاروں پر ناچتی ہوئی۔ آزاد عورت واقعی مصیبت ہوتی ہے۔

شفالی کے دماغ میں دن بھر آندھیاں چلتی رہیں۔ گھر پہنچتے ہی اماں کے بازوؤں میں جا سمائی۔ سارا قصہ ان کے گوش گزار کیا۔ ماں تو ڈر گئی۔ بے چینی کی حالت میں ہاتھ ہی مسلتی رہ گئی۔ بولیں مرد ہمیشہ عورت کی بے بسی اور مجبوری سے فائدہ ہی اٹھاتا آیا ہے۔ تو اس شاطر ذہن آدمی سے ہوشیار ہی رہنا۔ اب کوئی نئی آفت نہ کھڑی کر دے۔

شفالی گزرے حادثے سے سنبھلی بھی نہ تھی دوسرے دن وہ طوفان کی طرح پھر آدھمکا۔ اس نے شفالی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حالانکہ حالات نہایت ہی قابلِ اعتراض تھے۔ شفالی خاموش ہی رہی یہ سوچ کر کہ ہر حال میں مرد کا ہی فائدہ ہوتا ہے۔ اور اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ اشون اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا...... ''تم گھر لوٹ چلو...... تمہارے لئے واپسی کا دروازہ کھلا ہے...... سن کر شفالی کا دماغ بھنا گیا...... بڑی تیز نظروں سے اسے گھورا اور بولی واپس...... گھر...... کس کے گھر...... کون سے گھر...... اب کوئی نیا وار کرنے کا ارادہ ہے لیکن یہ یاد رکھو اب میرے پاس تمہارے ہر وار سہنے کا حوصلہ

ہے۔ سنتے ہی اشون کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور گرفت ڈھیلی ہوگئی۔

''سماج میں رہ کر آپ اپنی مرضی کے موافق عمل نہیں کرسکتیں۔ سوچ لیں ورنہ انجام اچھا نہ ہوگا۔'' ان الفاظ نے ارملا دیوی کے ذہنی نظام کو ہلا دیا تھا۔ دل ودماغ پر ایک خوفناک کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ شکست کا احساس دماغ میں ہتھوڑے مار رہا تھا۔ ذہنی بحران کی شدت سے بے چین تھیں۔ اضطرابی اور بڑھی جب اشون نے بھی شفالی کا ذکر کیا...... ماں کے دل پر زبردست چوٹ لگی تھی کہ بیٹا بھی دشمنوں سے جاملا تھا۔ وہ رات بڑی مضطرب تھی۔...... ان کے اعصاب جواب دے گئے...... صبح جب ماں کی آواز نہ سنائی دی تو اشون حسب معمول دروازہ دھڑ دھڑاتا ہوا ماں کے کمرے میں وارد ہوا۔ غضب کا بھیانک سناٹا تھا۔ ماں کو نیند کا ایسا بڑا غلبہ آیا تھا کہ بیٹے کی متواتر پکار نہ سن سکیں۔ نہ جانے رات کے کونسے پہر میں وہ چپکے سے اپنے بیٹے کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اشون بالکل تنہا بے یارومددگار رہ گیا تھا۔

شفالی نے اشون کو کئی دن نہیں دیکھا تو سوچا طوفان ٹل گیا۔ ایک دن وہ اچانک سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی گردن جھکی تھی...... دھیمے لہجے میں بولا۔ تم اس انسان سے ڈر رہی ہوں جو خود اپنے آپ سے اندر سے سہما اور ڈرا ہوا ہے۔ جب سے تم گھر چھوڑ کر گئی ہو۔ وہ پھر پھنکاری۔ یہ سچ ہے عورت ہی ہمیشہ مجرم گردانی جاتی ہے۔ تم نے میرے چہرے پر سیاہی مل کر گھر سے بے گھر کردیا۔ غیروں نے مجھے تھام لیا۔ میں نے مشکل سے تنکا تنکا کر کے اپنی زندگی سمیٹی ہے۔ اب میں ان سیاہ اندھیروں میں رہنے کی عادی ہوگئی ہوں۔ تمہارے جلائے ہوئے دیے کی روشنی کی اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔ اور آگے بڑھ گئی۔ شفالی کا دل دن بھر پریشان رہا ذہن ہزاروں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک عجب سی بیقراری تھی۔

گھر جاتے ہی سارا حال سب کے سامنے دہرایا۔ بابا بڑے سوچ کر اپنے پروقار انداز میں بولے ہم تو بوڑھے ہوگئے ہیں۔ بھائی کا گھر بے شک بہن کے لیے سہارا اور آسرا ہوتا ہے لیکن بیٹا اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ حالات سے مجبور ہوکر گلے شکوے بھول کر دشمن بھی گلے لگ جاتے ہیں۔ اگر کسی سے خطا ہوجائے اور وہ اپنے کو مجرم ٹھہرائے اور شرمندگی کا اظہار کرے تو وہ معافی کا حقدار ضرور ہوتا ہے۔ بھارت نے بھی کہا یہ وقت گلہ شکوہ اور شکایتوں کا نہیں۔ اسے معاف کردینے میں ہی مصلحت ہے۔ شفالی کی سانس حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔ حواس بے قابو ہوگئے۔ ماں کی طرف پر امید نظروں سے دیکھ کر آزردگی سے بولی۔ اماں وہ مجھے اور میرے بچے کو بھی ہلاک کردے گا۔

رات دن خدمت کرنے کا صلہ تو ندامت ملی۔اب اس کے در کس امید سے جاؤں۔جس مرد کے انداز لمحے لمحے پر بدلیں اس پر کیسے اعتبار کروں۔میرے دل میں اس کے لیے اب بالکل گنجائش نہیں۔

اماں آہستہ سے گویا ہوئیں۔دنیا جانتی ہے اس نے تم پر بے انتہا ظلم ڈھائے ہیں تمہاری ساری خوشیاں چھین کر تمہیں جہنم میں ڈھکیل دیا ہے۔لیکن صرف وہ ہی تم کو اس جہنم سے نکال سکتا ہے۔میری بچی عورت پیدا ہی ہوتی ہے قربان ہونے کے لیے۔کوئی ایک مرد کی محبت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے تو کوئی اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے مرتی ہے۔ ہر عورت کو کوئی نہ کوئی قربانی تو ضرور ہی دینی ہوتی ہے۔تو اس بچے کی ماں ہے جس کی زندگی کی ساری خوشیاں اشون کی مٹھی میں بند ہیں۔ ماں اپنی اولاد کی بہتری اور خوشیوں کے لیے کچھ بھی کر گزرتی ہے۔ماں اپنی کوکھ میں بچے کو اپنے خون سے سینچتی ہے۔جنم ماں دیتی ہے اور شناخت باپ کے نام سے ہوتی ہے۔تمہاری قربانی اس مصیبت کے مسلسل سیلاب کو روک دے گی۔ تمہارے دامن کا ہر داغ دھل جائے گا اور تمہارے بیٹے کا ہر آنے والا دن خوشیوں سے معمور ہو جائے گا۔آج اگر قدم پیچھے ہٹائے تو آنے والا ہر لمحہ تمہارے دامن میں کانٹے ہی برسائے گا۔یہ وقت جوش میں آکر ان آنے والی ساری خوشیوں کو کھو دینے کا نہیں ہے۔ہوش میں آکر سوچو ولدیت کے خانے میں کس کا نام دوگی۔

شفالی کچھ دیر بڑی گہری نظروں سے ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی اور سوچتی رہی ...... پکھیرو کے بھی اپنے گھونسلے ہوتے ہیں جہاں وہ بسیرا کرتے ہیں لیکن عورت کا اپنا کوئی گھر کیوں نہیں ہوتا...... کوئی ایسا گھر نہیں جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ باپ کا گھر، شوہر کا گھر، بھائی کا گھر...... نہ جانے کب سر سے سائبان چھن جائے...... عورت کا کہیں بسیرا نہیں...... اس کا دل تڑپ اٹھا...... گردش حالات کا اثر تھا کہ آج وہ اپنے اوپر قابو نہ کر سکی لیکن آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں غصہ اور غم اتر آیا۔ بولی جو شخص قابل اعتبار نہیں میں اسے قبول نہیں کر سکتی۔ اس بحران سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں ضرور جاؤں گی ......اس رات کا ایک ایک پل گزرنا بھاری تھا۔ بیتے واقعات ایک ساتھ ذہن پر چھا گئے۔سوچ اور فکروں نے جذبوں نے بھی دماغ کو چین نہ لینے دیا۔

اشون شفالی کے در سے نامراد ہو کر پلٹا تو لالہ جی کے دروازے پر دستک دی۔شفالی نے ہی دروازہ کھولا۔اشون کو دیکھ کر اندر کی آگ شعلہ بن کر آنکھوں میں بھڑکی۔وہ چیخی ...... دھوکہ مجھے دیا اور قصور وار بھی میں ہی ٹھہرائی گئی۔اب رات کی تاریکی میں اپنے جرم کا اقرار کرنے آئے ہو۔وہ خونخوار نظروں سے

اسے گھورتی رہی۔بس میرے ایک سوال کا جواب دو...... کیا تم میری لٹی ہوئی عزت لوٹا سکتے ہو...... اس کی چیخ سن کر لالہ جی باہر آئے۔وہ اپنی مہذب فطرت سے مجبور ہو کر بولے...... اندر آجاؤ...... کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔پھر اشون رک رک کر بولا۔آپ مجھ سے بے حد ناراض اور ناخوش ہیں۔اگر میں راہ راست پر آنے کا وعدہ کروں تو آپ میرا یقین ہرگز نہیں کریں گے۔لالہ جی بگڑ کر بولے میں تمہاری کسی بھی حرکت سے بے بہرہ نہیں ہوں۔صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے لیے لڑکیوں کا کال پڑا تو تمہیں پرانے رشتے کی یاد آئی۔اگر تم اور تمہاری ماں نے کسی پتھر پر بھی اتنا ظلم ڈھایا ہوتا تو وہ بھی تڑخ جاتا۔میری بیٹی منہ بند کر کے سب کچھ سہتی رہی۔وہ شرمندگی سے بولا آپ کی خفگی بجا ہے۔میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔اگر آپ کی خفگیاں اور ناراضگیاں دور ہو جائیں اور دلوں سے کدورت نکل جائے تو آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گا۔اس کی آواز مجرموں کی طرح دھیمی تھی۔اشون کے اس انداز سے لالہ جی کے دل کو تسلی ہوئی۔اعصاب کا تناؤ ڈھیلا پڑا۔چہرے سے غصہ اور کرب کی شکنیں مٹنے لگی تھیں۔بولے ہم نے جن پریشانیوں اور ذلت کا سامنا کیا ہے اسے بھلایا تو نہیں جا سکتا لیکن اگر تم واقعی نادم اور شرمندہ ہو تو تمہیں معاف تو کرنا ہی پڑے گا۔قانونی معاملے بڑے نازک اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ان سے باہر نکلنا بھی بڑا پریشان کن مسئلہ ہوتا ہے۔تمہاری ماں کو عدالت تک نہ پہنچ کر سماج کے بزرگوں اور رہنماؤں کا حکم ماننا زیادہ فرض تھا۔خیر جو ہوا سو ہوا۔اب یہ فیصلہ بھی وہی لوگ کریں گے۔

محلے کے سب ہی لوگوں نے اشون کے اس اقدام پر مسرت کا اظہار کیا۔بزرگوں نے اس کو ترغیب دی کہ آئندہ ظلم و تشدد سے باز رہے۔عزت اور وقار اور محبت سے زندگی گزر بسر کرے۔اشون نے بھی اپنے اس خوفناک جرم کا اعتراف کیا اور سب کے سامنے عہد باندھا کہ آگے کبھی ایسا نہ ہوگا۔

بچے کو گود میں لیے شفالی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی گھر میں داخل ہوئی اور ایک سرسری نظر چاروں طرف ڈالی۔نہ دل دھڑکا نہ آنکھوں میں بجھی جوت پھر سے چمکی۔اشون مسکرا کر بولا اب یہ گھر تمہارا ہے۔......شفالی جل کر بولی...... میرا گھر...... عورت کا کبھی کوئی گھر نہیں ہوتا۔ساری عمر گھر کی تلاش میں گزار دیتی ہے اور نصیب میں زندان ہی ملتا ہے۔اس زندان میں گزرا ہر لمحہ مجھے یاد ہے۔وہ پھر مسکرایا ......بولا......اب ماضی کو بھول جاؤ...... مجھ پر بھروسہ کر لو۔

یہ بھی قدرت کی محبت سے بے نیازی تھی کہ جب شفالی اشون کی چاہت میں دیوانی تھی اور اس

کی صرف ایک نگاہ کی مشتاق تھی۔تب اشون نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی تھی۔ کنیز سے بڑھ کر نہ سمجھا تھا۔ آج جب شفالی کا ویران دل ہر جذبے سے خالی تھا اور ٹوٹے ہوئے دل کے ہر ٹکڑے سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی تھیں تو اشون ہاتھوں میں چمکتے لال گلابوں کا ہار لیے اس سے پہلی جیسی محبت مانگ رہا تھا۔ وہ اس کے بالکل قریب آ گیا تو شفالی نے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ اس کا دماغ ماضی کی سمت دوڑا۔ اس کے سینے میں جو نہ ناآسودگی کی چنگاری سلگ رہی تھی، بھڑک اٹھی، ٹھہریئے اور سخت لہجے میں بولی...... میں گزشتہ کے دہشت ناک واقعات کو قطعی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ذرا جھجک کر بولا۔ جب تک تم میرے قریب تھی تمہاری موجود گی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ تمہاری غیر موجودگی میں اکیلے پن کا احساس ہوا اور پھر دل نے تم کو پکارا...... یقین کرو میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

شفالی کو اس کی ہر بات سے دھوکہ محسوس ہوا...... بولی عورت ہمیشہ ہی کمزور ہوتی ہے۔ ظالم مرد کی خوفناک زیادتیوں کے سامنے ہار جاتی ہے...... لیکن مرد کی جیت بھی عورت کے تعاون کے بغیر کبھی نہیں ہوسکتی۔ یہ لازمی نہیں کہ دو انسانوں میں شادی ہوتے ہی والہانہ محبت ہو جائے۔ ساتھ رہنے کے لیے ایک دوسرے کے لیے دلوں میں نرم گوشہ اور باہمی احترام کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ تم نے میرے سر کی چادر تار تار کر دی اور اب مجھ سے یہ توقع کرتے ہو کہ تم پر بھروسا کر لوں۔ فریب اور دھوکے پر رشتے برقرار نہیں رہتے۔ میں بے اعتباری کی زندگی نہیں جی سکتی۔ تم نے یہ کیسے قیاس کر لیا کہ میں تمہارے جیسے فریبی انسان پر بھروسا کر سکتی ہوں اور تمہیں معاف بھی کر سکتی ہوں۔ یاد کرو وہ دن امنگوں سے بھرا دھڑکتا دل اور محبت کی مشکبار کلیوں سے بھرا آنچل لے کر ایک معصوم لڑکی تمہارے دل کے در پر دستک دیتی رہی...... تم نے اپنے آہنی دل کے دروازے بند کر لیے۔ اگر ایک پٹ بھی کھول دیتے اور تمہارے دل سے ٹپکی شبنم کی دو بوندیں بھی اگر میرے دامن کی ان کلیوں کا نصیب بن جاتیں تو ساری کی ساری کلیاں کھل اٹھتیں...... میرے دل کے ارمان پورے ہو جاتے...... ان تازہ کلیوں کی تازہ مہک آج بھی ہمارے دلوں کو مہکاتی رہتی...... لیکن تم نے تو میرا دامن ہی جھٹک دیا...... کلیاں بکھر گئیں...... تم نے انہیں بے دردی سے پاؤں تلے روند ڈالا سب کچھ مٹی ہو گیا...... وہ معصوم لڑکی بھی اس مٹی میں مل گئی۔

تمہارے ظلم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ باپ اپنے بیٹے سے ہمیشہ محبت کرتا ہے تم نے تو اس رشتے کو بھی ماننے سے انکار دیا۔ شفالی نے بچہ اشون کی گود میں ڈال دیا۔ تم نے تو اسے بھی اپنے پیار سے محروم

کردیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ شناخت کے بغیر تمہارا بیٹا تاعمر دنیا کی نظروں میں ذلیل وخوار ہوتا رہے گا۔ ماں ہوں...... چاہتی ہوں دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹ کر اپنے بیٹے کے دامن میں ڈال دوں۔ بس وہی آرزو مجھے دوبارہ اس در پر کھینچ لائی ہے۔ بچے کے لیے ماں اور باپ دونوں کا ساتھ بہت ضروری ہے۔ میرے بیٹے کو اس کی ذات کا پتا مل گیا۔ اس کی شناخت مل گئی اور میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد پورا ہوگیا۔ میں اپنی نسبت سے تم پر اعتبار کیسے کرلوں۔ اپنے ان فیصلہ کن لمحہ کو یاد کرو جب تم نے مجھے بھری عدالت میں موت سے پہلے لحد میں اتار دیا تھا۔ شہر خموشاں میں بسنے والوں کے دلوں میں حرکت نہیں ہوتی۔ ان کے بے جان دل سارے احساسات اور جذبات سے خالی ہوتے ہیں۔ اس بستی کے لوگ دوبارہ زندگی کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ میں بالکل تہی دامن اور تہی دست ہوں۔ اب کیا دوں تمہیں...... میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اشون ایک ثانیہ سناٹے میں رہ گیا۔ مڑ کر شفالی کو دیکھا...... اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا وہ پلٹی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اشون نے حیرت اور پریشانی سے گود میں سوئے معصوم بچے پر نظر ڈالی۔ بچے کا چہرہ ہو بہو اس کے چہرے سے ملتا تھا۔ اپنی جھلک اس کے چہرے پر دیکھ باپ نے بیٹے کو سینے میں دبوچ لیا۔ ایک عجب سا سکوت طاری ہوگیا۔ رات اپنے نصیب میں ماتم کرتی ساعت بہ ساعت ڈھلتی چلی گئی اور یوں اداس سونی راتیں آتی رہیں اور ڈھلتی رہیں۔ اشون کے سنہرے خواب ادھورے ہی رہ گئے۔

☆☆☆

کُندن

کچھ ایسے نادان بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اپنی حالت اور حیثیت کے بل بوتے پر وہ دنیا کی ہر شے بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ پیار بھی، بھول جاتے ہیں کہ پیار اور خوشیاں وہ انمول شے ہیں جن کا سودا تو شاہوں کے شاہ بھی نہ کر سکے۔ جنگیں لڑیں پر دل نہ جیت پائے اور حاکم وقت بھی رہ گئے ہاتھ ملتے۔ جس کا نصیب پیار کی روشنی سے دمک اٹھا اس کا دامن خود بخود خوشیوں سے بھر گیا کہ ساری ہی مرادیں پوری ہو گئیں۔

خونی رشتوں کا پیار پانا تو فطری بات ہے لیکن ایک وہ انجانا شخص جسے دیکھتے ہی اپنا بنانے کو دل چاہے جس پر ہم جان نثار کر بیٹھتے ہیں۔ اگر اس تک رسائی نہ ہو تو دل کی دنیا تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے کھرچ ڈالوان ہتھیلیوں کو جن پر اس کے نام کی لکیریں ہیں ہی نہیں اور اپنے ہی لہو سے دھوڈالو اپنے دل کے داغ...... پر کون کر پایا ہے یہ...... کون اپنی تقدیر میں لکھے درد کو مٹا پایا ہے۔

پھر دن بیتے اور شامیں ڈھلیں اور بہ مشکل تمام راتیں آئیں تو وہ بھی ایک بحراں بن کر...... کھڑکی کے باہر چاند پر نظر جو گئی دل کی دل سے بات ہوئی...... دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے...... بھلا ہاتھ بڑھا کر بھی چاند کسی نے پایا ہے...... پھر دل نے دل سے سوال کیا...... آخر اس درد کی دوا کیا ہے...... وہ تڑپ کر بولا...... مٹا دے اپنی آرزوؤں کو...... پھر بھلانے کی کوشش جاری رہی...... روز خود سے ہی بھلانے کا وعدہ کیا اور روز خود سے کیا وعدہ بھول گئے۔

اور یوں روز و شب گزرتے گئے۔ دل میں دبی چنگاری آہستہ آہستہ سلگتی رہی اور زندگی راکھ ہوتی چلی گئی...... ناں دھواں اٹھا ناں شعلہ اور ایک جنونی آہستہ آہستہ موت کے گھاٹ اتر گیا۔

سنا کہ نہیں...... رادھا نے اسے بہت سمجھایا۔ پر وہ تو جنوں کی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ زندگی داؤ پر لگا بیٹھی تھی کہ گر میرا پیارا نہ ملا تو بس خودکشی...... تھی بھی بڑی منہ پھٹ ضدی اور خودغرض...... کیوں نہ ہوتی...... امیر کبیر باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جو تھی۔ یہی تو اس کا ہتھیار تھا جس کے سہارے جو چاہتی حاصل کر لیتی تھی۔

نام تھا پشپ لتا۔اسے بھی اپنے حسن پر ناز تھا۔تھی بھی پھولوں سے بھری نازک شاخ کی طرح لچکدار۔گھر میں ہر وقت طوفان مچائے رکھتی۔کس میں اتنی مجال جو اس کا کہا ٹال دے۔اس کی ہاں پر ناں کر دے۔یوں تو اس کی بدمزاجی کی داستانیں زبان زد عام تھیں لیکن باہر والے بھی اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔سب ہی اس سے خائف تھے۔

عجب لڑکی تھی۔ہر عام و خاص دعوت میں بن بلائی مہمان ہوتی۔اور آج تو معاملہ دل کا تھا۔ اسے جلد از جلد ہوسٹل پہنچنا تھا۔اچانک تیز بارش شروع ہوگئی۔ایسا ہی تو موسم تھا جب رام رتن نے جاں نثاری کا دعویٰ کیا تھا۔خودکشی کی دھمکی دی تھی۔سب جھوٹ۔بھلا کون مفت میں اپنی جان دیتا ہے......شادی کر کے عیش کر رہا ہے۔

انوپ کمار نے بھی تو اس کی محبت کی بھیک مانگی تھی۔اس کے حسن نے کئی لڑکوں کو مرعوب کیا تھا۔پھر چہرہ شیشے میں دیکھا۔خوبصورت عورت جو چاہے پا سکتی ہے اور مجھ جیسی تو حالات کے سارے رخ بدل سکتی ہے۔اسے تو میرا ممنون ہونا چاہیئے کہ میں نے سب کو ٹھکرا کر صرف اسے چاہا ہے......اسے اپنے دل میں بسایا ہے۔اگر وہ بھی اقرار محبت کرنے کی جرات نہ کر سکا تو کیا۔آج میں ہی پہل کر ڈالوں گی۔ ہوسٹل آ گیا تھا......اور اس نے اپنی منزل کی طرف قدم بڑھائے۔

پرتھوی نے اپنے چیدہ چیدہ دوستوں کو مدعو کیا تھا کہ نہ جانے پھر کب ملنا ہو......یا پھر ہو بھی یا نہیں۔تیز بوچھار میں بھیگتی دل ہی دل میں مسکائی۔کمرے میں بلا کا شور تھا......وہ پیچھے کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔شازیہ نے کچھ کہا تو پرتھوی اس کی جانب جھکے اور دونوں مسکرائے بھی۔تب ہی پیچھے کھڑی پشپ لتا نے طنز آمیز لہجے میں کہا......پرتھوی جی آپ نے سب کے دلوں کا حال تو معلوم کر لیا۔کچھ اپنے دل کا بھی تو حال سنائیے......شازیہ اور آپ......بھری محفل میں ایسا عجیب و غریب سوال پوچھا گیا تو یکلخت بڑا سناٹا چھا گیا۔شازیہ نے کڑی نظروں سے پشپ لتا کی طرف دیکھا......تم......یہاں......کیسے......وہ بولی۔

تب ہی پرتھوی نے کیسی تلخی سے پوچھا......آپ کب تشریف لائیں۔قہقہوں کی گونج میں آپ کے قدموں کی چاپ نہ سن سکا۔ورنہ میں آپ کا زبردست استقبال کرتا۔سب کی نظر پشپ لتا پر جا کر ٹھہر گئی......خیر آپ آ ہی گئی ہیں تو تشریف رکھیے۔آنے کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور اور ممنون ہوں اور اس احمق لڑکی نے

سوچا کہ اس کی دل کی دنیا بس گئی۔وہ پھر بولے ...... مس پشپ لتا آپ اپنے سوال کا جواب بھی سن کر جائیے۔ ...... ایسا ہے ہم نفرتوں کے خلاف ہیں۔ہم دنیا میں بہت سے لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ ...... آپ بھی ہمیں اچھی لگتی ہیں ...... لیکن جنہیں ہم پسند کرتے ہیں اور جو لوگ ہمیں اچھے لگتے ہیں وہ سب ہمارے دوست تو ہو سکتے ہیں۔ان سب کے ساتھ شادی تو ہم کر نہیں سکتے ...... کہ یہ حق تو ہمارے بزرگوں کا ہے۔

آپ نے ہمارے دل کا حال پوچھ کر ہمیں مجبور کر دیا کہ بھری محفل میں اپنا افسانہ دل کہہ ڈالیں ...... ہم کیا بتائیں آپ کو ...... دل والوں سے دل کا حال پوچھنا چاہیے۔ہمارا دل تو اٹھارہ سالوں سے کسی اور تحویل میں ہے۔کسی کے سینے کی تجوری میں گروی رکھا ہے۔ سنتے ہی پشپ لتا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔کوشش تو بہت کی اپنے آپ کو سنبھالنے کی پر یوں لگا کہ دل دھڑکنا بند کر دے گا۔پھر سندر چہرے کے رنگ بدلے ...... آنکھیں دھندھلا سی گئیں۔آنسو باہر آتے آتے رو کے۔اگر دل کا شہریار ماننے کو راضی ہی نہ ہو تو انسان اپنے بس میں کب رہتا ہے اور یہ ضدی لڑکی تو تھی ہی دیوانی۔

جب حسن اور اداؤں کا جادو نہ چل سکا تو سوچا ڈیڈی کی بے انتہا دولت اور پوزیشن کب کام آئے گی۔ان کی وسیع جائیداد چھوڑنا آسان کام تو نہیں۔پھر میں اک پولس کمشنر کی لاڈلی، اکلوتی بیٹی بھی تو ہوں۔پیار سے نہیں تو آرے ہی سہی ...... حاصل تو میں تمہیں کر کے ہی رہوں گی۔

پشپ لتا جی ...... وہ اس کی آواز پر چونکی ...... محبت کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔کئی روپ ہوتے ہیں۔ہر رنگ نرالا۔ہر روپ انوکھا ...... پھر پرتھوی سب سے مخاطب ہوئے ...... آئندہ کوئی بھی کسی لڑکے اور لڑکی کو ایک ساتھ دیکھ کر ان کے رشتے کو کوئی نام ہرگز نہ دینا ...... کبھی کبھی انسان جو سوچتا ہے وہ صحیح نہیں ہوتا اور یونہی افسانے بن جاتے ہیں۔

رادھا فوراً پشپ لتا کے پاس آئی اور کان میں سرگوشی کی۔''یہاں بھی بن بلائی مہمان'' ...... وہ بولی کیسے نہ آتی یہاں ...... میں نے تو اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔میں پیچھے ہٹنے والی نہیں۔میں نے آج تک کسی کو اپنے قیمتی مشورے سے نوازا۔پشپ لتا کے ایک سوال نے رنگ میں بھنگ تو ڈال ہی دیا تھا۔امر ناتھ نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش میں پرتھوی سے سوال کیا ...... اب یہ بتاؤ کہ تم شادی کب کر رہے ہو ...... بھئی ہم کہہ دیتے ہیں تم بلاؤ یا نہ بھی بلاؤ تمہاری شادی میں شریک ہونے تو ہم ضرور پہنچ جائیں گے۔چاہے سب ہمیں بن بلایا مہمان ہی پکاریں ...... سب نے زوردار تالیاں بجائیں۔

پرتھوی بولے، پنڈت جی جس دن کا مہورت نکالیں گے اسی دن شادی بھی ہو گی...... ہم تو اپنی ماں کے اکیلے ہیں...... سارے دوست ہی تو میرا پریوار ہو...... تم نہیں آؤ گے تو بھلا ہماری شادی کے گانے کون گائے گا۔ ویسے بھی سوچتے ہیں اماں کی سیوا کرنے کے لیے بہولانا اب ضروری ہو گیا ہے۔ ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں...... اٹھارہ برس...... پورے...... یار کمال ہے شہر میں تو سگائی اٹھارہ مہینے نہیں ٹکتی...... یہ بتاؤ ان اٹھارہ سالوں میں ان کے دیدار کتنی بار ہوئے۔ پرتھوی ہنس پڑے۔ بولے...... گاؤں میں یہ شہر والی باتیں کہاں...... وہاں ملنے ملانے کا دستور نہیں اور پھر ہماری ''وہ'' ذرا زیادہ ہی اپنی روایتوں کی پابند ہیں۔

کسم نے دھیرے سے سوال کیا...... اگر وہ آپ کو پسند نہ آئیں تو...... تو سے آپ کا کیا مطلب ...... گاؤں میں چھیڑا چھاڑی کا رواج نہیں...... بڑے فخریہ لہجے میں بولے کسم جی۔ پسند تو وہ ہماری اماں کی ہیں۔ اگر آپ ہماری اماں کو دیکھیں گی تو بس دیکھتی ہی رہ جائیں گی۔ ان کی پسند تو سراپا تجلی ہی تجلی ہو گی۔ ہماری اماں کی پسند ہماری سر آنکھوں پر۔

کسم جی ابھی شادی ہوئی نہیں اور آپ نے ایسا سوال کر ڈالا۔ جن کی تقدیر ہماری ہتھیلی پر لکھ دی گئی ہے بھلا ہم انہیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں...... شہر میں ذرا ذرا سی بات پر طلاق کی دھمکی دی جاتی ہے۔ بجائے اپنے مسائل سلجھانے کے...... طلاق کہہ کر...... اپنے مسائل اور زیادہ الجھا لیتے ہیں۔ اگر سوچ لیں کہ اس بندھن سے اب کسی طور رہائی نہیں مل سکتی تو مجھے یقین ہے دو انسان آپس میں خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں۔ کبھی آپ نے ان معصوم بچوں کے لیے سوچا جن کی مائیں گھر سے نکال دی جاتی ہیں۔ ایک بچہ ماں کی ممتا کے بغیر کیسے پروان چڑھ سکتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ طلاق کے بعد شوہر کو جنت مل جاتی ہے۔ وہ بھی دنیا کی نظروں میں خوار ہوتا پھرتا ہے...... ''طلاق''...... تباہی اور بربادی کا دوسرا نام ہے۔

کسم جی مرد عورت کو گھر سے نکال دیتا ہے تو وہ بیچاری پھر اپنے مائیکے چلی جاتی ہے۔ یقین مانیے ہمیں تو ایک ہی ڈر ستا رہا ہے اگر انہوں نے ہمیں ناپسند کیا اور ہمیں ہمارے گھر سے نکال دیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارا اور کوئی دوسرا ٹھکانا بھی نہیں...... سب نے قہقہے مارے اور ماحول دوبارہ خوشگوار ہو گیا۔ اور پشپ لتا کے اندر آگ برستی رہی۔

رام لال کب چپ رہنے والے تھے فوراً بولے۔ یار تم تعلیم یافتہ ہو۔ فراٹے کی انگریزی بولتے ہو اور تمہاری ہونے والی بیوی گاؤں کی...... کیسے گزارا ہو گا تم دونوں کا...... پرتھوی نے بڑے تکبر اور

اطمینان سے کہا۔ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی ۔ ہمارا گزارا بڑے مزے سے ہوگا کیونکہ انگریزی صرف ہمارے آفس تک محدود ہے۔ہم غیر بھاشا اپنے گھروں میں نہیں بولتے ۔اگر ہمارے بچے اپنی مادری زبان پرعبور نہیں کرپائیں گےتواپنی تہذیب وتمدن کے میدان میں پیچھے رہ جائیں گے۔کبھی سوچا اگر ہم مغربی کلچراڈوپٹ کرلیں گےتو ہماری آنے والی نسلوں کا کیا حشر ہوگا۔ہم کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں اور خود اپنا ہی نقصان کررہے ہیں۔

سادہ پانی پینا نہیں مانگتے ۔دکانوں میں کوکا کولا اور سوفٹ ڈرنکس کی بوتلیں بھری پڑی ہیں۔ برگر، پیزا اور فرنچ فرائز نے سارے ہندوستانی کھانوں کی جگہ لے لی ہے۔ ہمارا کھانا، پینا اور لباس ......طور طریقے سب بدل گئے ہیں ۔لڑکے کانوں میں بندے پہنے گھوم رہے ہیں۔ پونی ٹیل اور چوٹیاں بنارہے ہیں۔ بال رنگ رہے ہیں۔ مجھے تو بھوت جیسے لگتے ہیں ۔لڑکے اورلڑکیوں کے لباس میں بھی کچھ فرق نہیں رہا...... منی اسکرٹ کا زمانہ آگیا۔ساری ہےتو بلاؤ زندارت۔ہم لوگ تو صرف نام کے ہندوستانی رہ گئے ہیں...... ہماری تہذیب اور ثقافت بکھر کررہ گئی ہے۔ذرا سوچو آج یہ حال ہے آگے کیا بنے گا ہمارے دیس کا اور ہماری آنے والی نسلوں کا۔ روز سنتے ہیں ہندوستان آگے بڑھ رہا ہے۔مگر عوام اور گاؤں کی حالت دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم انتہائی تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں ۔ارے ہم پشپ لتا جی کے سوال کا جواب دینا تو بھول ہی گئے۔ پرتھوی کی آواز سن کر سب نے ادھر دیکھا۔

انہوں نے الماری سے ایک بے حد خوبصورت ڈبہ نکالا۔ سب کو راکھی دکھاتے ہوئے بولے یہی تو ہے ایک بہن کا اپنے بھائی کے لیے سب سے قیمتی تحفہ...... پشپا جی آپ بھی کسی کی بہن ہیں اور اس رشتے کی پاکیزگی پر یقیناً آپ کو بھی پورا پورا اعتبار ہوگا۔سومیرے اور شازیہ کے بارے میں کسی بھی قسم کی غلط بات سوچنا بھی گھور پاپ ہوگا۔

ہوا یوں تھا جب ہم پندرہ سال کے تھے شازیہ بارہ کی ......تب رات میں کچھ احمقوں نے ہمارے گاؤں پر حملہ کردیا کتنے ہی گھر دشمنی کی آگ کی لپیٹ میں آگئے ......اپنے خاندان والوں کی جان داؤ پر لگا کر ہم نے شازیہ اور اس کے والدین کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ جب تک پولس کی گاڑی آئی بہت مالی اور جانی نقصان ہو چکا تھا۔اس رات شازیہ کے بھائی شہر سے نہیں لوٹے......ہم نے پولس سے مدد مانگی وہ صاف بولے۔اس اندھیری رات میں وہ گمشدہ لوگوں کو ڈھونڈھنے کہاں جائیں گے ...... صبح تک سب

روتے دھوتے رہے۔ صبح ہوتے ہی گاؤں کے جوان لڑکے فراز کو ڈھونڈھنے نکلے پر ان کا نشان نہ ملا ۔ کیونکہ ہمارے اور شازیہ کے خاندانوں میں پرانے مراسم تھے ہم روز ہی ان کے گھر جاتے ۔ دلاسہ دیتے غم کم کرنے کی کوشش بے سود ہی رہی ۔ آس ونراش کے وہ دن بڑے ظالم تھے ۔ جب کئی دن بیت گئے اور فراز نہیں لوٹے تو ہم سب گاؤں والوں نے سوچ لیا کہ موت کے لمبے ہاتھوں نے فراز کو بھی دبوچ لیا ہوگا ۔ پر شازیہ اور اس کے والدین کی امید بندھی تھی ۔ انہیں فراز کے لوٹنے کا انتظار تھا...... جو آج تک ہے ۔

ایک دن جب شازیہ کی امّی جواب ہماری خالہ ہیں ۔ دکھ سے بلک بلک کر رو رہی تھیں ۔ اس مصیبت کی گھڑی میں ہم نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی...... کہ فراز بھائی کو بھلایا تو نہیں جا سکتا ۔ پر آپ ہمیں اپنا بیٹا تو مان ہی سکتی ہیں ۔ ہم نے شازیہ کی طرف دیکھا اور کہا...... ہمارے پاس بہن نہیں ہے ۔ اگر آپ ہاں کر دیں تو ہمیں بھی ایک چھوٹی بہن کا پیار مل جائے گا...... کچھ دیر کے بعد خالہ بولیں...... تم ہمارے بیٹے ہی تو ہو...... بیٹے ہی تو ماں باپ کی حفاظت کرتے ہیں...... تم نے ہمیں پناہ نہ دی ہوتی تو نہ جانے کیا حشر ہوتا ہمارا...... بس اس دن سے ہماری تو دنیا ہی بدل گئی ۔ چھوٹی بہن ملی تو یوں لگا ہمیں بھگوان نے سب سے بڑی نعمت دے دی ہو ۔ اب آپ ہی بتاؤ پشپا جی ایک بھائی کو اس کی بہن سے زیادہ اور کون پیار کر سکتا ہے اور بھائی کے لیے اپنی بہن سے زیادہ کوئی لڑکی عزیز نہیں ہوتی ۔

ہمارے خاندانوں کے درمیان رشتے اور بھی مضبوط ہوتے گئے ۔ شازیہ کا نکاح ہمارے جگری دوست منصور علی کے ساتھ ہوا...... پھر ایک نیا رشتہ استوار ہوا...... ہم شازیہ کی ننھی سی بیٹی کے ماموں جان بن گئے ۔ محبت کی ڈور میں بندھے ان منہ بولے رشتوں کو بھی اسی پیار و محبت کے ساتھ نبھایا جاتا ہے جیسے اپنے خونی رشتوں کو...... پشپ لتا جی اسی کا نام زندگی ہے ۔

بات ختم ہوتے ہی انہوں نے نظریں دوسری جانب کھڑی کسم کی طرف اٹھا کر کہا...... کسم جی کیونکہ ہم آپ کے بہی خواہ ہیں سو اتنا کہنے کا حق ہے ہی کہ آپ سدا خوش رہیں ۔...... اور اکیلا انسان کیا خوشیاں سمیٹے گا...... کب تک ان کتابوں کا بوجھ ڈھوتی رہیں گی...... کوئی بہت اپنا اگر گاڑی میں برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہو تو سفر سہانا ہو جاتا ہے ۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ازدواجی زندگی میں خوشیاں دھن...... دولت اور ڈگریوں سے نہیں خریدی جاتیں یہ تو آپسی محبت احترام اور بھروسے سے ملتی ہیں ۔

رام لال بھئی تم بھی سوچ سمجھ کر شادی کرنا...... کہیں انگریزی بولنے والی کے چکر میں پھنس کر

ساری زندگی اپنی بولی اور اپنی پسند کا کھانا کھانے کو بھی ترس جاؤ۔ بچہ پیدا ہوتے ہی گٹ پٹ گٹ پٹ انگریزی بولنے لگے اور ان کی دادی اماں اپنے پوتے پوتیوں کی بات ہی نہ سمجھ پائیں ...... ہوگی ناں جگ ہنسائی پھر ...... اس بار تو ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

پشپ لتا کے دل و دماغ میں عجب کشمکش جاری تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا ...... شاید اندر ٹوٹ پھوٹ مچ گئی۔ ضبط کی کوشش ہی ترک کر دی۔ رادھا کے کاندھے پر سر رکھ کر سسک پڑی ...... اس نے سرزنش کی ...... خدا کے واسطے سنبھالو اپنے آپ کو۔ کیا جتنا ہو چکا وہ کافی نہیں ہے ...... اس کی پریم کہانی سننے کے بعد یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا تمہیں کہ وہ جیسا بے حس اور بے نیاز نظر آتا ہے دراصل ویسا نہیں ہے۔ وہ اپنی سیتا کو تمہاری خاطر ہرگز تیاگنے کو تیار نہیں ہوگا۔ ایسے کھرے اور شفاف دل کے بندے کو کوئی لڑکی کسی طرح زیر نہیں کر سکتی۔ اٹھو اور چلو ...... یہاں سے ...... ایک دم کھڑی ہو جاؤ۔

پشپ لتا کی زندگی میں یہ پہلا زبردست جھٹکا لگا تھا۔ دل ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ درد کی شدت سے وہ کراہ اٹھی تھی۔ اس کے کراہنے کی آواز سن کر رادھا نے کہا ...... دیکھ لیا اپنی شعلہ زبانی کا نتیجہ ...... لڑکی کو ایسا بے باکانہ انداز شوبھا نہیں دیتا ...... سب نے پرتھوی کی باتوں کو پورے دھیان اور توجہ سے سنا اور سراہا بھی ...... میں نے تم سے کہا تھا کہ پرتھوی کو حاصل کرنے کے سپنے دیکھنے چھوڑ دو ...... پشپ لتا سسک کر بولی اور میں نے تم سے کہا تھا اگر پرتھوی مجھے نہ ملا تو میں جینا چھوڑ دوں گی ...... پشپ لتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنا بہتا دیکھ کر رادھا بولی ...... کیا کہا تم نے ...... جینا چھوڑ دو گی ...... ایک ایسے شخص کی خاطر جس کو تمہاری محبت کا پتہ ہی نہیں ...... پرتھوی نے تم سے کبھی محبت کی ہی نہیں ...... اس کی باتوں سے تو صاف ظاہر تھا کہ ناں وہ تمہیں جانتا ہے اور ناں ہی جاننا چاہتا ہے۔ اس ایک طرفہ جنگ میں اپنی جان کیوں قربان کرنا چاہتی ہو ...... یہ جان بھگوان نے تمہیں یوں ضائع کرنے کے لیے نہیں دی۔ اس پر صرف تمہارا حق نہیں ہے۔ تم اپنے خاندان کے ہر فرد سے جڑی ہو ...... تمہارے ماں باپ کے بھی تو کچھ حقوق ہیں تم پر۔ اپنی چاہت کو پرکھو ...... ذرا دیر کو سوچو جو تم کر رہی ہو وہ درست بھی ہے یا نہیں ...... بیس سال تمہارے والدین نے تمہیں بے حد محبت دی ...... تمہیں پالا پوسا، پرورش کی اور چار دن کی محبت کے لیے تم اپنی جان دینا چاہتی ہو۔ ارے جان ہے تو جہان ہے ...... جان رہے گی تو محبت کرنے والا بھی مل جائے گا۔

پشپ لتا تھرتھراتی آواز میں بولی۔ میرے ارمانوں کا خون ہو گیا۔ دل کی تمنائیں اجڑ گئیں اور تم

محبت کرنے والوں کا ذکر کررہی ہو۔رادھا بولی .....خزاں کا موسم ٹھہرتا نہیں .....رولو.....دل بھرکر رولو.....تم جیسی احمق لڑکی رونے کے سوائے اور کربھی کیا سکتی ہے۔میں کہتی ہوں بھول جاؤ پرتھوی کو .....تمہارے سامنے تو دنیا بھر کی خوشیوں کے انبار پڑے ہیں۔ بہاروں کو آنے دو۔خوشیوں کو سراہنا سیکھو۔ ناحق کو گلے لگا رہی ہو۔

مجھے دیکھو.....جس وقت آکاش کی ارتھی اٹھ رہی تھی میں دونوں ہاتھوں سے اپنا جگر تھامے سب دیکھ رہی تھی۔ جب اپنے کمرے میں پہنچی تو ویران اور سنسان کمرے میں دل بری طرح گھبرایا۔اس پل میں نے بھی سوچا خودکشی کرکے سارے دکھوں سے نجات پالوں۔اسی وقت سمیر رو پڑا اور میرے سسر جی کو کھانسی کا دورا پڑا۔.....میں سمیر کو گود میں اٹھا کر سسر جی کے کمرے کی طرف دوڑی۔خودکشی نہ کرسکی۔ذمے داریوں کا بوجھ جو تھا سر پر.....رشتے دار چلے گئے .....گھنی دھوپ میں خود اپنا سایہ تنہا کرجاتا ہے۔ پردوسروں سے کیا امید کرتی .....میرے پیچھے میرے ماں باپ اور میرے سسر کی دیکھ بھال کون کرتا۔سمیر کی پرورش کون کرتا.....اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور ساس سسر کی اکلوتی بہو ہوں.....اتنے ڈھیر سارے غم اور دکھ سمیٹ کر جینا مرنے سے بہت مشکل ہے۔ پر میں جینے کی کوشش کررہی ہوں خوش رہنے کی۔ کیونکہ میری اداسی میرے ماں باپ اور ساس سسر کو اور دکھی اور غمزدہ کردے گی.....جینا تو ہنس کر جیو۔

یہ ضروری تو نہیں جسے تم چاہو وہ بھی تم پر نثار ہو جائے۔ ہر کام انسان کی خواہشات کے بموجب تو ہو نہیں سکتا۔ میں جانتی ہوں تم پرتھوی کی زبردست پرسنلیٹی پر فدا ہوگئی ہو.....صرف تم اکیلی نہیں اور بھی کئی احمق لڑکیاں ہیں تمہاری طرح.....اب آگے محتاط رہنا.....محبت اس سے کرنا جو تمہاری محبت کے قابل ہو۔ دل صرف اس کو دینا جو تمہارے دل کی قدر کرے۔ناں ہی میں تمہیں مرنے دوں گی اور ناں ہی تم کو دنیا میں اکیلی رہنے دوں گی۔شادی تو تمہیں کرنی ہی ہوگی کیونکہ اس دنیا میں ایک لڑکی کا اکیلا رہنا نہایت دشوار ہے۔میرا خیال ہے شادی بھی ایک قدرتی امر ہے۔

ابھی ایسا کرو تم ہماری کمیٹی جوئن کرلو.....آج کل کی جوان نسل اپنے بزرگوں کے ساتھ نیک برتاؤ نہیں کرتی۔ بڑی بے قدری کرتے ہیں اپنے بوڑھے ماں باپ کی .....ہم ایسے ہی گھروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جہاں بوڑھے اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔گھر میں انٹری بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ بوڑھے بزرگ والدین اپنے بچوں کے خلاف کبھی شکایت نہیں کرتے۔ان کا حلیہ ان کے چہرے بتاتے

ہیں کہ ان کی اپنی اولاد ان کے اوپر جوروظلم کرتے ہیں۔ ہم ان بزرگوں کی مدد کرتے ہیں۔ ذرا سوچو ان پر کیا گزرتی ہوگی جن کے اپنے بچے منہ پھیر لیں...... ان لاچاروں کا تو کوئی ہمدرد اور غمگسار بھی نہیں۔

دوسروں کے کام آنے سے انسان کو دائمی روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ میں جب ان بزرگوں کی دعائیں سمیٹ کر تھکی ہاری گھر پہنچتی ہوں تو اپنے اندر ایک عجیب سا سکون محسوس کرتی ہوں۔ پشپ لتا بولی...... تم خود اتنی دکھی ہو۔ پریشان ہو اور دوسروں کو خوشیاں بانٹ رہی ہو۔ یقین کرو دوسروں کے غم دیکھ کر اپنا غم ہلکا ہو جاتا ہے رادھا نے کہا۔ پشپ لتا کا دھیان رادھا کی باتوں میں الجھ گیا تھا۔ بولی میں کسی غریب کو نہیں جانتی۔ کہاں رہتے ہیں یہ غریب اور مسکین لوگ...... رادھا نے ہنس کر کہا...... ارے تم غریب دیس میں پیدا ہوئی اور کسی غریب سے کبھی نہیں ملیں...... جب ان سے ملوگی...... ان کی مدد کروگی تو اپنے دکھ بھول جاؤ گی۔

سب کا ایک ہی کہنا ہے ہمارے وسائل کم ہیں مسائل زیادہ ہیں۔ مہنگائی کا رونا تو ہر ایک کو ہے۔ کچھ تو واقعی ہی غریب ہیں مگر زیادہ تر لاپرواہیں۔ سخت دل ہیں ستاتے ہیں اپنے بیمار اور کمزور بزرگوں کو روز خبروں میں سنتے ہیں دیس ترقی کر رہا ہے۔ کوئی غریبوں کا ذکر نہیں کرتا...... ان کی حالت تو بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ انہیں بھی تو کوئی سنبھالے...... ان گنت مسائل ہیں ان کے۔ جیسے بے روزگاری، بیماریاں...... سروں پر چھت نہیں، بچوں کی تعلیم کے لیے اسکول نہیں۔ بچے بھوکے ننگے سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ غریبی اور مفلسی سے گھبرا کر کتنے ہی لوگ خودکشی کر رہے ہیں۔ رادھا شعلوں پر پانی چھڑک رہی تھی۔ دوسروں کو مشکل سے نکالنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ میں نے تو اس سے محبت کی تھی۔ پشپ لتا کی آواز میں درد تھا۔ تڑپ تھی...... ارے بھولنے کی کوشش کرو اسے۔

کاش محبت نہ کی ہوتی تم نے رادھا بولی...... وقت بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ ہر احساس کو مٹا دیتا ہے مگر آہستہ آہستہ۔ پھر دو ماہ کے بعد دو ماؤں نے اپنے اپنے دلوں کے سارے ارمان پورے کیے۔ بڑی شان وشوکت سے دھوم دھڑاکے سے پرتھوی کا بیاہ رچایا گیا...... گاؤں کا ہر فرد امیر یا غریب شامل تھا۔ پرتھوی کے دوستوں نے گھیر رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں اپنے کمرے میں جانے کی اجازت ملی تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ آگے بڑھے اور رک گئے۔ ارے آپ...... آپ نے ہمارے قریب آنے میں پورے اٹھارہ سال لگا دیے۔ اتنے دھیرے دھیرے بڑی ہوئیں۔ ذرا سا ہمارا خیال نہ کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ

گندھاری کے پاس تھے۔

جانتی ہیں الہڑ عمر میں کوئی کام منصوبے کے تحت تو ہوتا نہیں تھا۔ بس جو دل میں آتا کر ڈالتے تھے۔ آپ کے گاؤں جاتے تھے کہ شاید آپ کی ایک جھلک ہی نصیب ہو جائے۔ آپ کی رسوائی سے ڈرتا تھا جب آپ کی گلی سے گزرتا تھا۔ آج جب پردہ...... گھونگھٹ اٹھایا...... سامنے ہی چاند جگمگا رہا تھا۔ پرتھوی مبہوت بیٹھے رہے...... آج چاند سارے ستاروں سمیت ہمارے گھر اتر آیا ہے۔ ایسا کومل چاند کہ چھوتے ڈر لگے ہے۔ ذرا آنکھ کھول کر دیکھئے سارا کمرہ جگمگا رہا ہے...... پھر گندھاری کا حنائی ہاتھ تھام کر بولے ۔ مدتوں بعد آپ ہمیں مل گئی ہیں اب ہم آپ کو کہیں نہیں جانے دیں گے...... وعدہ کیجئے آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی...... گندھاری آہستہ سے بولیں۔ آپ ہمارا ہاتھ چھوڑیں گے تب ہی تو جائیں گے ...... پھر کچھ وقفہ کے بعد بولی...... نہیں جائیں گے تو ہم اپنی اماں سے کیسے ملیں گے۔

پرتھوی نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا...... ذرا آنکھیں کھولیے...... آنکھوں کا لمس پرتھوی کے ہوش اڑا لے گیا۔ بولے اماں کے پاس سے آئے ابھی ایک دن نہیں ہوا...... اتنی جلدی ان کی یاد بھی آ گئی...... ہم آپ کو اتنا چاہیں گے کہ آپ سب کو بھلا دیں گی۔

محبت کی گھنی چھاؤں تلے دو سال کیسے گزر گئے گندھاری کو پتا ہی نہیں چلا۔ اماں کی اندرونی بے چینی سے وہ قطعی واقف نہ تھی۔ شادی کے بعد پہلا سال تو آس میں کٹ گیا...... آس و نراش کا دوسرا سال بڑا ظالم تھا اماں کے انتظار کی طویل گھڑیاں اب ختم ہو چکی تھیں کہ اور زیادہ انتظار کی نا گنجائش تھی اور نا ں ہی ان میں یارا تھا...... حویلی کے پچھواڑے کے کچے مکان میں رہنے والی شانتی کے دو سال میں دو بیٹے ہو چکے تھے اور ادھر آنگن سونا تھا...... اماں اپنے نصیب پر رو پڑتیں......

گھر کے باہر اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ تو ہر انسان کرتا ہی ہے۔ تیز آندھی اور طوفان آنے کا امکان ہوتے ہی گھر کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں...... جب طوفانی لہریں بند گھر کی چار دیواروں کے اندر ہی اندر گردش کریں تب خاندان کی کوئی بڑی مضبوط شخصیت ہی اس طوفان پر قابو پا سکتی ہے۔ اگر مکین کمزور ہوں تو مضبوط سے مضبوط گھر کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ دیواریں تڑخ جاتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ دھڑام سے زمین پر آ گرتا ہے۔ آج پرتھوی کی حویلی کی چار دیواروں کے اندر ایسا ہی طوفان برپا ہونے جا رہا تھا۔

وہ ماں جس نے پرتھوی کو صرف دیا ہی دیا تھا...... پرتھوی کے پتا جی کی موت کے بعد بھی دنیا کا ہر آرام ہر خوشی بیٹے کو دی تھی۔ جب بیٹے کے سامنے سوالی بن کر کھڑی ہوئیں تو پرتھوی کا سارا وجود ہل گیا ...... ''میرے لعل مجھے ایک وارث دے دے'' گھر کے در و دیوار چیخ اٹھے ...... ہمیں وارث چاہیئے ...... بے خبری کے عالم میں ایک ماں نے اپنے ہی گھر پر حملہ کر ڈالا تھا۔ ''اماں کیا کہہ رہی ہیں آپ'' حیرت زدہ بیٹے کی آواز میں بڑا دکھ گھلا تھا۔

اماں بولیں ...... ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں ...... یہ صرف ایک ماں کی آرزو ہی نہیں ہمارے خاندان کی ضرورت بھی ہے۔ اماں ہم آپ کی وجہ سے اس دنیا میں ہیں ...... یہ زندگی آپ نے دی ہے ...... آپ ہم سے ہماری جان مانگ لیتیں تو ہمیں دریغ نہ ہوتا ...... آپ نے مانگی بھی وہ شے جو ہماری دسترس میں نہیں۔ اماں اولاد تو خدا کی نعمت ہے وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے ...... ایک ناقص انسان اس کے انتظام میں کس طرح دخل اندازی کر سکتا ہے۔

اماں بولیں ...... یہ مردوں کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں مرد ہی سب کچھ کر سکتا ہے۔

نہیں اماں ...... یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ کرنے والا تو اوپر والا ہے۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ گندھاری کو ہم بڑے چاؤ سے بہو بنا کر اس گھر میں لائے تھے۔ وہ اتنی اچھی لڑکی ہے کہ کسی کو بھی اس سے کبھی کوئی شکایت ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن ہمارے جیسے رجواڑوں میں ایک عورت کا اچھی بہو اور اچھی بیوی ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کا ماں بننا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہی تو ہماری آنے والی نسلوں کی امین ہوتی ہے۔ یہ وسیع جائداد جو تمہیں وراثت میں ملی ہے تمہیں بھی تو اپنے بیٹے کے ہاتھوں میں سونپنا ہوگی۔

پرتھوی بولے ...... اماں شاہوں کے نام اس صفحہ ہستی سے مٹ گئے ...... بڑی بڑی سلطنتیں خاک میں مل گئیں اور آپ اپنا شجرۂ نسب اور اپنی اس چھوٹی سی ملکیت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہیں ...... کب تک ...... آخر کب تک ...... اماں ...... یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں جو آج ہے کل نہیں ہوگا ...... ایک دن سب کو فنا ہونا ہے۔ لوگ آپ کو ...... ہم سب کو بھلا دیں گے ...... یہی قدرت کا تقاضہ ہے۔ پرتھوی نے تشویش زدہ لہجے میں جواب دیا۔ اب بتائیں اماں آپ کیا چاہتی ہیں......

بیٹے کی باتیں سن کر اماں سناٹے میں رہ گئیں۔ بڑے گرجتے لہجے میں بولیں ...... تم بہت بدل

گئے ہو...... ہر بات پر اپنی من مانی کرنے لگے ہو...... کیا تمہیں اپنے خاندان کی بہبودی کا خیال نہیں...... کیا تم نہیں چاہتے تمہارے پرکھوں کا نام تابندہ رہے۔ تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔

پرتھوی نے سخت اور مضبوط لہجے میں کہا...... اماں ہم نے آج تک آپ کا حکم نہیں ٹالا...... ہمیں افسوس ہے آپ کی یہ خواہش ہم پوری نہیں کر سکتے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا...... ہم جانتے ہیں ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔...... اماں بگڑ گئیں...... تم کوئی انہونی تو نہیں کرو گے...... ہمارے خاندانوں میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

اگر آپ کی اپنی بیٹی ہوتی تو کیا آپ برداشت کرسکتیں...... اماں بڑی دلیری سے بولیں ہاں......ضرور کرتے...... اگر ایسے حالات ہوتے تو کرنا ہی پڑتا...... پرتھوی کھڑے ہو گئے...... اماں اس گھر میں ایسا نہیں ہوگا...... کبھی نہیں...... اس ہنستی چمکتی حویلی کو ہم جہنم نہیں بنا سکتے...... ان کی آواز میں پختگی کے ساتھ درد بھی تھا۔ پر اماں ٹس سے مس نہیں ہوئیں...... طنزیہ لہجے میں بولیں...... ہنستی...... چمکتی حویلی...... ارے سناٹا چھا گیا ہے حویلی پر۔ ہم اس ویرانے میں بہاروں کی آمد کے منتظر ہیں...... کم سے کم ڈاکٹری جانچ ہی کروالو...... ہمارے دل کو کچھ تو تسلی ملے گی...... اگر ڈاکٹر نے ہمیں دادی بننے کی امید بندھائی تو ہم بھی سکون سے اپنے حصوں کی خوشیوں کا انتظار کریں گے...... اماں بیٹے کا چہرہ دیکھتیں رہ گئیں...... کچھ تو بولے......

پرتھوی کو اماں کی ہر بات برداشت تھی مگر گندھاری کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتے تھے۔ سوچا کہ جانچ کے بہانے ہی کچھ عرصے تو اماں کے طعنوں تشنوں سے چھٹکارا ملے گا۔ فوراً ہاں میں ہاں ملائی اماں بھی ذرا سا مسکرائیں اور وہ کمرے کے باہر چلے آئے۔

تو بدل گیا ہے...... میرے لعل...... بالکل بدل گیا ہے۔ مگر میں بھی ہار ماننے والی نہیں...... اور ان کے خاندان کے دستور کے خلاف آج ایک ساس کے قدم اپنی بہو کے کمرے کی طرف چل پڑے...... گندھاری کچھ کام میں مصروف تھی...... پاؤں کی چاپ سن کر وہ پلٹی...... آگے بڑھی تھی...... تمہارا صرف ایک کام ہے ہمارے بیٹے کو خوش رکھو...... اس حویلی میں نوکروں کی کمی نہیں...... گندھاری نے نظریں جھکالیں۔

بڑی خاموشی ہے بہو...... تمہارا دل نہیں گھبراتا...... اس سناٹے سے...... گندھاری نے نہ پہلے

کبھی اماں کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بات کی تھی سو آج بھی نظریں نہ اٹھا سکی ...... اماں بولتی رہیں وہ سنتی رہی۔

اگر تم چاہو تو اس حویلی میں رونق پھیلا سکتی ہو۔ خوشیاں بکھیر سکتی ہو ...... گندھاری منھ سے کچھ نہ بولی ...... من میں سوچا وہ کیسے ...... اماں نے فوراً جواب دیا ...... اگر تم پرتھوی کو دوسری شادی کرنے کے لیے راضی کرلو تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔ اور کمرے کی چھت گندھاری کے سر پر گر پڑی ...... اماں گرجتی رہیں ...... بجلی کڑکتی رہی اور گندھاری کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینھ برستا رہا ...... اماں تو اپنے دل کا لاوا باہر نکال کر چل دیں اور گندھاری کو سوچوں کے سمندر میں ڈوبتا چھوڑ گئیں۔ وہ خاموش اور حیران بیٹھی اماں کی باتوں پر غور کر رہی تھی کہ پرتھوی آ گئے۔

پرتھوی نے تو گندھاری کی سرخ آنکھیں دیکھ کر سوال کیا ...... کیا اماں نے کچھ کہا ...... وہ دھیرے سے بولی۔ اماں یہاں آئی تھیں ...... پھر آپ نے کیا کہا ...... ہم کیا کہتے ...... فیصلہ تو ان کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے بولی ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہوگا تو وہی جو اماں چاہیں گی۔

پرتھوی بولے اور آپ کے دل اور آپ کی چاہت کی کوئی قیمت نہیں، کوئی مول نہیں۔ وہ بولی عورت تو پیدا ہی ہوئی ہے قربانیاں دینے کے لیے۔ ہم سہہ لیں گے ...... کیا آپ جانتے نہیں اگر شجر ثمر دار نہ ہو تو باغبان اسے کاٹ ڈالتا ہے۔ اس کی قسمت میں تو جلنا ہے ہی ...... پرتھوی نے گندھاری کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر کہا۔ ایسی الٹی سیدھی باتیں سوچیں گی تو کیا بنے گا آپ کا۔ آپ ہماری بیوی ہیں اور آپ کی حفاظت کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔ ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ ہماری اماں بھی نہیں۔ ہم صرف ایک بات جانتے ہیں کہ ہم آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ گندھاری کے اندر ایک یقین اور بھروسہ کا ستون اتر گیا

دوسرے دن اماں پھر آدھمکیں ...... وہ بولتی رہیں اور گندھاری کا دل رو رو کر فریاد کرتا رہا ...... اماں ہم دونوں پر رحم کریں ...... یہ بڑا مشکل کام ہے ...... آپ ماں ہو کر اپنے بیٹے کے دل کے حال سے واقف نہیں ...... ہم آپ کو کیسے بتائیں ہم سے جدائی وہ گوارا نہیں کرسکیں گے۔ انہیں ہمارے بغیر چین نہیں آئے گا۔ گر مرد کے دل کا چین لٹ جائے تو اس کے لیے زندگی کے سارے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ پھر آپ کی اس شاندار حویلی کا کیا بنے گا ...... سب بے رنگ ہو جائے گا۔

گندھاری کا سوگواری بکھیرتا چہرہ دیکھ کر پرتھوی بری طرح اپ سیٹ ہو گئے تھے۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے......اوے......آپ کا تو چہرہ ہی بدل گیا۔ آخر کیوں...... یہ روز روز کے واقعات جو ہماری حویلی میں ہو رہے ہیں ہماری زندگیوں کے رخ بدل سکتے ہیں...... ہمارے درمیاں دوریاں حائل ہو سکتی ہیں، جس کا سامنا کرنے کے لیے ہم ہرگز تیار نہیں۔

شک وشبہ کا ذرا سا شائبہ زندگی کو بے لطف کر دیتا ہے۔ ہم بچّے کے بغیر جی لیں گے لیکن آپ سے دوری نہ سہہ سکیں گے۔ ہم ایک خوشگوار زندگی جینا چاہتے ہیں......صرف آپ کے ساتھ......کیوں نا ہم ایک لاوارث بچّے کو اپنا وارث بنالیں......گندھاری نے بڑی تعجب خیز نظروں سے پرتھوی کی طرف دیکھا......ان کا رواں رواں چیخ پڑا......یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ'' وہ بولے ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں......ایک بچہ اس ظالم زمانے کی کڑی دھوپ سے بچ جائے گا اور ہمارے گھر میں آنے والا طوفان بھی تھم جائے گا۔

گندھاری مدھم لہجے میں بولیں......اور ہم اماں کو کیا جواب دیں گے......پھر وہ کہنے لگیں۔ کیوں نہ ہم اپنا ٹیسٹ کروالیں وہ گرج پڑے......وہ کبھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں ٹیسٹ سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں دے گا......گندھاری کانپ گئی۔

ہمارے دوست ،بھرت پدمنی بھابھی کو دل وجان سے چاہتے تھے......ان کی اماں نے بڑی بیقراری سے چار سال وارث کا انتظار کیا۔ آخر پدمنی بھابھی کو گھر سے نکال کر ہی دم لیا۔ ایک پل کو بھی یہ نہ سوچا کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے بیٹے کی خوشیاں تار تار کر دیں......بھرت کی مخالفت کے باوجود ان کی دوسری شادی کروادی۔ تھیں تو وہ بھی بے پناہ حسین پر تھیں بہت تیز طرار۔ بددماغ اور مغرور خاتون......ان کے آتے ہی حویلی میدان کارزار بن گئی......اور اماں ہاتھ ملتی رہ گئیں۔

دو سال بھرت لاولد رہے......انکی اماں بہو سے تو کچھ بھی نہ بول سکیں......بیٹے پر دھمک پڑیں حکم صادر کر دیا......ٹیسٹ کرواؤ اور ڈاکٹری علاج شروع کردو......ہم نے اپنے یار کو بہت سمجھایا کہ ٹیسٹ ویسٹ کے چکر میں نہ پڑو......قدرتی قانون میں زیادہ دخل اندازی ٹھیک نہیں......بڑا مہنگا پڑے گا یہ سودا......گر کچھ گڑبڑ نکلی تو آئندہ زندگی غم ہی غم میں کٹ جائے گی......وہ ہماری بات سمجھ گئے پر ان کی اماں بضد تھیں......آخر مرتا کیا نہ کرتا......اماں کی خوشی کی خاطر پہنچ گئے دونوں ہسپتال اور لے آئے اپنی ہی موت کا فرمان۔

یہ تو خیر رپورٹ لینے کے لیے اکیلے گئے تھے۔ جب رپورٹ لے کر ہمارے پاس آئے تو کچھ گھنٹوں ہی میں ان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ ہم دیکھتے ہی فوراً سمجھ گئے تھے کہ کوئی مرد اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ تو اپنے کو خدا سمجھتا ہے۔ مکمل ...... پورا ...... پھر وہ یہ کمی کیسے برداشت کرتے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اماں کو خوش کرنے کی خاطر بڑی رقم دے کر رپورٹ اپنے فیور میں لکھوائی تھی۔ اماں کے دل کو تو یقین اور اطمینان دلا دیا کہ ان کو حویلی کا وارث ضرور ملے گا ...... پھر اماں کا مندروں کی چوکھٹوں پر ماتھا ٹیکنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

وقت اپنی خصوصی رفتار سے گزرتا گیا اور وہ رپورٹ دیمک بن کر ہمارے جگری دوست کو چاٹتی رہی۔ بھرت کا مرض لاعلاج تھا۔ آخر وہ ہو گیا جو ہونا چاہیئے تھا ...... وارث کی چاہ میں ایک دیوانی ماں اپنا اکلوتا بیٹا کھو بیٹھی۔ ...... بدنصیب ماں کی دنیا اندھیری ہو گئی ...... نئی بہو نے حویلی اور ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اماں کو ورنداون کے مندر کی چوکھٹ پر بٹھا آئی ...... کہ اب زندگی کی آخری منزل پر بھگوان کا نام جپو ...... گندھاری سکتے کے عالم میں بیٹھی رہیں ...... آنکھوں سے آنسو نکلتے رہے۔

کیا ہوا ...... وہ بولے ...... ہم تو یہ جانتے ہیں جو دکھ بوتے ہیں وہی دکھ کاٹتے ہیں۔ انسان کو صابر اور شاکر ہونا چاہیئے۔ آخر دنیا کی ساری خوشیاں، ساری نعمتیں وہ ایک ہی انسان کی جھولی میں تو نہیں ڈال سکتا۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ کبھی خوش نہیں رہتا۔ اس کی چاہتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہے اور ایک دن اپنی چاہتوں کی دلدل میں ڈوب جاتا ہے۔

وہ گھبرا کر بولیں ...... اب ہم کیا کریں ...... وہ ...... اماں ...... کل

پرتھوی مسکرائے ...... زیادہ کچھ نہیں کرنا ...... بس آپ ہماری نظروں کے سامنے رہا کریں اور مسکراتی رہیں۔ گندھاری نے شرما کر گردن جھکا لی ...... آہستہ بولی ...... کل اماں کو کیا جواب دیں گے ......

او ہو ...... اب تو ہماری اماں آپ کے حواسوں پر ہر وقت چھائی رہتی ہیں ...... شیر ببر کی طرح ......

گندھاری اب مسکرائی اور بولی ...... اگر شیر ببر نہیں تو ساس شیرنی سے بھی کم نہیں ہوتی۔ آگے ہم سنبھال لیں گے آپ بے فکر رہیں ...... جو بھی ہو ...... ٹیسٹ ہم نہیں کروائیں گے۔ ہم بھرت جیسی موت مرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں ڈاکٹروں سے زیادہ بھروسہ بھگوان پر ہے۔ اگر علاج سے ہی اولاد ہوتی تو دولت

مندروں کے بڑے بڑے عالی شان مکانات صرف اس ایک نعمت سے محروم نہ ہوتے۔

آج سب کچھ ہمارے بس میں ہے۔کل اگر معلوم ہوا کہ ہماری وجہ سے آپ ماں نہیں بن سکیں تو ہم خود اپنی نظروں میں گر جائیں گے۔اور آپ کے دل میں بھی فرق آجائے گا......کون عورت ایسے مرد کے ساتھ رہنا گوارا کرے گی جو اسے ماں بننے کا شرف ہی نہ دے سکے۔ دونوں کے دلوں میں ناامیدی اور اداسی گھر کر جائیں تو رشتہ ٹکتا نہیں...... یوں تو ہر بیوی اپنے شوہر کو بڑی شدت سے چاہتی ہے لیکن ماں بننے کے بعد ہر عورت اپنے شوہر کے ساتھ رعایت برتنے لگتی ہے۔شوہر کی بڑی سے بڑی زیادتی برداشت کر لیتی ہے......کیونکہ عورت کی نظروں میں اپنے بچے کے باپ کا درجہ سب سے برتر ہوتا ہے......وہ اپنے بچے کے باپ پر جان چھڑکتی ہے......اس کا بڑا مان سمان کرتی ہے۔یہاں تک کہ اسے بھگوان سمجھنے لگتی ہے۔ جانتی ہیں آپ......ایسا کیوں ہوتا ہے۔کیونکہ بچے کی ماں بنا کر اس کے شوہر نے اسے دنیا کی نظروں میں معتبر کر دیا۔اسے ایک مکمل عورت کہلانے کا شرف بخشا۔

اگر رپورٹ آپ کے خلاف بولی......پھر......ہم پوچھتے ہیں کیا ہوگا......ممکن ہے ہم ہی بدل جائیں......آخر ہیں ہم بھی ایک معمولی انسان......پہنچ جائیں اماں کے پاس اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر کہہ دیں......اماں آپ کی بہو بانجھ ہے۔اس کی کوکھ بنجر ہے اور تپتے بنجر صحرا میں کب پھول کھلے ہیں۔ سو آپ بہاروں کی آمد کا سپنا دیکھنا چھوڑ دیں۔اور اگر آپ ایسا نہ کر سکیں تو کر دیں ہماری دوسری شادی ......کہ گندھاری تو آپ کو وارث دینے کے لائق ہی نہیں۔ پھر ہماری نئی نویلی دلہن آکر آپ کو حویلی کے پیچھے والے حصے میں منتقل کر دے گی۔ جہاں آپ اکیلی بیٹھی آنسو بہائیں گی۔ ہماری وہ نئی رانی اس شاندار حویلی پر راج کرے گی اور آپ کو قدم قدم پر رسوا کرے گی۔ یہ کہتے ہوئے خود پرتھوی کی ذات اندر سے بکھرتی جا رہی تھی......لیکن یہی وقت کی ضرورت تھی۔

وحشت......رنج اور خوف کی کیفیات مل جل کر اس کومل لڑکی کے وجود میں زلزلہ برپا کر گئی تھیں اور وہ اپنے آپ سے بے خبر پلنگ پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔اپنی جان تمنا کو بے ہوش دیکھ کر پرتھوی کے ہوش اڑ گئے۔سارا وجود لرز گیا۔اس کے شانے پکڑ کر رو رو کر کہہ رہے تھے، ہوش میں آیئے۔آنکھیں کھولیے ......کیا آپ کو ہمارے اوپر بھروسہ نہیں۔بیقراری کی یہ چند گھڑیاں بڑی جان لیوا تھیں۔

گندھاری......کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں......نہیں......گندھاری......آپ ہماری بیوی ہیں

اور ہمیشہ رہیں گی ...... جب تک ہم دونوں زندہ ہیں کوئی ہمیں جدا نہیں کرسکتا ...... آپ اور صرف آپ ہمارے دل پر اور اس حویلی پر راج کریں گی ...... لیکن آپ ہماری بات مان لیں۔ایک بچہ اڈوپٹ کرلیں ...... ان سوچوں میں ڈوبے ہوئے وہ نہ جانے کیا کیا بول رہے تھے ...... وہ اپنے آپ سے اور اردگرد کے ماحول سے قطعی بے خبر تھے ...... ملازم کہہ رہا تھا ...... سرکار مالکن نے آپ کو یاد کیا ہے۔وہ بیٹھے سوچنے لگے اب کوئی نیا طوفان ہے جو ہمارا انتظار کررہا ہے۔دھیمے دھیمے قدم اٹھاتے وہ اماں کے کمرے کی طرف بڑھے تھے۔ان کے جانے کے بعد جب گندھاری کے ہوش بجا ہوئے تو وہ صدمہ اور بے یقینی کی حالت میں دیوار تکتی رہ گئی۔اگرچہ پرتھوی ایک مضبوط اور پختہ شخصیت کے مالک تھے لیکن اماں کے سامنے ایک نامعلوم احساس کا خوف ان کے دل و دماغ پر چھا جاتا تھا۔وہ بڑے گھبرائے دل کے ساتھ اماں کے پاس پہنچے۔

اس گھن گرج کے موسم میں شازیہ چھتری بن کر حویلی میں نمودار ہوئی تھی۔اماں اسے دیکھ کر مسکرائیں تو تھیں لیکن بڑی پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔چار سال کے بعد ...... اس طرح ...... شازیہ نے سوچا ...... اماں خیر تو ہے ...... آپ بہت پریشان نظر آرہی ہیں۔

خیر ہی تو نہیں ہے اور لگیں دل کے پھپھولے پھوڑنے ...... جب ساری باتیں من و عن شازیہ کے سامنے بیان کردیں تو خود بھی رو پڑیں ...... شازیہ بھائی جان کی دوسری شادی کا ذکر سن کر گھبرائی۔اماں یہ دوسری شادی کیوں۔ ...... اگر دوسری کی بھی اولاد نہ ہوئی تب ...... بڑے رنج و ملال کے ساتھ بولیں ...... پھر بھابھی کا کیا بنے گا ...... مجھے نہیں لگتا بھائی جان دوسری شادی کرنے کو راضی ہوجائیں گے ۔وہ اوروں سے بالکل جدا ہیں۔اگر آپ نے کر بھی دی تو کبھی خوش نہ رہ پائیں گے۔بھول گئیں آپ بھرت بھائی صاحب کا قصہ۔سب کچھ تباہ ہوگیا تھا ......

کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔آج کل میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے۔سب بیماریوں کا علاج ہے۔مجھے یقین ہے علاج کے بعد آپ کے دلی ارمان ضرور پورے ہوں گے۔بس ایک مشکل ہے کہ گاؤں میں وہ علاج نہیں ہوسکتا۔اگر آپ اجازت دیں تو ہم دونوں کو اپنے ساتھ بمبئی لے جائیں۔

اندھا کیا چاہے ...... دو آنکھیں ...... اماں فوراً راضی ہوگئیں ...... بیٹا تم کچھ بھی کرو۔اتنی بڑی ڈاکٹرنی ہو بس ہمیں تو ایک وارث چاہیئے تم کب آئیں ...... بس ابھی ...... ابھی ...... شازیہ کو دیکھتے ہی

پرتھوی کی طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ پل میں ماحول میں تبدیلی ہوگئی تھی...... بھائی صاحب چار سال سے آپ دونوں گاؤں سے باہر نہیں نکلے...... اب آپ کو اور بھابھی جان کو میرے ساتھ بمبئی جا کر رہنا ہوگا۔ منصور ایک سال کے لیے امریکہ گئے ہیں۔ مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔

وہ مسکرائے اوے بھئی یہ ممکن نہیں۔ ہم اماں کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے...... اماں کمزور بھی تو ہوگئی ہیں۔ آپ گندھاری کو لے جایئے۔ دونوکر ساتھ جائیں گے۔ کوئی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

اماں نے فوراً اپنی رائے کا اظہار کیا...... ہم اکیلے کہاں ہیں۔ نوکر چاکر ہیں تو...... اور تو پھر کوئی زندگی بھر کے لیے تھوڑے ہی جا رہے ہو...... بس علاج کروا کے واپس آجانا ہے۔

علاج...... پرتھوی ہکا بکا رہ گئے...... سو اماں نے شازیہ کے سامنے اپنے دکھوں کا پٹارا کھول ہی دیا

ٹھیک ہے اماں جو آپ کا حکم...... پھر شازیہ سے بولے...... چلو...... اماں کو آرام کرنے دو...... اماں کے ساتھ ہوئی گفتگو نے پرتھوی کے ذہنی دباؤ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ باہر آتے ہی بولے شازیہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اماں کے ساتھ تم بھی...... ان کے لہجے میں خفگی کا اظہار تھا...... ہم تھک گئے ہیں سنتے سنتے...... دوسری شادی کرو...... ٹیسٹ کراؤ...... کیا تم بھرت کا قصہ بھول گئیں...... دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے...... یہ ٹیسٹ نہیں ہوں گے...... تم ڈاکٹر نہیں ایک بہن کی حیثیت سے سوچو......

شازیہ حیران تھی کہ بھائی جان کی غلط فہمی کیسے دور ہو اب...... بولی...... بھائی جان جو آپ چاہیں گے وہی ہوگیا۔ آپ بمبئی جانے کو راضی تو ہو جایئے...... اماں کی تلملاہٹ بھی بجا ہے اور آپ کا کہنا بھی درست ہے۔ پرتھوی اس معاملہ پر کبھی زیادہ بحث نہیں کرتے تھے۔ خاموش ہی رہ جاتے تھے۔ ہر چند اپنی اندرونی حالت کا وہ کسی کے سامنے اظہار نہیں ہونے دیتے تھے مگر آج بہن کے سامنے اپنے آپ پر قابو نہ پا سکے۔ صبر کے سارے بندھ جو ٹوٹے تو بڑے ہی مضطربانہ انداز میں بولے۔ یہ تو جانتی ہو کہ زبان کے کوڑے انسان کو مار ڈالتے ہیں۔ ہماری ماں ہیں اور ہم اماں کی ہر بات سہہ لیں گے...... جیتے رہیں کسی نہ کسی طرح مگر گندھاری کو گھٹ گھٹ کر روتا دیکھ کر ہماری جان پر بن آتی ہے...... کبھی سوچا نہ تھا کہ ایک دن حالات ہمیں ایسا بے بس کر دیں گے کہ اماں کے سامنے لاجواب ہو جائیں گے۔ شازیہ بولی...... یہ کیا بھائی صاحب...... ایسی بے دلی ٹھیک نہیں...... دونوں کمرے کے اندر پہنچ چکے تھے۔ اور پرتھوی نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ ہم سوچتے ہیں ایک بچہ اڈوپٹ کر لیں تو ہماری ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ یہ

گندھاری نے بھی سنا.......

شازیہ اور گندھاری بڑے تپاک سے ملیں اور پھر فوراً ہی شازیہ نے سوال کیا۔ بھابھی جان آپ کا اڈوپشن کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ کام دونوں کی صلاح اور رضا مندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا ...... گندھاری بولی ...... ہمیں ڈر لگتا ہے ...... اماں ہرگز راضی نہ ہوں گی ۔ پرتھوی بولے ...... اماں کو کون بتائے گا ...... بچہ دیکھ کر اماں کے دل کو بھی راحت مل جائے گی اور ہمیں ...... وہ مسکرائے ...... ہماری دنیا آباد رہے گی ...... اب ہاں کہہ دیجئے تو آگے کے منصوبے بنائے جائیں ....

اگر ہاں ہے تو وعدہ کریں کہ یہ گہرا راز ہم تینوں کے بیچ میں ہی رہے گا۔ چوتھے انسان کو اس کی بھنک تک نہ پڑے گی ...... نہ آج ...... نہ کل ...... نہ کبھی آئندہ ...... مصلحت کا تقاضہ بھی یہی ہے کیونکہ اگر یہ راز افشا ہوا تو اس حویلی پر قیامت سے پہلے قیامت ٹوٹ پڑے گی ۔ پھر کچھ نہ بچے گا۔ سب کچھ فنا ہو جائے گا اور وہ معصوم بچہ جو ہماری آئندہ خوشیوں کا محافظ بن کر آئے گا اس کا برا حال ہو جائے گا۔ سب سے زیادہ نقصان اس کو پہنچے گا۔ اور اس مصمم ارادے کے ساتھ گندھاری نے رخت سفر باندھا ....

اماں نے نہایت صبر اور سکون کے ساتھ بیٹے اور بہو کو وداع کیا۔ چار ماہ کے بعد جب گندھاری پاؤں بھاری لیے حویلی پہنچی تو خوشخبری سنتے ہی اماں کا دل سینے کے پنجرے میں اچھل پڑا ...... بچے کی کلکاریاں کانوں میں گونجنے لگیں ...... گندھاری کو مسند پر بٹھا دیا گیا اور سارے نوکروں کو الگ الگ ہدایتیں دی گئیں ...... پوری حویلی میں خوشی کا ماحول پھیل گیا۔ حویلی کے مندر کی گھنٹیاں بج اٹھیں ...... ہر روز ایک نئی رسم ادا ہوئی ...... دان پن کا سلسلہ اور بڑھ گیا۔ اماں کی خوشیوں کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا اور وہ اپنی خوشیاں دوسروں کے ساتھ بانٹ بھی رہی تھیں ۔ مگر اس نرم نازک لڑکی پر جو بیت رہی تھی وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ ڈری ڈری، سہمی سہمی سی رہتی ...... ہزاروں خدشوں اور خطروں کے ساتھ ایک ایک پل گزارنا محال ہو رہا تھا۔ کمزوری اتنی بڑھی کہ ایک دن چکر کھا کر گر پڑی ۔ پرتھوی پاس ہی تھے انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا ...... اماں گھبرائیں ...... سنتے ہی فوراً گندھاری کے کمرے میں پہنچیں۔

فوراً حکم دیا ...... تم اسے واپس بمبئی لے جاؤ۔ شازیہ کے زیر علاج رہے گی تو ماں اور بچہ دونوں سلامت رہیں گے ...... گندھاری سے بولیں ...... یہاں تمہارے کھانے اور آرام کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے پھر بھی تم دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہو۔ کمزور ماں کا بچہ بھی کمزور ہی ہوگا۔ ہمیں تندرست اور سندر پوتا

چاہیئے۔ اگر تمہاری صحت اچھی رہے گی تو بچہ بھی صحتمند ہوگا۔ پرتھوی کی طرف دیکھ کر بولیں سب کام چھوڑ چھاڑ کر تم بمبئی جانے کی تیاری کرو۔

اور اماں آپ...... وہ فکر مند ہو گئے...... مجھ بوڑھی کی فکر کرنا چھوڑ دو...... آنے والی نسل کی فکر کرو...... وہ دل میں سوچنے لگے۔ اماں جو بھی کر رہا ہوں صرف آپ کو خوش دیکھنے کی خاطر...... بولے...... کیسی باتیں کرتیں ہیں اماں...... ہم آپ کے ایک ہی تو ہیں اور آپ کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔ اماں بولی یوں تو ہمارا ابھی دل اس سونی حویلی میں نہیں لگتا لیکن اس وقت گندھاری کو ایک ڈاکٹر کی نگہداشت میں رہنا ضروری ہے۔ اور ہمیں شازیہ پر پورا بھروسہ اور یقین ہے۔ وہ ہمارے پریوار کے لیے سب کچھ کرے گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ تمہاری احسان مند ہے مگر اس لیے کہ ہمارے پریوار پیار کی ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں۔

اماں کی امیدیں بر آئی تھیں۔ آج ان کے انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔ آج وہ بڑی بیقراری سے بہو کی آمد کی منتظر تھیں کہ جس پھول کی انہیں چاہ تھی وہ بہو کے ہاتھوں میں ہوگا۔ تینوں کے استقبال کی تیاریاں بڑے زور شور سے چل رہی تھیں۔ پوری حویلی پھولوں سے سجائی گئی تھی۔ حلوائی بٹھایا گیا تھا کہ آج جو بھی اس راستے سے گزرے پیٹ بھر کر مٹھائی کھائے۔

اور جب وہ پھول اندر آیا ساری حویلی مہک اٹھی...... پرتھوی نے اس چاند کو اماں کی آغوش میں دیا تو ساری حویلی جگمگا اٹھی...... خوشیوں کا ایک سیلاب حویلی میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔

اماں آپ کے کنبے کا نام چلانے والا آ گیا۔ آپ کی وسیع جائداد کا وارث۔ آپ کے ہرے بھرے باغ کا ننھا سا باغبان۔ گندھاری کا چہرہ کھل اٹھا...... اس کے روئیں روئیں سے بچے کے لیے دعائیں نکلیں کہ اس نے ہی تو اسے ماں کہلانے کا شرف دیا تھا۔ آج وہ سب کی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔ اس نے پرتھوی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی پہلا جیسا پیار کا سمندر موجزن تھا۔

اماں بولیں...... یہ کندن ہے...... کندن...... اس کی آنکھیں ہو بہو ماں جیسی اور چہرہ تیرے پر گیا ہے۔

پرتھوی نے بچہ اٹھایا...... اسے سینے سے لگایا...... دھیرے سے بولے...... میرے لعل...... تم نے ہمارے گھر آ کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ ہمارا سنسار اجڑنے سے بچا لیا...... تم صرف میرے بیٹے ہو...... اور یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ کندن...... تم ہماری خواہشوں کے چراغ ہو۔

☆☆☆

یہ دونوں بچے میری دو آنکھیں ہیں

میری ماں بے حد خوبصورت تھیں پر پڑھی لکھی نہ تھیں ...... کیونکہ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا ...... شادی کے بعد وہ شہر میں تعلیم یافتہ لڑکیوں سے ملیں تو انہیں اپنی جہالت اور ذہنی پسماندگی کا اندازہ ہوا اور پڑھائی کی اہمیت کا احساس اجاگر ہوا۔ وہ کہتی کہ تعلیم سے نابلد لڑکی میں مشکلات کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

انہوں نے میری پڑھائی پر توجہ دی ...... مجھے بھی پڑھائی کا جنوں سوار تھا ...... وکیل بننے کے لیے میں نے کڑی محنت کی تھی۔ امتحان ختم ہوئے ہی تھے۔ ابھی تو میں نے چین کی سانس بھی نہ لی تھی کہ پتاجی نے میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔ میری رضامندی کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ یہ حق صرف میرے والدین کا تھا کہ مجھے جس کے ساتھ چاہیں وداع کر دے ...... میرا وکالت کرنے کا خواب۔ خواب ہی رہ گیا۔

پتاجی نے بتایا کہ انہوں نے آیوش کو پرکھا ہے۔ وہ ایک سادہ مزاج لڑکا ہے ...... خاکساری اور انکساری تو اسے وراثت میں ملی ہے۔ اماں بھی سن کر خوش تھیں۔ سو پھولوں سے سجی کشتی میں سوار میرا اور آیوش کی زندگیوں کا نیا سہانا سفر سکھ کے ساگر میں شروع ہو گیا۔

پچھلے سال شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ جس میں کئی لوگ زخمی اور ہلاک ہوئے ...... آیوش کے والدین بھی ایک بھیانک حادثے کے شکار ہوئے۔ ...... بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں کی موت کا اس بلوے سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ ایک سازش کا شکار ہوئے تھے۔ اس مصیبت کے وقت آیوش کا کوئی قریبی رشتے دار اظہار ہمدردی کے لیے بھی نہ آیا تھا۔ شادی کے موقع پر وہ سب لالچی اور خود غرض اور رشتے دار موجود تھے۔ ......اور چندو کاکا ان سب کی چالاکیوں کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ سب کو دیکھ کر حیران تو بہت ہوئے تھے ...... بڑی تیز نگاہوں سے ہر ایک کی مصنوعی مسکراہٹوں کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ شادی کے ہنگامے ختم ہوتے ہی ان لوگوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

آپ نے ہماری سونی سونی زندگی سجا دی ہے۔ آپ ہی پہلی بار ہمارے جیون میں پیار لے کر آئی ہیں۔ زندگی میں خوشیاں ملیں تو زندگی کو جنت مل جاتی ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے دونوں جہاں

کی مسرتیں میرے ہی گھر آ گئی ہیں۔ میرا دل بھی اپنے بس میں کہاں تھا۔ آیوش نے کہا تو مجھے بھی محسوس ہوا کہ میں بہاروں کے دیس میں آ گئی ہوں۔ زندگی پرسکون گذرنے لگی......اور محرومیوں کا احساس جاتا رہا۔

میں دن میں پتاجی کی بزنس سنبھالتی۔ سورج ڈھلتے ہی اپنے گھر لوٹ آتی...... آیوش کو گھر میں نہ پاکر اداس ہو جاتی...... بڑے صبر واستقلال سے بیٹھی ان کی راہ تکتی...... جب کئی مہینے یوں ہی گزر گئے تو مجھے خیال آیا کہ زندگی کے اس سفر میں وہ کہیں کھو نہ جائے اور میں اکیلی رہ جاؤں...... انہوں نے میری پریشانی پر دھیان نہیں دیا تو میری قوت برداشت بھی جواب دے گئی۔ جیسے ہی آفس سے لوٹے میں نے آنکھوں میں آنسو لئے بھرائی آواز میں شکوہ کیا...... ''آپ کہاں ہوتے ہیں'' یہی کچھ دن تو اپنے ہیں...... کل کون جانے کیا ہو جائے۔ ایسا نہ ہو ادھر میری ساری زندگی آپ کا انتظار کرنے میں بیت جائے اور آپ سب سے قیمتی خزانہ یعنی ''وقت'' سونے چاندی کے سکے بٹورنے میں ضائع کر دیں...... ابھی آپ آدھی رات گئے گھر لوٹتے ہیں آگے چل کر تو میں آپ کے دیدار کو بھی ترس جاؤں گی۔ آیوش یہ سن کر بری طرح سٹپٹا گئے۔ میری طرف دیکھ کر بولے میں بھی کیسا نادان ہوں یہ سوچا ہی نہیں کہ آپ بھی مجھ سے ناراض ہو جائینگی...... فوراً میرے قریب آکر مضبوطی سے میرے دونوں ہاتھ تھام کر بولے...... جان جاناں...... تم ہماری بیوی ہو...... ہماری جسم و جان ہو...... ہمارے اتنے قریب ہو کر بھی ہم سے اتنی دور کہ یہ بھی نہیں جانتی کہ ہم ہوتے کہاں ہیں۔ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ جیتے جی تم سے جدا نہیں ہونگے۔ آپ آئیں ساتھ لکشمی بھی لے آئیں۔...... بزنس میں چار گناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کو سنبھالنے والے تو صرف ہم اکیلے ہیں۔ تم ہم پر کرم فرماؤ تو ہمارا بزنس پارٹنر آئے۔ میں نے شرم سے نظریں جھکالیں۔ وہ پھر ہنس کر بولے تم وکیل ہو ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو کہ مجرم کون ہے۔ ساتھ میں سزا بھی تجویز کر دو۔ مجھے ہر سزا منظور ہے۔ آیوش فطری طور پر خاموش طبع تھے لیکن جب بولتے تھے تو ان کی باتیں دل موہ لیتی تھیں......اور آج روٹھی بیوی کو منانا بھی تو تھا...... انہوں نے جلدی لوٹنے کا وعدہ کیا۔ میرا غصہ پل بھر میں ختم ہو گیا۔ میں پھر ارمانوں کے پنکھ لگا کر اڑنے لگی۔

کچھ وقت آرام سے بیتا۔ آیوش پھر اپنا وعدہ بھول گئے۔ جیوں جیوں انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں میرے دل کی بے قراری بھی بڑھتی گئی۔ ذہن میں عجیب عجیب خیالات چکر لگانے لگے۔ کوئی ہے جو میری زندگی کی بہاریں لوٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میری خوشیوں کو تباہ و برباد کر کے میرے ارمانوں کو روندھ کر اپنے ارمانوں کا محل تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ میں تو تھرا ہی گئی۔ اتنا مضبوط رشتہ اور اتنا نازک کہ بے

اعتباری کے ہلکے سے جھٹکے سے محبت کا قلعہ دھڑ سے زمین پر آ گرا...... دل نے فوراً تائید کی تو اپنے قلعہ میں بالکل محفوظ ہے میں نے ایک دم اس احمقانہ خیال کو ذہن سے جھٹک دیا......

ایک رات آیوش گھر لوٹے تو ان کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار اور آنکھوں میں کسی گہری سوچ کا عکس دیکھ کر میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ شاکی لہجہ میں بولی آپ تو پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔ ایک بیوی کے ناطے نہ سہی ایک وکیل کی حیثیت سے شاید میں آپ کا تھوڑا سا بوجھ ہلکا کر سکوں...... آپ اپنی تھوڑی سی پریشانی مجھے دے دیں...... مجھے کچھ تو بتائیں پر سچی سچی بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو در آئے۔ آیوش نے میرے آنسوں پونچھے اور بڑے مضبوط لہجے میں بولے...... یہ تو آپ جانتی ہیں کہ محبت زندگی کا ایک بہت ہی اہم حصہ ہوتا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ اس گھر سے پیار محبت بھی اٹھ گیا تھا۔ پیار کے دو بول بولنے والا کوئی نہ تھا۔ ماں باپ کے جانے کے غم نے مجھے بہت رلایا ہے۔ اب آنسو اچھے نہیں لگتے ۔ پہلے تو رونا بند کرو پھر میری بات دھیان سے سنو۔ پیار سے محرومی انسان کے وجود کو بالکل خالی کر دیتی ہے وہ بالکل اجڑے اور سوکھے درخت کی مانند رہ جاتا ہے۔ میں بھی ایک اجڑا ہوا انسان تھا۔ آپ کی محبت نے سارا ماحول ہی بدل دیا...... گھر گھر سا لگنے لگا ہے۔

میں ٹھنڈے لہجے میں بولی ۔ ہمارے لئے کتنی دولت کی ضرورت ہے۔ مجھے عیش وعشرت کی خواہش نہیں۔ مجھے صرف آپ کا ساتھ چاہیئے ۔ دنیا کی ہر چیز آنی جانی ہے۔ پھر کیوں اس طرح محنت کرنا۔ میرا جسم دہک رہا تھا اور میں لرز رہی تھی آواز میں اتنی نقاہت تھی کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ آیوش نے مجھے چھوتے ہی بے چینی سے کہا...... تم کو تیز بخار ہے فوراً ہی ڈاکٹر کو بلایا...... جاتے جاتے ڈاکٹر خوشخبری سنا گئی...... میں ماں بننے والی تھی اور مجھے خبر ہی نہیں تھی۔ ہم دونوں سن کر خوشی سے جھوم اٹھے...... پھر کہاں کا غصہ اور کون سی ناراضگی وہ آ کر دوزانو میرے سامنے بیٹھے...... محبت سے بولے...... شکریہ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا...... کہ ہمارا بزنس پارٹنر آنے والا ہے۔ ان کی چمکتی آنکھوں میں پیار ہی پیار بھرا تھا...... بولے بھئی جہاں محبت ہوتی ہے وہاں پھول کھلتے ہی ہیں۔ آج سے آپ کا اکیلے رہنا کا شکوہ شکایت ختم...... اب تمہیں کیا تحفہ نذر کیا جائے۔ مجھے اپنے بازوؤں میں دبوچ کر میرا منہ چوم کر بولے...... میری نظروں میں اس سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں۔ ہم دونوں کو ایک نئی نرالی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس خبر نے میرے پتا جی کے کمزور بدن میں خون کی روانی تیز کر دی۔ مجھے تو ایسا لگا کہ اب ان کے سانسوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

اماں تو سنتے ہی مندر کی سمت دوڑیں۔ پوری حویلی مندر کی گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھی۔ خوب جشن منائے گئے۔ سب کو بڑی بیقراری سے آنے والے مہمان کا انتظار تھا۔

کئی دن گزر گئے میرا جنم دن تھا...... آیوش جلدی لوٹنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام ڈھل گئی اور رات ہوگئی۔ رات بڑھتی گئی۔ وہ نہیں آئے تو میں گھبرائی۔ اندر جی گھبرایا تو میں باہر آ گئی۔ آفس فون کیا وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اب تو اور بے چینی بڑھی۔ ایسی بے قراری کہ دل ہی ڈوبا جاتا تھا...... میں لرز رہی تھی...... گھبراہٹ میں کبھی روتی تو کبھی دہلیز پر جا کھڑی ہوتی...... میرے ساتھ گھر کے سارے ملازم بھی اپنے مالک کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ مسلسل روتے روتے میری زندگی کی سب سے لمبی بھیانک رات ایک ہی آسرے میں گذر گئی کہ صبح تک تو آیوش ضرور لوٹ آئیں گے۔

سورج کی کرنیں پھیلنے لگیں...... میرے گھر میں اجالا نہیں ہوا...... آیوش کا انتظار تو میں روز ہی کرتی تھی پر یہ انتظار تو قیامت بن کر آیا تھا۔ گھر خالی۔ دل خالی...... نہ جانے کیا کیا خیالات دماغ میں اترنے لگے۔ آیوش کی تلاش میں آفس کے لوگ گھر آئے تب میں معاملہ کی سنگینی کو سمجھی۔ سب مجھے ڈھارس دے رہے تھے۔ سب بے سود۔ بھلا مجھے کیسے چین پڑتا۔ ہر آہٹ پر دل دھڑ دھڑا اٹھتا اور بھیگی پھٹی پھٹی آنکھیں دہلیز پر جا کر ٹک جاتیں۔ دہشت تو مجھے پولس آفیسر کو دیکھ کر ہوئی...... میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی...... لیکن میں زرد پڑ گئی تھی۔ پولس آفیسر چلے گئے۔ آیوش کے بغیر میں بالکل محتاج اور معذور سی ہوگئی تھی۔ کھڑی ہوئی تو قدم لڑکھڑانے لگے۔ بمشکل اپنے کو سنبھالتی ہوئی کمرے میں گئی۔ جہاں کل ہر شئے دلکش نظر آتی تھی آج چپ تھی۔ اداس تھی...... سجی دیواریں ایسی مایوس جیسے سو رہی ہوں۔ نہ کوئی آہٹ نہ کوئی آواز ایسی ویرانی کہ دل چیر ڈالے...... اس گونجتے سناٹے کی ہر گھڑی میرے لئے بڑی ہی کڑی تھی۔ میز پر رکھا سفید لفافہ جیسے مجھے ہی گھور رہا تھا...... میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ یاس اور حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ بری طرح خوفزدہ تو تھی ہی اب تو دم ہی گھٹنے لگا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے لفافہ کھولا لکھا تھا۔

پرجا...... میری آرزو...... میری زندگی...... تم وکیل ہو اور مجھے یقین اور بھروسہ ہے کہ تم سب کچھ بخوبی سنبھال لوگی...... خدا کو ہمارا ساتھ رہنا منظور نہیں...... گو راہیں جدا ہو گئیں ہیں پر ہم دونوں ایک ہی منزل کے راہی ہیں...... اور بھی یادوں کی چنگاریاں تھیں۔ پھر تو سیاہی ہی سیاہی تھی......

پل میں سارے خواب سارے ارمان اور آرزوئیں خس و خاشاک ہوگئیں...... کرب کی شدت

سے میری چیخ نکل پڑی ...... آپ نے ایک بار تو سوچا ہوتا کہ میں تنہا اس ذلت کے ساتھ کیسے ساری زندگی گزاروں گی ...... مجھے کچھ بھی ہوش نہ تھا۔ معلوم نہیں کب تک سر پٹکتی رہی ...... فون کی گھنٹی مجھے دوبارہ ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ پتا جی بلا رہے تھے۔ یہ چوٹ ایسی گہری دل وجگر پر لگی تھی کہ دل ہی مر گیا تھا۔ ملنے کی ہمت وطاقت مجھ میں نہ تھی۔ پر جانا تو تھا ہی۔ موٹر میں بیٹھی سوچ رہی تھی اگر پتا جی مفلوج نہ ہوتے تو آج آیوش کی کھوج میں آسمان اور زمین ایک کر دیتے۔ کورٹ کچہری۔ قانون ...... سب ہی دکھاوا ہے ...... خود وکیل تھی پر مجھے یہ احساس ستا رہا تھا کہ ہمارے معاشرے میں بغیر مرد کے سہارے ایک عورت بالکل بے سہارا ہی رہتی ہے۔ حالات نے مجھے حد درجہ بزدل بنا دیا تھا۔ آپ نے میری ایک نہ سنی۔ آخر ہوا وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس دولت کے لیے ہمیں کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ آپ کی دی ہوئی اس بے انتہا دولت کے باوجود بھی میرا کشکول خالی ہے ...... اس حال میں اپنے بیمار باپ کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ ڈر تھا میری حالت دیکھ کر ہی انکا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ بمشکل میں نے اپنے ٹوٹے بکھرے وجود کو سنبھالا۔ چہرے پر بہادری کا خول چڑھا کر دونوں کا سامنا کیا۔ ان کے سوالوں کا تانتا بندھ گیا۔ میں ان دونوں کے سامنے بھی سچ نہ بول سکی۔ کیسے کہتی یہ غم ان کا ہی دیا ہوا ہے۔ ان کی نظروں میں دوشی میں ہی ٹھہرائی جاتی اور ذلت اور رسوائی کا نشانہ بنتی۔ بڑی ہمت کر کے میں نے کہنا شروع کیا ...... اماں ہم سب کے لیے یہ سب سے کٹھن وقت ہے پر کسی طرح اپنے آپ کو سمجھانا تو ہوگا ہی۔ ہم تینوں کو پوری ہمت سے اس آفت کا سامنا کرنا ہوگا ...... ناامیدی انسان کو کمزور بنا دیتی ہے ...... اب ہمیں بھی یہ امید لئے زندہ رہنا ہوگا کہ وہ جلدی ہی لوٹ آئینگے۔ ان دونوں کو مجھے دیکھکر تعجب ہو رہا تھا کہ اس مصیبت کی گھڑی میں میں کس طرح اپنے ہوش وہواس پر قابو رکھے ہوئے تھی۔ ان دونوں کے حوصلے کمزور تو تھے ہی۔ میں نے پھر دلاسا دیا۔ اماں آپ دونوں ان کی سلامتی کی دعا مانگیں کہ وہ جہاں بھی ہیں ٹھیک رہیں۔ میں اندر ہی اندر اپنے درد کے عذاب میں سلگ رہی تھی اور زیادہ دیر ڈرامہ رچا نہ سکی ماں سے لپٹ کر بے تحاشہ رو پڑی۔ پھر کتنے ہی دن گزر گئے۔ ٹک ٹک گھڑی کی آواز سنتے سنتے شام آجاتی اور پھر رات تو عذاب بن کر آتی کٹے نہ کٹتی ...... ہر وقت انتظار رہتا کہ کہیں سے کوئی اچھی خبر آئے۔ بہت سارے دن گزر گئے۔ پولس بھی ہار کر بیٹھ گئی۔

ایک دن ننھے مالی بابا کے ساتھ ایک چھوٹی سی بچی کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ انہوں نے بتایا بچی ان کی منھ بولی بہن کی ہے جو اب دنیا میں نہیں رہی۔ ...... مجھے یہ جان کر کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی بچی یتیم ہوگئی ہے

بے حد صدمہ ہوا۔ فوراً اسے گود میں اٹھا کر میں نے اس پھول سی بچی کو پیار کیا۔ اس کا نام پوچھا تو سہمی سہمی ڈری ڈری آواز میں بولی...... چاندنی...... میں نے کہا تم تو چاند جیسی پیاری ہو...... وہ ہنس کر بولی آپ میری آنٹی جی ہونا...... میری آنکھ بھر آئیں...... میں نے اسے سینے سے لگا کر کہا ہاں بیٹا میں تمہاری آنٹی ہوں...... اب تم اپنی آنٹی کے یہاں ہی رہنا...... کندن اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا...... کھیلنے کے لیے ساتھی جو مل گیا تھا۔ وہ دونوں زیادہ تر ساتھ ساتھ ہی رہتے۔ میں جو مسکرانا بھی بھول گئی تھی دونوں بچوں کی معصومانہ باتیں سن کر ہنس دیتی۔

وہ چھوٹی سی گڑیا بھی اب بڑی ہوگئی تھی...... حسن وشباب کی دنیا میں قدم بڑھائے تو حسن ایسا نکھرا کہ سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ لیکن اچانک ہی کچھ سال پہلے کی شوخ اور ہنس مکھ لڑکی خاموش اور سنجیدہ سی ہوگئی۔ کندن کی آنکھوں میں شوخی اور شرارتیں مچلتی دیکھ چاندنی کے دل میں بھی ایک بجلی سی کوند جاتی اور پھر ایک اندھیرا سا چھا جاتا۔ وہ اداس ہوجاتی اپنے کو سمجھا لیتی...... میں اپنی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی دبے پاؤں کندن پیچھے سے آیا اور اس کی چوٹی اتنے زور سے کھینچی کہ چاندنی کا سر کندن کے کاندھے سے جا لگا۔ اور پھر چاندنی کو کندن کی باہوں میں دیکھ کر ایک لمحے کو تو میں سن ہو کر رہ گئی۔ مجھے ایک دم احساس ہوا میرا بیٹا جوان ہوگیا ہے۔

اس وقت مجھے آیوش کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ اگر وہ ہوتے تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ میں تو یوں بھی خوشی اور غم کی تمام کیفیتوں سے بے نیاز ہوچکی تھی۔ بس اپنی آخری ذمہ داری پوری کرنے کیلئے ہی زندہ تھی، اس رات میں بہت بے چین رہی۔ میری آنکھ ہی نہ لگی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے ہی صبح ہوگئی۔

مجھے اپنی سدھ بدھ ہی نہ تھی۔ ہاتھوں میں خط تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ جا رہے تھے۔ نہ جانے کندن کب کمرے میں آیا۔ میرا حال دیکھ کر نہایت رنجیدہ ہوا اور گھبرا کر بولا "اماں کیا ہوا"۔ مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بولا۔ اماں کچھ تو بولیں...... ہوا کیا ہے۔ کیا دکھ۔ کیا غم آپ کو ستا رہا ہے۔ میں نے کہا میرے دکھ بے حساب ہیں۔ مجھے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ سمجھ میں نہیں آتا جاؤں تو کس سمت جاؤں۔ لوگ مجھے سنگسار کرنے کے لیے پھر پتھر اٹھا لینگے۔ اس نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ کر ہراساں ہو کر کہا...... آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اماں میں آپ کے پاس ہوں...... میرے ہوتے ہوئے کس کی مجال جو آپ پر ایک کنکری بھی اچھال سکے۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر کہا...... تو پھر بیٹا تم...... نہ جانے کیوں آگے بولتے ہوئے میں ہچکچائی...... وہ فوراً ہی بولا...... اماں...... میں نے آج تک آپ کی ہر بات مانی ہے...... آپ حکم کریں تو میری جان حاضر

ہے...... یہ سن کر ایک انوکھا سکون میرے میں در آیا۔ تو بیٹا تم چاندنی سے ملنا چھوڑ دو...... بچپن کی بات اور تھی...... اب...... اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا...... اسے اپنے خوابوں کی میت کو اپنے سینے میں دفن کرنے میں کچھ وقت لگا...... ٹھیک ہے اماں...... وہی ہوگا جو آپ چاہیں گی۔

ابھی میں سنبھلی بھی نہ تھی کہ اس نے خط دیکھ کر سوال کیا...... یہ کیا ہے اماں...... یہ...... یہ وہ خط ہے جسے میں نے ہزاروں بار پڑھا ہوگا...... اس نے مجھے ڈھیر سارے دکھ سہنے کی شکتی دی...... پھر تم آ گئے...... تو مجھے جیسے جینے کا بہانہ مل گیا...... میں نے زندگی کا وہ باب جو بیس سال پہلے سیل کر چکی تھی اپنے بیٹے کے سامنے یہ سوچ کر کھولا کہ اب وہ سمجھدار ہے اور حقیقت کا سامنا آسانی سے کر سکے گا...... تمہارے بابا کے ساتھ شادی میری سب سے بڑی خوش نصیبی کی دلیل تھی۔ جو دیکھتا جو سنتا میری قسمت پر رشک کرتا...... وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے...... اس راز کو میں نے راز ہی رکھنا بہتر سمجھا...... اس دنیا کے بے رحم لوگ بیحد ستاتے ہیں...... اگر حقیقت بتا دیتی تو میری تو دھجیاں ہی اڑا دیتے اور تمہارے اوپر متواتر ظلم و ستم کی بارش ہوتی رہتی...... کندن تو کچھ اور سوچے بیٹھا تھا۔ میری باتوں نے اس کو یقین دلایا کہ اس کے پتا جی زندہ ہیں۔ اماں میں ضرور اپنے پتا جی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔

اب میں مالی بابا سے صاف صاف کہنا چاہتی تھی کہ چاندنی کے بہکے بہکے قدموں کی آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور مجھے چاندنی اور کندن کا ملنا کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ لیکن جب وہ سامنے آئے تو ان کی بزرگی کا خیال کر کے جو کچھ سوچا تھا کہہ نہ سکی...... میں نے کہا...... بابا چاندنی اب بڑی ہوگئی ہے۔ اب کندن اور چاندنی کا یوں کھلے عام باہر آنا جانا ٹھیک نہیں۔ برادری والے اعتراض کریں گے۔ میں اکیلی عورت کس کس کا سامنا کروں گی۔ آپ چاندنی کو روکیں...... میں نے ان کے سامنے جیسے اپنا دامن پھیلا کر اپنے خاندان کی عزت بچانے کی بھیک مانگی وہ تو ایک دم آگ بگولہ ہو گئے۔ ان کا یہ روپ تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں بھی سہم گئی۔ بڑے ترش اور تلخ لہجے میں بولے۔ کیا کمی ہے میری بیٹی میں...... یہی نا کہ وہ ایک غریب کی بیٹی ہے...... دل تو امیر و غریب سب کے سینے میں ایک ہی طرح دھڑکتا ہے۔ ہے کوئی اس جیسی خوبصورت۔ ذہین و باشعور، میری بیٹی جس گھر میں بھی جائے گی وہ گھر بہت خوش قسمت ہوگا...... خوشیوں سے بھر دے گی...... وہاں کے رہنے والوں کے دلوں پر راج کرے گی...... اس کا شوہر اپنی قسمت پر رشک کریگا...... تم اپنے بیٹے کو حکم دو کہ وہ میری بیٹی سے دور رہے...... میں نے کہا

......وہ تو میں کرونگی ہی ...... چاندنی اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی ...... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ اگر آج کندن کے پتا جی ہوتے تو وہ بھی اس رشتے کو ٹھرا دیتے......

میرے اندر بڑا گہرا سناٹا مسلط تھا۔ صبح آنکھیں بند کرے بیٹھی بابا کا انتظار کررہی تھی۔ چندو کا کا نے آکر خبر دی کہ رات بابا چاندنی کو لے کر چلے گئے۔ کہہ رہے تھے کہ چاندنی کی شادی کر کے میں اپنے اس فرض سے سبک دوش ہو کر ہی مرسکوں گا...... اس پریشان کن خبر نے میرے اندر زبردست تہلکہ مچا دیا...... کیا خلوص بھری باتیں کرتے تھے...... وعدہ کیا تھا اس گھر کو کبھی نہیں چھوڑوں گا...... جس گھر کو بیس سال تک اپنا سمجھا اسے خاموشی سے چھوڑ گئے۔ بابا چاندنی کو کندن سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھا...... نہ معلوم کیوں خود میرا دل بھی بابا کو یاد کر کے تڑپ اٹھا۔ گھٹائیں تو پہلے بھی آئیں تھیں پر آج تو ایسا لگتا تھا کہ سارا گھر سیاہ غم کی چادر سے ڈھکا ہے۔ یہ کیسی تیرگی تھی۔ کیسی بھیانک گھڑی تھی۔ پھر بیس سال پہلے والا منظر آنکھوں میں آرہا تھا۔ چاروں طرف غم ہی غم پھیلا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر کے در و دیوار بھی بابا کی یاد میں اداس ہو گئے تھے۔ انہیں بلا رہے تھے۔ میرا دل چاہا بابا کو ڈھونڈھ لے آؤں...... میں اپنے ہی خیالوں میں پیچ و تاب کھارہی تھی۔ کندن گھبرایا ہوا تقریباً چیختے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

''اماں بابا کہاں ہے'' میری آنکھوں میں آنسو ٹھہرے تھے...... ماں کچھ تو بولیں...... بابا ایک افسردہ دل انسان ہیں۔ انکی زندگی میں ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر اداس نظر آتے تھے۔ میں نے انہیں آنسو بہاتے دیکھا ہے...... اپنے دکھ بالائے طاق رکھ کر ہمیں خوشیاں دیتے رہے۔ انہوں نے مجھے بے انتہا محبت دی کہ میں نے کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں کی...... اب میں کیا کروں......

کندن سیدھا چاندنی کے کالج پہنچا...... چاندنی کی بجھی بجھی آنکھوں نے اس کے دل کے درد کا حال سنا دیا۔ اس کے سرخ چہرے پر پسینے کی بوندیں چمکتی دیکھ کندن نے سوال کیا...... تم کالج کیسے آئیں ...... جیسے سب آتے ہیں...... یعنی یہ کہ پبلک بس سے...... چاندنی تم عام لڑکی نہیں ہو...... تم میری ...... وہ فوراً ہی بولی میں کیا ہوں میں جانتی ہوں کوئی خاص بھی نہیں ہوں...... وہ بولا...... دیکھو چاندنی جو کچھ ہو رہا ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں...... کل سے تم بس میں نہیں آؤ گی...... وہ کب خاموش رہنے والی تھی ...... بولی کندن میرے بابا غریب آدمی ہیں وہ ٹیکسی کے پیسے نہیں دے سکتے...... تم میرے ساتھ کالج آؤ گی نہیں...... کندن اب میں تمہارے ساتھ نہیں آسکتی۔ اب میرا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں رہا...... وہ بنا جھجک

کہہ گئی اور کندن کے دل پر ایک تیر سا لگا۔'' چاندنی کچھ ایسے رشتے ہوتے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتے ۔ خیر یہ بحث بعد میں ...... یہ بتاؤ رہ کہاں رہی ہو...... مجھے بابا سے ملنا ہے ...... وہ گھبرا کر بولی ...... نہیں تم ...... وہاں نہیں جا سکتے ...... بابا کسی سے ملنا نہیں چاہتے ...... کندن نے چاندنی کا ہاتھ پکڑا ...... گاڑی میں بٹھایا ...... ایڈریس پوچھا ...... پہلے اپنے موبائل فون پر ماں کو بابا کا ایڈریس بتایا اور گاڑی دوڑا دی۔

'' کندن ۔ بابا رات بھر نہیں سوئے ۔ وہ بہت غمزدہ ہیں ۔ انہوں نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا ...... صبح کی چائے پڑی ٹھنڈی ہو گئی ...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ...... اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں بالکل تنہا بے سائبان رہ جاؤں گی ۔ کندن نے اسے گہری گہری نظروں سے دیکھا ۔ چاندنی کا بکھرا بکھرا حسن غضب ڈھا رہا تھا۔ ...... وہ تو دیوانہ ہوا جا رہا تھا ...... وہ اس کی بانہیں پکڑ کر کہنا چاہتا تھا کہ تم میری ہو لیکن اسے ماں کو دیا وچن یاد آ گیا ...... سنبھل کر بولا ...... مس صبا خان ...... تمہیں میرے پیار پر اور مجھ پر یقین کیوں نہیں آتا ...... خدانخواستہ اگر تم پر کبھی کوئی مشکل آ بھی جائے تو تم ہمیشہ مجھے اپنے قریب پاؤ گی ...... وہ اپنا نام سن کر چونکی ...... اور حیران ہو کر بولی تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھ سے محبت کرتے رہے۔ ...... وہ ہنسا ...... کرتا رہا اور کرتا رہوں گا ...... سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں دلوں کے رشتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

جب موٹر ایک بڑے سے مکان کے سامنے رکی تو کندن نے حیرت سے چاندنی کو دیکھا اور کہا ...... بھئی محلوں میں رہنے والی کو ہماری یاد کیوں آئے گی ...... وہ روٹھ کر بولی ...... پیار کرنے والوں کو محلوں میں نہیں دل میں بسایا جاتا ہے۔

وہ آنکھیں جو کندن کو دیکھنے کو رات بھر کھلیں رہتی تھیں ...... جنہیں ہر آہٹ پر صرف کندن کا انتظار تھا اسے دیکھتے ہی دوسری جانب پھر گئیں ۔ بابا نے کندن کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے چاندنی کی طرف دیکھ کر بڑے غیظ وغضب کا مظاہرہ کیا۔ ترشی سے بولے ...... ان دولت منداعلی طبقے کے لوگوں کو اپنی دولت سب سے پیاری ہے۔ ان کے دل محبت کے پاک جذبوں سے بالکل خالی ہیں۔ ان کے اونچے اونچے میناروں والے محلوں میں ہم جیسے غریبوں کے لیے جگہ نہیں ...... ان کی بھیگی آنکھوں میں آزردگی دیکھ درد سے کندن کا انگ انگ چیخ پڑا ...... آپ نے مجھے اتنے جتن اور پیار سے پالا ۔ جو محبت مجھے آپ نے دی وہ ایک بیٹے کو صرف اپنے باپ کے علاوہ کبھی کہیں سے نہیں مل سکتی ...... اور آپ مجھے یوں چھوڑ کر چلے آئے جیسے میں آپ کا کچھ بھی نہیں ہوں۔ کیسے آپ ۔ نے وہ گھر چھوڑ دیا جس میں اپنی زندگی کے بیس سال آپ

صرف محبت کے پھول بکھیرتے رہے۔ کیا اس گھر پر آپ کا کچھ بھی حق نہیں ہے...... جانتے ہیں آپ اپنے پیچھے اداسی ہی اداسی چھوڑ آئے ہیں۔ گھر کا ذرہ ذرہ آپ کو صدا دے رہا ہے۔ اور میں آپ کے بنا بالکل نا مکمل اور ادھورا ہوں...... آپ کو میرے ساتھ جانا ہی ہوگا۔ کیونکہ میں آپ کے بنا واپس نہیں جاؤنگا...... کندن کے آنسوؤں سے بابا کے دونوں پاؤں بھیگ گئے...... بابا کی پہلی شب کندن کے بغیر قیامت کی طرح گذری تھی۔ رات بھر دل میں درد کا طوفان اٹھتا رہا تھا۔ انہوں نے کندن کو اٹھایا...... اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔...... ارے میں کونسا تمہارے بغیر جی لونگا...... رات بھر تمہارے خیال نے سونے نہیں دیا...... ایک رات کاٹنی دشوار ہوگئی۔ ان کا رندھا گلا اور درد بھری بھاری آواز بتا رہی تھی کہ وہ بھی بہت روئے تھے۔ آنسو اب بھی ٹپک رہے تھے...... ''تمہاری ماں کیسی ہیں'' انہوں نے پوچھا......

اسی وقت ماں نے بابا کی کوٹھری میں قدم رکھا...... کندن بولا...... ماں بابا کو گھر لے چلو...... نیرجا...... نیرجا...... نیرجا...... اس کی چیخ کے ساتھ ہی وہ آواز گونجی جو میرے اندر ہلچل مچادیتی تھی۔ اور آج اس گونج نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا...... میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا...... وہاں بابا کے سوائے کوئی نظر نہیں آیا...... پھر میری آنکھیں ٹھہری گئیں۔ اچانک اتنی لمبی جدائی...... اتنے طویل عرصے کے بعد انہیں سامنے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہیں ہوا...... میں حیرت انگیز نظروں سے بت بنی کھڑی اس مسراہٹیں پھیلاتے چہرے کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہی آنکھیں بالکل وہی چمکتی...... محبتؔ چھلکاتی آنکھیں...... ان کی نظریں بھی میرے چہرے پر سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں...... اف...... میرے خدا...... بیس سال...... یہ تھے مالی کے بھیس میں، میرے اتنے قریب اور میں اندھیروں میں بھٹکتی ان کا انتظار کرتی رہی...... میرے اندر کا طوفان ٹھہر گیا...... برسوں کا اکٹھا درد و غم پل بھر میں دور ہوگیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر کہا...... تمہارا مالی بابا...... کندن فوراً ہی ہم دونوں سے آکر لپٹ گیا...... اچانک خوشیوں کے دروازے کھلے تو ہماری آنکھوں سے خوشیوں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ کندن بولا...... بابا خون کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے...... وہ ہنس کر بولے...... ہر رشتہ پیار کا ہو یا خون کا مضبوط ہوتا ہے۔ میری طرف دیکھ کر بولے...... میں طرح طرح کی آواز نکالنے میں ماہر ہوں...... اس لئے کوئی مجھے پہچان نہیں سکا...... تم بھی نہیں...... تم ایک بار میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھتی تو تمہارے خواب نظر آتے...... میں نے کہا آپ جو مجھے دے گئے تھے میں نے اسے ہی اپنا مقدر مان لیا تھا۔ میں تو جدائی کے عذاب

میں سلگتی رہی...... آخر مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی تھی جو آپ نے مجھے اتنی سخت سزا دی...... بیس سال کی لمبی جدائی...... وہ بولے غلطی نہ تمہاری تھی نہ میری...... بس ہماری قسمتوں میں جو لکھا تھا اسے تو ہونا ہی تھا...... وہی پرانی خاندانی دشمنی کا سلسلہ چل رہا تھا...... وہ لوگ میرا کام تمام کرنا چاہتے تھے۔ رحیم چاچا کو ان کی خوفناک سازش کا پتہ چلا تو فوراً ہی مجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔ گو کہ چاچا نے تمہاری حفاظت کا معقول انتظام کر دیا تھا پر میرے دل کو کسی حال تسلی نہیں ہو رہی تھی...... سو مجھے شیام لال بن کر تمہارے پاس جانا پڑا...... پھر کندن پیدا ہوا...... تو میری ذمہ داری اور بڑھ گئی...... دروازے پر بیٹھا تم دونوں کو دیکھتا رہتا...... تم دونوں ہی تو میری دنیا تھے۔ اور میں اپنی اس دنیا میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ ہاں تمہارے آنسو مجھے بے چین کرتے رہتے تھے۔ جی چاہتا تھا جو آنکھیں مجھے دیکھنے کو ترس رہی ہیں ان کے خواب لوٹا دوں...... پر اس وقت تک میری جان خطرے میں تھی۔

جب حالات کچھ سدھرے تو سوچا اب ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن قسمت کو منظور ہی نہ تھا کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہیں۔ چاندنی کی ذمہ داری نے آگے نہ بڑھنے دیا...... چاندنی کی ماں رحیم چاچا کے دوست کی بیٹی تھی اور مجھے سگی بہن کی طرح عزیز تھی۔ بڑے گھرانے کی تھی پر قسمت پھوٹی...... شوہر نے قدر نہیں کی...... اس غم میں ڈوب گئی...... رحیم چاچا کا فون آیا کہ میں فوراً اس سے ملوں...... جس رات میں اس سے ملنے گیا وہ رات اس کی آخری رات تھی...... چاندنی کو میرے حوالے کرتے ہوئے بڑی شکستہ اور ٹوٹے لفظوں میں بولی تھی...... آپ اپنی بیٹی کو سنبھالیئے۔ میں جا رہی ہوں...... پھر الفاظ ہی مٹ گئے۔ میں کھڑا دیکھتا ہی رہ گیا...... وہ اپنی زندگی کی آخری ہچکی لے کر دم توڑ چکی تھی...... میں چاندنی کو لے کر یہاں آ گیا۔ مجھ پر رحیم چاچا کے ڈھیر سارے فرض واجب تھے۔ جو ادا کرنے تھے۔ ان کا کہا میں ٹال نہیں سکا...... میرے اندر ایک جنگ جاری رہی...... ایک طرف میری پھلواری تھی اور دوسری جانب ایک یتیم بے سہارا بچی...... اس جنگ میں اگر فرض ہار جاتا تو میرا ضمیر مجھے ساری زندگی ملامت کرتا رہتا...... میرا فیصلہ بڑا ہی جان لیوا تھا...... ایسی جنگ میں انسان ہمیشہ اپنوں پر ہی بڑا ظلم ڈھاتا ہے۔ میں نے بھی اپنے بیٹے اور اپنی بیوی کے ساتھ بڑی بے انصافی کی تھی...... دونوں کی زندگیوں کے قیمتی سال اور سنہرے سپنے برباد کر دیئے...... تمہارے دل کا امن و سکون غارت کر دیا تھا...... لیکن میں مجبور تھا......

میں نے کہا آپ تو اگر بتی کی طرح چپ چاپ آہستہ آہستہ ساری زندگی جلتے رہے اور محبت کی

مہک پھیلاتے رہے...... وہ بولے قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں...... محبت ہی تو ایک ایسا خزانہ ہے جسے جتنا لٹاؤ کبھی خالی نہیں ہوتا...... پھر کیوں نہ اس دولت کو دل کھول کر لٹایا جائے...... جس انسان کے دل میں پیار نہیں وہ ایک پتھر کی مانند ہوتا ہے...... جس پر نہ پانی کی ایک بوند ٹکتی ہے اور نہ ہی ہریالی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ بنجر اور پیاسا ہی رہتا ہے۔

ان کی ہر بات میرے دل میں اترتی چلی گئی۔ اس کی تاثیر نے مجھے پشیمان کردیا...... میں نے کندن اور چاندنی کی طرف دیکھا...... جو بظاہر پوری توجہ سے ساری باتیں سن رہے تھے...... چاندنی کی چھلکتی آنکھیں دیکھ کر میری روح بے چین ہوگئی۔ میں اس کے قریب گئی...... دونوں بازو پھیلا دیئے اور وہ میرے بازوؤں میں سما گئی۔ میرا دل ممتا سے بھر گیا...... میں نے کہا اب تو فیصلہ کرنے کا وقت ہے رونے کا نہیں...... تم بالغ ہو اور تم کو اپنی زندگی کا فیصلہ خود ہی کرنا ہوگا۔ فیصلہ بھی ایسا کہ بعد میں تمہیں پچھتانا نا پڑے...... اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا...... مسکرائی...... پلکیں جھکا دیں...... اور پھر سر جھکا دیا...... کچھ بھی نہ کہا اور سب کچھ کہہ گئی...... میرے دل کو تسکین ہوگئی...... میں نے اس کا ماتھا چوما...... اور کہا چلو بیٹا اب اپنے گھر چلیں......

میں نے بڑے فخر سے آیوش کو دیکھا جن کی ایک شخصیت میں انیک شخصیتیں نہاں تھیں...... آیوش اور کندن کے چہروں پر بکھری خوشیاں دیکھ کر میری دنیا جگمگا اٹھی...... کوٹھری میں نور ہی نور چھا گیا......

کندن نے اپنے بابا کا ہاتھ پکڑ کر کہا...... بابا اب گھر چلیں...... حویلی کی مٹی کی سوندھی خوشبو ہم سب کی سانسوں میں بسی ہے۔ ہماری ساری خوشیاں...... ساری یادیں اس گھر سے جڑی ہیں...... میری آنکھوں میں وہی پھولوں سی سجی کشتی جو برسوں غموں کے سمندر میں...... تیز وتند ہواؤں کا مقابلہ کرتی...... موجوں سے ٹکراتی...... ہچکولے کھاتی...... ڈوبتی ابھرتی...... آن سمائی...... آج پھر وہ میرے بہاروں کے دیس کی طرف بہہ رہی تھی...... آگے بڑھ رہی تھی...... جہاں پھول برستے تھے۔ جہاں پیار تھا...... سکون تھا۔ ہر پھول کو اپنے مالی بابا کا انتظار تھا

☆☆☆

ایک مضبوط سائبان

یوں بھی ہمارے گھروں میں لڑکی کی پیدائش منحوس ہی سمجھی جاتی ہے۔ پنڈت اوم پرکاش کے گھر میں جب چھوٹی سی گڑیا نے پہلی سانس لی تو اس ہی دم بچی کی ماں نے آخری ہچکی لی۔ پنڈت جی کے پاؤں تلے زمین الٹ گئی۔ ماتمی ماحول میں صرف ایک ہی آواز گونجی۔...... ہائے ہائے بیچارے پنڈت جی لٹ گئے۔ اولاد کی آس میں بیوی کھو بیٹھے۔ منحوس لڑکی چھوٹے نصیب لے کر آئی ہے۔ آتے ہی ماں کو ڈس گئی۔ اور باپ کو بھی جیتے جی مار ڈالا۔

جس کے منھ میں جو آیا بولتا ہی گیا۔ جب پنڈت جی کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو سب کو بلا کر بولے بھئی موت اور زندگی تو بھگوان کے ہاتھوں میں ہے۔ پھر آپ سب میری معصوم بچی کو کیوں مجرم ٹھہراتے ہو۔ ارے یہ تو سنجیونی ہے۔ سنجیونی...... اسے بھگوان نے میرے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔ تاکہ اسے دیکھ دیکھ جی سکوں۔...... میری سیتا کی نشانی ہرگز منحوس اور بدبخت نہیں ہوسکتی۔ قسمت بھی بھگوان ہی لکھتا ہے۔ کون جانے کل کیا ہو جائے۔ اس بچی کو بُرے بُرے نام نہ دو۔ ارے بیٹیاں تو گھر کی لکشمی ہوتی ہیں۔ لکشمی...... اور تم لڑکیوں کو منحوس سمجھتے ہو۔

سیتا کی موت کے بعد بہت جلد ہی نئے رشتے آنے شروع ہوگئے۔ پنڈت جی بولے ......سوتیلی ماں...... نا بابا ناں...... وہ میری بچی کی زندگی میں زہر گھول دے گی۔ اپنی بیٹی کی پرورش کرنے کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ پال لوں گا کسی طرح...... ماں اور باپ دونوں کا پیار دوں گا۔ پنڈت جی خود بھی اس خطرناک راہگزر کے مسافر رہ چکے تھے۔ وہ بھولے نہیں تھے کہ ان کا بچپن ان کی سوتیلی ماں کی کڑی نگاہوں کے نیچے کیسے گزرا تھا۔ دن بھر ناک میں نکیل ڈالے رکھتی تھی۔ نہ کھانا اپنی مرضی کا نہ سکون سے سونا نصیب ہوتا تھا۔ کتنی آسانی سے دنیا بھر کے الزام ایک دس سال کے بچے کے سر لگا کر خوب مار پیٹ کرتی تھی۔ اگر باپ کو بتایا تو گھر سے باہر نکالنے کی دھمکی دی جاتی تھی۔ دادی اماں کسی طرح مجھے بچاتی تھی۔ میری بچی کو سوتیلی ماں کے پنجوں سے کون بچائے گا۔ نہ دادی ہے نہ نانی۔

پنڈت جی کا کام تھا مندر سنبھالنا اور گھر گھر جا کر پوجا پاٹھ کرنا۔ شادی ہو یا موت ہر خوشی اور غم کے موقع پر پنڈت جی کو بلایا جاتا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ محلے کے ہر خاندان کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ محلے

والے پنڈت جی کا بڑا مان سمان کرتے تھے۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے فصل غربت میں سب دوست بدل جاتے ہیں۔ پنڈت جی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ جب وہ آفتوں میں گھرے تھے تو سب نے نظریں پھیر لیں۔ ساری دنیا بیگانی ہوگئی ۔مگر پنڈت جی نے ہار نہیں مانی۔

دو پہئیوں پر دوڑنے والی زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ ٹوٹ جائے تو یکا یک گاڑی تھم جاتی ہے۔ پنڈت جی مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرتے رہے۔ اور اپنی زندگی کی گاڑی کسی طرح ایک پہیے پر گھسیٹتے رہے۔ آخر حالات نے انہیں پست کر ہی ڈالا۔

مصیبت کے وقت کوئی مسیحا تو بن نہ سکا...... اڑوسیوں پڑوسیوں نے جب انہیں ٹوٹتے بکھرتے دیکھا تو ہمدردی جتانے پہنچے۔ اور اپنے اپنے مشوروں سے نوازا...... یوں مرمر کر جینا بھی کوئی جینا ہے۔ تمہاری اس سونی زندگی میں ایک مسکراتی ہوئی بہار کی ضرورت ہے۔ پنڈت جی نے کہہ دیا میں جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں۔ کسی نے کہا اپنی پرانی یادوں کے قافلوں میں کب تک بھٹکتے رہوگے۔ اس سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈو...... وہ بولے تم لوگ دل کے سودے کی باتیں کرتے ہو...... میرے اندر جو دل ہے وہ مر چکا ہے۔ میں بھلا ان نئی بہاروں کو کیسے سنبھالوں گا۔ میرے ٹوٹے دل سے پیار کی دھن نہیں صرف آہیں نکلتی ہیں۔ جہاں پیار نہ ہو وہاں کوئی رشتہ پنپ نہیں سکتا...... میں کسی لڑکی کی زندگی تباہ نہیں کرونگا۔

وقت بڑا ظالم ہے کسی پر رحم نہیں کرتا۔ وقت کے دریا کے ساتھ ساتھ پنڈت جی کے حوصلے بھی ریت ہوکر بہنے لگے۔ فکروں اور مایوسیوں کے بوجھ تلے دبا جسم کمزور ہوگیا۔...... لوگوں نے پھر سمجھایا ...... جوان ہو...... اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ...... تندرستی سب سے بڑی دولت ہے۔ ایک بار بگڑ جائے پھر سنبھالے نہیں سنبھلتی...... اتنے عرصے کے بعد بھی آپ کا غم جوں کا توں ہی ہے...... جیوں جیوں وقت گزر رہا ہے آپ کی مایوسی بھی بڑھتی جارہی ہے...... مایوسی دنیا کی سب سے بڑی بری ہے۔ مایوسی موت کا م دوسرا نام ہے۔ کبھی سوچا اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو آپ کی اس ننھی سی بچی کا کیا ہوگا۔

یہ سن کر پنڈت جی گھبرائے تو بہت لیکن دل میں سوتیلی ماں کا خوف اتنا زبردست تھا کہ وہ نیا بندھن باندھنے کو ہرگز راضی نہ ہوئے بولے میرے گھر کے اوپر غموں کے کالے بادل چھائے ہیں۔ جو آئیگی وہ اس اندھیرے گھر میں کیا پائے گی...... نہیں...... میرے تاریک دل میں اب کسی کے لیے ذرا بھی گنجائش باقی نہیں۔

وقت اور بیتا اور آہستہ آہستہ پنڈت جی کا روزگار بند ہونے لگا۔......گھر میں پوجا پاٹھ کرتے رہے۔ اور اپنی بچی کو پالتے رہے۔ بچی کو اکیلا چھوڑ کر باہر جانا ممکن نہ تھا۔ سو گھر گھر جا کر پوجا پاٹھ کرنے کا سلسلہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔ جمع پونجی بھی ختم ہو گئی۔...... پنڈت جی کا اپنا سگا تو کوئی تھا ہی نہیں اگر کوئی سچا ہمدرد ہوتا تو ان کی اتنی درگت نہ ہوتی

آخر پنڈت جی زمانے کی گردشوں سے ہار گئے۔ تاب و تواں جاتا رہا تو انہیں سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جگدیش شرما کو اپنی بڑی بیٹی پار لگانا تھی۔ فوراً پنڈت جی کی مدد کرنے پہنچے......انہیں یقین دہانی کرائی کہ ان کی بیٹی گنگا سنجیونی کو سگی ماں کا پیار دے گی۔ پورے احتیاط سے اس کی پرورش کرے گی اور آپ کی زندگی میں نئی جوت جگا دے گی...... پھر اور لوگ بھی آئے۔ پنڈت کو سمجھایا کہ اب پرانی کہانی ختم کرو۔ بہت سوگ منا لیا......اب اپنی زندگی آگے بڑھاؤ۔

پنڈت جی تو خود فاقے برداشت کر لیتے مگر جب بچی کا خیال آیا تو مصیبتوں کے گرداب میں پھنسا مجبور باپ بے بس ہو گیا۔ اور جو نا کرنا چاہتے تھے وہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بھگوان نے سنجیونی کے مقدر میں جو بھی لکھا ہو وہ تو وہی جانتا تھا۔ اس کے باپ کی بے بسی نے اپنی چھوٹی سی بچی کے گلے میں سوتیلی ماں کی غلامی کا بھاری طوق ڈال دیا۔

جب پنڈت جی نے بچی کو گنگا کی گود میں یہ کہہ کر ڈالا کہ آج سے تم ہی اس کی ماں ہو، بھگوان کے بعد انسانوں پر سب سے زیادہ مہربان ماں ہوتی ہے۔ میری بچی کو ماں کی ممتا سے محروم نہ کرنا۔ یہ بچی مجھے بہت پیاری ہے۔ اپنی جان سے بھی زیادہ۔ اسے پیار دو گی تب ہی میرے دل پر راج کر پاؤ گی۔

یہ سنتے ہی گنگا کے دل سے جگر تک ایک آگ سی پھیل گئی۔ ایک عجب سی نفرت اور کراہیت کا احساس جاگ اٹھا۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا......اگر میں ایسا نہ کروں......تو......میں اس شادی کے خلاف تھی۔ مگر کسی نے میری بات پر ذرا سا دھیان نہیں دیا......گائے کی طرح مجھے بھی لا کر اس کے کھونٹے سے باندھ دیا اور یہ اپنی اولاد کا بوجھ میری گردن پر ڈال رہا ہے......وہ یہ سوچ سوچ کر رو پڑی......بچی کے ماتھے پر اسکے آنسو ٹپ ٹپ گرنے۔ بچی بلک بلک کر رو پڑی......فوراً بچی کو پنڈت جی نے اٹھایا اور باہر بہلانے لے گئے۔ کتنے ڈھیر سارے......کیسے کیسے پیارے پیارے سپنے دیکھے تھے اس نے سہاگ رات کے......گنگا کی یہ پہلی رات بچی کو سنبھالنے میں ہی بیتی......اسکا جی تو کر رہا تھا ساری دنیا کو جگا دے زور زور سے چلائے......سب کو بتائے......دیکھو......آج میری شادی ہوئی ہے اور میں ایک دو

سال کی بچی کی ماں بھی بن گئی...... یہ بھی بھگوان کا کرشمہ ہے...... ہے کوئی مری جیسی بدنصیب...... اُسے اپنے نصیب پر رونا آ گیا......

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ اٹھی...... باتھ روم جا کر اُس نے اپنی شادی کی ساڑی اتار پھینکی۔ ایک سادہ سی کوئی ساڑی پہنی...... جو تھوڑا بہت زیور تھا اُسے اتار کر ایک پوٹلی بنائی اور سب کچھ الماری میں بند کر دیا......اور نفرتوں سے بھرا اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کر دیا......

دوسرے دن اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر خوب روئی...... باپ نے بیٹی کو سمجھایا...... پیار سے تو پنڈت کا دل جیت لے گی۔ اس نفرت کو دل سے نکال دے۔ پیار کرنا سیکھ...... یہی تو سب سے آسان کاروبار ہے۔ پیار دو پیار لو......

کچھ مہینے گنگا نے خاموشی سے باپ کی بات پر عمل کیا۔ اور بھولے پنڈت کو یقین دلایا کہ وہ سنجیونی کو ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح چاہے گی...... پنڈت جی کے دل پر سے ایک بھاری بوجھ کھسکا تو دل کو قرار اور صبر آ گیا۔ وہ بھلے آدمی تھے حسب عادت پھر غیروں کے مسائل حل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر گھر جا کر پوجا پاٹھ کرنے کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔

پنڈت جی کی عدم موجوگی میں گنگا نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا۔ بچی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتی...... نہ اُسے وقت پر دودھ دیتی۔ نا اُس کی صفائی کا خیال رکھتی۔ کبھی گود میں اُٹھا کر سینے سے نہیں لگاتی تھی۔ بچی بھوک سے بلکتی تو کھانا دینے کے بجائے اُسے دو چار تھپڑ اور رسید کر دیتی...... بس پنڈت کے کہے لفظ دہراتی...... اسے پیار کرو گی تو میرے دل پر راج کرو گی...... چیخ پڑتی...... نہیں کرنا مجھے اس بڈھے کے دل پر راج...... نہیں کرونگی پیار کسی سے نہیں...... کبھی نہیں...... دھیرے دھیرے نفرت کا احساس بڑھتا ہی گیا اور وہ حسد کی آگ میں جلتی بھنتی رہی۔

پنڈت جی کو اس حقیقت کا پتا اُس دن چلا جب وہ اچانک گھر لوٹے...... بیٹی کے رونے کی آواز سن کر دریچے کے پاس ہی رک گئے۔ جھانک کر اندر دیکھا...... تو خون اُبل گیا۔ گنگا اُن کی لاڈلی کو بڑی بیدردی سے مار رہی تھی۔ سہمی بچی زمین پر گٹھری بنی بیٹھی تھی اور ماں کو دیکھ دیکھ رو رہی تھی۔ وہ اندر دوڑے......تب ہی گنگا نے بچی کو مارنے کے لیے لات اٹھائی تھی یہ دیکھ وہ بلبلا اٹھے...... غیض وغضب سے چلائے...... بند کرو...... پنڈت جی کا بس نہ چلا گنگا کو دھکے مار کر گھر کے باہر پھینک دیتے۔ انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ان کی بیٹی پر یوں ظلم ہو گا۔ وہ اس طرح پاؤں تلے روندھی جائے گی...... کتنے مجبور

تھے وہ...... بس ہاتھ ملتے رہ گئے...... روتی بلکتی بچی نے باپ کو دیکھا تو اور چیخی...... باپ نے بیٹی کو اٹھایا...... سینے سے لگایا...... گنگا سے بولے...... خبردار جو آئندہ تم نے ایسی نیچ حرکت کی...... میں تمہارے ہاتھ پیر توڑ ڈالونگا۔ ایک بے ماں کی معصوم بچی پر ظلم ڈھاتے تمہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ بھگوان سب دیکھتا ہے۔ تمہارے سینے میں عورت کا دل نہیں ایک پتھر کی سل ہے۔ کتنی سخت گیر اور احمق عورت ہو تم۔ رشتے اور تعلق نبھانے بالکل نہیں آتے۔ تم نے اس بچی کو جنم نہیں دیا مگر یہ ہے تو میری بیٹی...... تم یہ کیسے بھول گئی کہ میری زندگی سے تمہاری زندگی بندھی ہے۔ آئندہ ہمیشہ یاد رکھنا میری بیٹی میری زندگی ہے...... انہوں نے بچی کو کئی بار چوما...... اُسے پچکارا اور اندر چلے گئے۔ بچی سہم گئی تھی۔ شدید خوف کی وجہ سے اُسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا یہ کسی وجہ سے خوفزدہ ہے۔ اگر اس کے دل سے خوف نہیں مٹایا گیا تو دماغ پر بُرا اثر ہوسکتا ہے۔ آج پنڈت جی کے دل پر ایسی گہری ضرب لگی تھی کہ پُرانے زخموں کے سارے منھ کھل گئے تھے۔ کاش...... تم ہوتیں...... تو آج ہماری بچی کا یہ بُرا حال نہ ہوتا۔ ہے بھگوان مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ میں تو ہردم تیرا ہی نام جپتا ہوں...... مجھے بس تیرا ہی آسرا ہے...... انسان تھے...... جی بھر آیا تھا...... وہ اپنی بدنصیبی پر رونا چاہتے تھے۔ مگر وہ بھی نہ کر سکے...... بس کسی طرح اپنے کو ضبط کر کے سوچنے لگے۔ جس شجر پر ایک بار بجلی گر جائے وہ پھر سرسبز نہیں ہوسکتا...... یہی سوچ کر اپنے مقدر پر صبر کر لیا۔

مار پیٹ تو بند ہو گئی لیکن زبان کے کوڑے چلتے رہتے۔ گنگا اب پہلے سے بھی زیادہ لاپروا ہو گئی...... جانتی تھی پنڈت کو اس کی ضرورت تھی...... خیر تو یہ ہوئی کہ کچھ دنوں بعد ہی گنگا نے بھی ایک بیٹی کو جنم دیا...... روپا کیا آئی سارا ماحول ہی بدل گیا...... دوسری بیٹی کو دیکھتے ہی پنڈت جی خوش ہو گئے اور ان کی ناراضگی بھی کم ہو گئی تھی...... سنجیونی کو کھیلنے کے لیے ایک ہنستی روتی جیتی جاگتی گڑیا مل گئی...... وہ پلنگ کے پاس بیٹھی ٹکر ٹکر اپنی چھوٹی بہن روپا کو دیکھتی رہتی۔ دوڑ دوڑ کر اُس کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی تھی۔

روپا کے کھلونے دیکھ کر پنڈت جی ہکا بکا رہ گئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا روپا کے ماموں نے بھیجے ہیں۔ پنڈت جی کا دل تو چاہتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں لا کر اپنی ننھی منّی بیٹی کے قدموں میں ڈھیر کر دیں...... لیکن جب جب کوئی اچھی چیز سنجیونی کے لیے لاتے گنگا کی چیخ پکار سے گھر کی چھت زمیں پر آگرتی...... پھر کچھ اور لانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

اب سنجیونی کے اسکول جانے کی عمر ہو گئی تھی۔ پنڈت جی تعلیم کی قدر جانتے تھے اور سنجیونی کو اچھے اسکول میں بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر گنگا راضی نہیں ہوئی...... پھر ہماری دو دو بیٹیاں ہیں۔ اگر سارا پیسہ

بڑی کے اوپر ہی لٹا دینگے تو چھوٹی کے لیے کیا بچ رہے گا...... ان کی شادیوں کے لیے بھی بچانا ضروری ہے۔ صرف اچھی صورتیں دیکھ کر ہی ان کے بیاہ نہیں ہو جائیں گے۔ آج کل سب جہیز مانگتے ہیں۔ اب چاندی کے زیورات کی کوئی وقعت ہی نہیں رہی۔ سب کیش اور سونا چاہتے ہیں۔

جہیز...... وہ کیوں...... میں نے دو شادیاں کیں کسی سے کچھ نہیں مانگا اور نا ہی کچھ لیا...... وہ بولی ایک تو مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے اور پھر انسان لالچی بھی بہت ہو گیا ہے...... جو چیز خریدنے کو دل چاہتا ہے اگر نہیں پا سکتے تو لڑکی کے باپ سے مانگتے ہیں۔ اگر نہ دو تو لڑکیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ مار پیٹ تک تو کم ہی ہے جلا بھی دیتے ہیں۔ گنگا نے ایسا نقشہ کھینچا کہ پنڈت خاموش ہو گئے۔ وہ پھر بولی اگر پہلا لڑکا ہوتا تو چاہے ہمیں فاقہ کشی کرنی پڑتی اُسے اچھے اسکول ضرور بھیجتے کیونکہ لڑکے کو قابل روزگار بنانا ضروری ہوتا ہے۔ یہی ہمارے سماج کی ریت ہے۔ مرد کماتے ہیں اور عورتیں گھر سنسار چلاتی ہیں۔ سرکاری اسکول میں پڑھ کر وہ گھر کا حساب کتاب رکھنے کے لائق تو ہو ہی جائے گی۔ اور کون سے ہماری بیٹیاں کسی رئیس کے گھر جائینگی جو لمبے چوڑے حساب سنبھالنے پڑینگے۔ میں بھی تو اسکول نہیں گئی...... آپ کا گھر ڈوب تو نہیں گیا۔

پنڈت جی بولے ایک تعلیم یافتہ ماں ہی اپنے بچوں کو اچھی پرورش اور اچھی تربیت دے سکتی ہے۔ انپڑھ ماں اپنی اولاد کو کیا گیان دے گی۔ اگر تم پڑھی لکھی ہوتیں تو تمہارا ذہن بھی روشن ہوتا۔ تمہاری سوچ بھی بڑی ہوتی۔ میری بیٹی سے کام لینے کے بجائے اُسے کچھ پڑھاتیں کچھ سکھاتیں اور خود اُسے اسکول میں بھرتی کرواتیں۔

آخر پنڈت جی کو ہار ماننی پڑی۔ غصہ تو انہیں جب آیا جب روپا کو انگلش اسکول بھیجا گیا اور پھر یہ بھی کہا کہ روپا کی فیس ماموں دینگے...... ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں...... پنڈت جی روز روز کے جھگڑوں سے بیزار ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کچھ ہو جائے گنگا بدلے گی نہیں۔ اور شور شرابا کرنے سے بات گھر سے نکلی تو کوٹھوں پہنچے گی...... وہ پھر خاموش ہو بیٹھے...... روپا دل کی صاف تھی پر تھی بڑی شوخ اور چنچل جبکہ سنجیونی سنجیدہ اور خوش مزاج تھی۔ گنگا اُسے بے انتہا ستاتی تھی پر اُس کے منہ پر شکن نہ آتی تھی...... پنڈت جی اُسے دیکھتے اور من ہی من میں سوچتے...... یہ تو بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ سمجھدار اور شانت طبیعت کی۔

گھر کے کام کاج میں سنجیونی ماہر تھی۔ جب اُس کے ہاتھوں کے پکائے کھانے کی تعریف ہوتی تو گنگا اندر ہی اندر جل اٹھتی۔ پنڈت جی کہتے...... روپا کو بہت ڈھیل نہ دو۔ اُسے بھی سکھاؤ...... سنجیونی سے

کہتے اس پر نظر رکھا کرو۔ ابھی بھی وقت ہے ورنہ سسرال والے کہیں گے تیری ماں نے چھوٹی بیٹی کو کچھ نہیں سکھایا...... گنگا۔ بدنامی ہماری ہی ہوگی۔

پنڈت جی شہد کی مکھی کے چھتے کو چھیڑ کر چل دیتے اور گنگا سنجیونی کو کاٹ کھانے کو دوڑتی...... پھر ایک منٹ اُسے چین سے نہ بیٹھنے دیتی۔ اُس کے ہر کام میں مین میخ نکالتی اور ساتھ ساتھ ہزاروں باتیں بھی سناتی جاتیں۔ دیدی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر روپا ماں سے جھگڑ پڑتی...... اماں...... بس بھی کرو...... میری پیاری سی دیدی کومت ستاؤ۔ تم انہیں ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں تو ان کی شادی کردو۔ کم سے کم وہاں چین کی سانس تو لے پائیگی...... اس گھر میں تو ان کا حال ایک زرخرید غلام سے بھی بدتر ہے...... اماں اگر میری سسرال میں میرے ساتھ ایسا سلوک ہوگا جیساتم دیدی کے ساتھ کرتی ہوتو تمہیں کیسا لگے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو تمہارے اس عظیم گناہ کی سزا مجھے بھگتنی پڑے...... اماں چڑ جاتیں چیخ کر کہتیں...... جو تیری قسمت میں لکھا ہے وہ تو مجھے بھوگنا ہی پڑے گا...... شادی کردو...... کہنا آسان ہے...... کتنے ہی لڑکے آئے اور دیکھ کر چلے گئے۔ آیا کوئی واپس...... کہہ دے وہ بھی میرا ہی دوش ہے۔ تیرے باپ کے پاس جہیز دینے کے لئے رقم ہی کہاں ہے...... بنا نقدی کے شادی نہیں ہوتی...... تو بہت بولنے لگی ہے۔ مجھے سبق نہ پڑھایا کر۔

باپ کے لیے ایسے توہین آمیز الفاظ سنکر روپا اُبل پڑی...... میرے پتا جی جو بھی کماتے ہیں تمہاری ہی ہتھیلی پر رکھتے ہیں...... مالک بنی بیٹھی ہو...... اماں آپ سب کو ایک ہی چھڑی سے ہانکتی ہیں۔ پتاجی کی اتنی عزت اور مان ہے۔ میرے پتاجی کے لئے تمہاری زبان سے نکلے یہ نازیبا الفاظ اچھے نہیں لگتے۔ پتاجی سنیں گے تو کتنے دکھی ہونگے۔

جو بات پنڈت جی کے دل میں برسوں سے کھٹک رہی تھی اور کہہ نہیں پا رہے تھے آج روپا نے بڑی آسانی سے اپنی ماں سے کہہ ڈالی تھی...... اماں دانت پیستی رہ گئیں...... جانتی تھیں آگے کچھ اور بولا تو روپا برداشت نہیں کرے گی۔ اور اگر باپ سے کہہ دیا تو......

روپا کالج سے لوٹی تو دیدی کو ڈھونڈھتی اماں کے کمرے میں گئی۔ اماں دیدی کہاں ہے...... اماں حسب عادت جھلس کر بولیں...... میں کیا جانوں...... ہو گی کہیں...... میں کوئی اس کی رکھوالی کرتی ہوں...... وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ اماں پھر وہی...... کبھی تو ٹھیک سے بات کرلیا کرو۔ تم تو دیدی کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھتی ہو۔

دیدی دالان میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی...... دیدی...... بند کرو یہ کتاب...... ارے...... مجھے

کیا ہو گیا۔ دیدی نے سوال کیا۔ روپا نے اپنی دیدی کو زور سے دبوچ کر کہا...... کچھ دیر پہلے تو ٹھیک ہی تھی...... اُس نے دیدی کا ہاتھ اپنے بائیں طرف سینے پر رکھا۔ دیکھو کیسے دھک دھک کر رہا ہے...... دل دھڑکنیں اُتھل پتھل ہو گئی ہیں۔ دیدی ہولے سے مسکرائی اور بولی...... ہر وقت ہوائی جہاز کی طرح رن وے پر بھاگتی رہتی ہے۔ کبھی تو آرام سے بیٹھا کر......

ارے دیدی تم کتنی بھولی ہو...... کچھ بھی نہیں سمجھتیں......

دیدی نے سیدھا اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا...... کون ہے وہ...... وہ...... وہ...... معلوم نہیں دیدی...... سنجیونی نے حیرت زدہ اپنی چھوٹی بہن کا چہرہ دیکھا...... بولی آج کل کے لڑکے قابل اعتبار نہیں۔ کسی ایسے ویسے لڑکے...... نہیں دیدی...... وہ ایسا ویسا نہیں ہے...... دیدی نے سوال کیا...... تو کیا ہے...... وہ...... دیدی وہ کسی بڑے گھر کا لڑکا ہے...... دیدی بولی وہ تو اور بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ ذرا سوچ ایک رئیس گھر کا لڑکا ایک غریب پنڈت کی لڑکی سے کیوں شادی کرے گا...... وہ نیچی نظریں کر کے بولی۔ کیونکہ وہ مجھے چاہتا ہے...... آج ہی کالج کے باہر اُس نے ہمارا راستہ روک کر اعتراف محبت کیا......

محبت کے بعد شادی...... شادی کے لیے اُسے پتا جی کو منانا ہوگا وہ بھی اگر وہ برہمن ہوگا......

خیر جو بھی ہے...... ابھی تو خاموش ہی رہنا۔ وقت آنے پر میں سب سنبھال لونگی...... اُس نے دیدی کو پھر دبوچ لیا دیدی تم کتنی اچھی ہو...... ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... چل اب کھانا کھالے...... اور پڑھائی میں دھیان لگا۔

دونوں بہنیں باتیں کر رہی تھیں اور اماں متواتر چلائے جا رہی تھیں...... لیکن آج دونوں نے ان کی ذرا بھی پروا نہیں کی...... روپا نے اپنی پوری داستان اپنی دیدی کو سنا ڈالی۔ وہ سن کر بولی...... تری خوشیوں کے لئے میں اپنی جان لڑا دونگی...... میں بس تجھے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تیری آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آئے۔

دیدی۔ دیدی...... روپا اُسے مسلسل پکارے جا رہی تھی۔ اور وہ اپنے ہی خیالوں میں گم اپنی ساڑی استری کرنے میں محو تھی...... روپا اُس کے ایک دم سامنے آ کھڑی ہوئی...... دیدی سنا ہے شرما فیملی کی دو بیٹیوں کی شادی دو بھائیوں سے ہو رہی ہے...... کیا ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا...... سنجیونی ہنس کر بولی۔ کیسا...... یہی کہ ہم دونوں کا بیاہ ایک گھر کے دو بیٹوں سے...... پھر میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہونگی۔ ایک بات تو بتاؤ...... تمہاری شادی تو نہیں ہو رہی پھر تم نے برت کیوں رکھا...... سنجیونی بولی پتا جی پوجا کریں گے...... میں ان کی مدد کرونگی...... پرشاد کھا کر ہی کھانا کھاؤنگی۔ تو بھی آج برت رکھ لے۔ کل

تیرے پیپر شروع ہو رہے ہیں۔ میں پرشاد لے آؤنگی۔ وہ فوراً بولی ٹھیک ہے...... سنجیونی کے چہرے پر درد کی ایک لہر ابھری...... بولی...... مجھ جیسی منحوس لڑکی سے کون شادی کرے گا...... پوری برادری میں میرے لئے ایک وہ رام بھروسے ہی رہ گیا ہے...... وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی...... میں زہر کھا کر مر جاؤنگی مگر اُس رام بھروسے سے ہرگز شادی نہیں کرونگی۔

کیسی باتیں کرتی ہو دیدی...... قسمت پلٹتے دیر نہیں لگتی...... پریوں جیسی صورت والی منحوس کیسے ہو سکتی ہے۔ تمہارا راجکمار آئے گا اور اپنی راجکماری کو گھوڑے پر اڑا کر لے جائے گا...... پریوں کی شادی اچانک ایسے ہی ہوتی ہے۔ سچ دیدی تم کسی پری سے کم نہیں......

اماں نے سنا تو تلخی سے لبریز لہجے میں بولیں...... باپ کے پاس ایک پرانا بوسیدہ سا ذاتی مکان ہے اور بیٹیاں خوش فہمی کے محل میں بیٹھی راجکماروں کے سپنے دیکھ رہی ہیں۔ کل آ رہے اس کے راجکمار کا باپ...... بات پکی کرنے...... سنجیونی کا تو پورا وجود ہل گیا۔ پاؤں تلے زمین کانپی اور اُسے ایسا لگا کہ اس کے پاؤں گہری تاریک بے ترتیب زمین پر جا ٹکے ہوں۔

دیدی کا چہرہ زرد پڑتا دیکھ روپا بولی...... اماں اس لنگور کے ساتھ میری دیدی کی شادی...... توبہ...... توبہ یہ ظلم میں ہرگز نہیں ہونے دونگی...... میں ایسا شور مچاؤں گی وہ الٹے پاؤں بھاگ جائے گا...... اب میں سمجھی کیوں وہ لنگور ہمارے گھر کے چکر لگاتا تھا۔ آتا تو ہمیشہ پتا جی کی غیر حاضری میں تھا۔ یہ کھچڑی ضرور تم نے پکائی ہے۔ اماں خاموش ہو گئیں وہ اکیلے ہی یہ فیصلہ کر بیٹھی تھیں۔ پنڈت جی کو اس کی ذرا بھی خبر نہ دی تھی...... اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ روپا جو کہتی ہے کر کے دم لیتی ہے۔

دیدی کا اُترا اُترا چہرہ دیکھ روپا پھر اپنی دیدی کے پاس جا پہنچی۔...... دیدی تم اتنا ڈھیر سارا کام کیسے کر لیتی ہو۔ صبح سے شام تک کھولو کے بیل کی طرح کام میں جُتی رہتی ہو۔ ایک کام پر مامور ہوتیں تو کوئی بات تھی۔ اس گھر کا ہر چھوٹا یا بڑا کام تمہارے ہی ذمے لکھ دیا گیا ہے۔ تم تھکتی نہیں ہو...... دیدی بولی۔ اپنی گھر کے کام کر کے کوئی تھکتا نہیں۔ اگر تو بڑی ہوتی سب کام تیرے پلّے میں پڑتے...... اور میں عیش کرتی...... دل میں سوچنے لگی تو اور پتا جی ہیں نا اس لئے میں اس اٹل درد میں بھی خوش رہتی ہوں۔

لاؤ دیدی یہ ساڑی مجھے دو...... میں استری کر دیتی ہوں...... سنجیونی بولی...... تو چھوٹی سی اس چھ گز لمبی ساڑی کو کیسے سنبھالے گی...... پہلے ساڑی پہننا سیکھ لے پھر استری کر لینا...... ساڑی جل گئی تو بے بھاؤ کی گالیاں مجھے ہی کھانی پڑینگی۔ یہ ایک ہی تو اچھی ساڑی ہے میرے پاس...... خراب ہو گئی تو شادی میں کیا پہن

کر جاؤنگی۔......

اوہو...... دیدی...... تم ناحق گھبراتی ہو...... کچھ نہیں ہوگا...... اب میں اتنی چھوٹی بھی نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔ میرے ساتھ کی دولڑ کیوں کی کل شادی ہورہی ہے۔ اور یہ معمولی سی ساڑی تم شادی میں پہن کر نہیں جاسکتی...... اماں کے پاس یہی تو بنارسی ساڑیاں...... نہ جانے کس کے لئے جمع کر کر کے رکھ رہی ہیں...... میں ابھی لائی ایک عمدہ سی ساڑی تمہارے لئے۔ سنجیونی استری بند کر کے روپا کے پیچھے دوڑی...... نہیں روپا...... نہیں...... مجھے نہیں پہننی بنارسی ساڑی۔ مجھے وہ چم چم کرتی ساڑیاں بالکل پسند نہیں......

اسی وقت اماں نے لفظ چھانٹ چھانٹ کر نکالے۔ بڑے لوگوں کے گھر جارہی ہے۔ بن سنور کر جانا۔ چوٹی میں پھول ضرور لگانا...... یہ لے یہ بالیاں کانوں میں ڈال لے...... تیرے باپ نے تو تیرے لیے کچھ زیور بنایا نہیں۔ یہ میری ماں نے دی تھیں مجھے...... اسی وقت روپا بڑے طنز لہجے میں بولی...... اماں پتاجی تو کہتے ہیں انہوں نے تمہارے گھر سے ایک دمڑی تک نہیں لی اور تم کہتی ہو کہ اس گھر کی ہر چیز تمہاری ماں کی دی ہوئی ہے۔ اب یہ بتاؤ تم اپنی بڑی بیٹی کو کیا دوگی۔

چپ ہو جا...... ورنہ...... بڑی غلطی کی تجھے انگریزی اسکول بھیج کر۔ تیری زبان قینچی کی طرح چلنے لگی ہے۔ سنجیونی نے مصنوعی ہنسی ہنس کر اس آفت کو ٹالنے کی کوشش کی اور من میں سوچنے لگی...... بھگوان اور کتنا سہنا ہوگا۔ بیٹی اتنی اچھی اور ماں کی فطرت اتنی...... بُری...... نہ خود چین سے رہتی ہیں اور نا ہی گھر میں کسی اور کو رہنے دیتی ہیں......

دیدی موٹر آگئی...... اب جاؤ بھی...... وہاں پتاجی تمہاری راہ دیکھ رہے ہونگے...... دونوں باہر آئیں گڑیا...... نہ معلوم کیوں آج مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے...... وہ اتنے بڑے لوگ ہیں...... اس بھیڑ بھاڑ میں میں بالکل اکیلی...... یہ لو۔ روپا...... ہنس دی۔...... ڈر کس کا...... تم وہاں اکیلی نہیں ہوگی...... وہاں پتاجی ہیں۔ پتاجی تو پوجا کریں گے...... سنجیونی بولی۔ میں وہاں سے گاڑی بھجوادونگی تو خوب اچھی طرح تیار ہو کر آجانا...... ساڑی پہنکر آنا...... اماں کو بھی لے آنا...... آئے گی نا...... تم نے کہا ہے تو آنا ہی پڑے گا۔ تم تو جاؤ پہلے۔

روپا زور سے ہنسی...... دیدی کو چھیڑنے لگی...... بھگوان کے ہر کام میں مصلحت اور دانائی ہوتی ہے، پھر رک رُک کر بولی...... شاید...... آج...... وہ...... آپ کا راجکمار...... رخصت...... ہر وقت الٹی سیدھی ہانکتی رہتی ہے۔ اور اگر سچ ہوگئی میری بات تو روپا بولی...... سنجیونی بولی تو راجکمار کے چھوٹے بھائی سے تیری شادی کروادونگی...... روپا اداس ہوگئی...... نیچی نظر کر کے بولی...... پھر اس کا کیا ہوگا...... نہیں دیدی یہ ظلم نہ کرنا...... اور

سنوڈرنا بالکل نہیں...... بھلا کس میں مجال جو پنڈت اوم پرکاش شرما کی لڑکی پر بری نظر ڈال سکے...... ویسے سچ تو یہ ہے کہ آج تم بالکل دلہن سی لگ رہی ہو......

آج سب کی نگاہیں میری دیدی پر ہی ٹکی رہ جائینگی...... میری بھولی دیدی...... تو میں نہیں جاتی۔ سنجیونی نے زور لگا کر کہا...... روپا نے ہاتھ کھینچا...... میری بھولی دیدی...... جانا تو پڑے گا...... کاش وہ آج سنجیونی گھبرا گئی...... اب کیا کہہ رہی ہو...... کچھ بھی تو نہیں...... تم بیٹھو نا گاڑی میں...... جیسے ہی گاڑی آگے بڑھی روپا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا...... بھگوان میری دیدی کی زندگی میں خوشیاں بھر دو...... اجالا کر دو...... ان کی اندھیری زندگی میں......

اماں کا لب ولہجہ روپا کو بہت بُرا لگا۔ اماں کیوں دیدی کے ساتھ اتنی بُری طرح پیش آتی ہو۔ ان کی سمجھداری دیکھو...... خاموشی سے تمہارے سارے ظلم برداشت کرتی رہی۔ کبھی پتاجی سے کچھ نہیں کہتیں...... اماں بولی...... خبردار رہنا۔ سوتیلا رشتہ کبھی سگا نہیں ہوتا...... ساری دنیا کا یہ کہنا ہے...... روپا کا لہجہ بھی کرخت ہو گیا۔ اماں ہم دونوں بہنوں میں بہت گہرا پیار ہے۔ میری دیدی جتنی خوبصورت ہیں اُس سے بھی زیادہ اچھے دل کی مالک بھی ہیں، تمہاری ان باتوں سے ہمارے پیار میں کمی نہیں آسکتی...... اماں ایک بات تو طے ہے...... اندھیری رات کتنی لمبی کیوں نہ ہو اجالا ضرور ہوتا ہے۔ میں تو بھگوان سے ہر وقت یہی دعا مانگتی ہوں میری دیدی کی زندگی کی وہ صبح جلدی آئے......

اماں اور بگڑ گئیں...... اُس کی صبح آئے تو میرے کلیجے کو بھی ٹھنڈک ملے۔ بیس سال سے اس کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے تھک گئی ہوں...... روپا بولی...... دیدی صبح سے شام تک اس گھر میں نوکرانی کی طرح کام کرتی ہیں۔ تمہارے حصے کا بوجھ تو دیدی اٹھا رہی ہیں...... انہیں کونسا سکھ ملا ہے یہاں۔ پھر بھی ہر ایک کا خیال رکھتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ میرا...... وہ شادی ہو کر چلی جائینگی تو معلوم نہیں اُن کے بغیر کیسے رہ پاؤں گی۔

اماں کو سنجیونی کی تعریفیں زہر لگتی تھیں۔ چیخ کر بولیں...... تو اُس کے بغیر رہنا سیکھ لے کیونکہ وہ کچھ دن کی مہمان ہے اس گھر میں...... جلد از جلد اُس کی شادی کر دونگی...... اماں نفرتوں سے بھرے دل ہمیشہ بے چین رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے کلیجوں میں ہمیشہ آگ سلگتی رہتی ہے۔ کیوں ناحق اپنے آپ کو جلاتی ہو...... اماں ہو تو ان کی ماں بھی چاہے سوتیلی ہی سہی...... تمہارے منھ سے دیدی کے خوبصورت مستقبل کے لیے دعا نکلنی چاہیے۔ اماں کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا ہی رہ گیا...... اماں کا سارا پلان چوپٹ ہو گیا تھا...... ان کی بیٹی کی تمام تر ہمدردیاں سنجیونی کے ساتھ تھیں...... اگر اس نے رام بھروسے کو بھگا دیا

تو...... یہ میرے گلے پڑی رہے گی۔

رام نارائن جی کا نام صرف برادری ہی میں نہیں پورے شہر میں مشہور تھا۔ بے قیاس دولت کے مالک ہوتے ہوئے بھی ان میں غرور نام کو نہ تھا...... وہ غریبوں کے دوست تھے۔ اُن کی حاجتیں رفع دفع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دولت سے زیادہ انسانیت کو اہمیت دیتے تھے۔ لوگ ان کی عزت اور آدر کرتے تھے اور کہتے تھے یہ دنیا ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی چل رہی ہے۔ اگر ایسے لوگ نہ ہوتے تو غریبوں کی طرف کون نظر ڈالتا۔

اُن کی ایک ہی خواہش تھی کہ ان کے تینوں بچے مل جل کر میل محبت سے رہیں۔ اسی منصوبے کے تحت شرما کنج کے وسیع احاطے میں تین کوٹھیاں اس طرح تعمیر کروائی گئی تھیں کہ تینوں کوٹھیاں ملے ہونے کے ساتھ ساتھ علیحدہ بھی تھیں......

انہوں نے اپنی بیٹی سرسوتی کی شادی اپنے بچپن کے دوست بھرت شرما کے بیٹے گیان چند سے کردی تھی...... گیان چند کی دونوں بہنیں سجاتا اور شلپا کا بیاہ اپنے دونوں بیٹوں جگ موہن اور من موہن سے کروایا تھا...... ناں ہی بھرت جی جانتے تھے اور نا ہی رام نارائن جی کو کبھی یہ احساس ہوا تھا کہ اُن کے دونوں بیٹے بھی یہی چاہتے تھے۔ شرما کنج خوشیوں کا گہوارہ تھا۔

بڑی جلدی رام نارائن کی خوشیوں کو نظر بد لگ گئی...... سرسوتی اور گیان چند کسی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ تینوں کوٹھیوں پر سوگ چھا گیا...... رام نارائن جی نے اپنے دونوں بیٹوں اور دونوں بہوؤں کو اپنے کمرے میں بلایا...... بولے میں نے کبھی بیٹوں اور بیٹی میں فرق نہیں سمجھا...... زمین جائداد۔ دھن دولت اور بزنس میں تینوں کا برابر کا حصہ ہے۔

میری بیٹی نہیں رہی۔ اب میری خواہش ہے کہ تم چاروں مل کر اُس کے بیٹے گلشن کی پرورش کرو۔ بالکل اپنا بچہ سمجھ کر اُسے پیار دو۔ تاکہ اُسے یتیمی کا احساس کبھی نہ ستائے۔ اُس کی ہر خوشی کا خیال رکھو تاکہ وہ کبھی مایوس نہ ہو......

سجاتا اور شلپا دونوں دل سے چاہتی تھیں کہ اُن کا اکلوتا بھتیجا اُن کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ جگ موہن اور من موہن کب اپنی بہن کی نشانی کی جدا کرنا چاہتے تھے۔ چاروں نے اپنے پتاجی کو یقین دلایا کہ وہ اس ذمے داری کو بخوبی نبھائیں گے۔ رام نارائن جی کا سب سے گمبھیر مسئلہ حل ہو گیا۔ سرسوتی کی موت کے بعد تیسری کوٹھی اکثر بند ہی رہتی تھی۔

آج وہ کوٹھی بھی کھولی گئی تھی۔ کوٹھی کا وارث جو آرہا تھا۔ آنا تو اُسے کئی دن پہلے تھا پر بزنس اتنا پھیلا ہوا تھا کہ گلشن کو دم لینے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔ اور آج نہ جانے کیوں اُس کی فلائٹ لیٹ ہوگئی تھی اور ادھر سب بڑی بیقراری سے اُن کے آنے کے منتظر تھے۔ اُنکی دونوں بوائیں بار بار فون پر فلائٹ کے آنے کی خبر لے رہی تھیں پر کوئی صحیح انفارمیشن نہیں دے سکا تھا......

گلشن کمار جب گھر پہنچے تو گیٹ کے باہر ہی ایک لڑکی نے انہیں روک کر کہا کہ اُسے اُن سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ وہ رکنا تو نہیں چاہتے تھے مگر لڑکی کا چہرہ کچھ کچھ جانا پہچانا سا لگا تو ٹھہر کر بولے...... جی کہیے...... ایسا ہے گلشن جی آپ کے بزرگ مجھے اس گھر کی بہو بنانا چاہتے ہیں لیکن میں اس فیملی میں شادی نہیں کرنا چاہتی......

یہ سنتے ہی گلشن کو غصہ آ گیا۔ بھوئیں چڑھ گئیں۔ کیا نقص پایا آپ نے میری فیملی میں جو شادی کرنے سے انکار کر رہی ہیں۔ وہ کچھ نہ بولی تو بولے...... آپ کا پروبلم کیا ہے...... وہ بولی پروبلم ہے گلشن جی...... بہت بڑا پروبلم ہے...... وہ اونچی آواز میں بولا...... میڈم پروبلم آپ کا ہے اور آپ ہی اس پروبلم کو سولو بھی کر سکتی ہیں۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں جو دوسروں کے پروبلم سولو کرتا پھروں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں...... اُس لڑکی نے گلشن کا راستہ روک کر کہا میری پوری بات تو سن لیں...... اگر میں خود کچھ کر سکتی تو آپ کو ہرگز پریشان نہ کرتی......

لڑکی کے اتنا اصرار کرنے پر وہ رُکا اور بولا اچھا یہ بتائیے کون ہے وہ بدنصیب جسے آپ ٹھکرا رہی ہیں...... اور کیوں...... وہ ایکدم گھبرا گئی...... میری کیا بساط جو میں ایسا سوچ بھی سکوں، ہماری برادری کی ہر جوان لڑکی اس خاندان کی بہو بننے کے سپنے دیکھتی ہے۔ کچھ بات ہی ایسی ہے کہ میں شادی نہیں کر سکتی......

تو مت کریئے۔ آپ پڑھی لکھی موڈرن لڑکی ہیں۔ شادی آپ کی مرضی کے خلاف تو ہو نہیں سکتی۔ وہ بولی یہی تو آپ کی غلط فہمی ہے۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لڑکی کی مرضی اور خواہش کی پروا کرنے والا کوئی نہیں۔ یہاں تو خاندان کی عزت اور سماج کی زیادہ فکر کی جاتی ہے۔ وہی ہوتا ہے جو ہمارے بڑے چاہتے ہیں۔ شادی کرنا والدین کا فرض ہے سو کر دیتے ہیں...... اس کے بعد لڑکی جیئے یا مرے کسی کو فکر نہیں رہتی۔ بس یہی چاہتے ہیں کہ ارتھی سسرال سے اٹھنی چاہیے......

بڑے حیرت انگیز لہجہ میں گلشن نے کہا ساری دنیا میں شور مچا ہے کہ ہندوستان خوب ترقی کر رہا ہے پھر یہاں عورتوں کی آواز کیسے دبائی جا سکتی ہے۔ سنتے تو یہی تھے کہ یہاں عورتوں کو ہر قسم کی آزادی ہے۔

ملک خاک ترقی کر رہا ہے...... غربت۔ جہالت۔ بھک مری سے ملک آج تک آزاد نہ ہو سکا۔ آپ کونسی ترقی کی بات کر رہے ہیں۔ عورتوں کا حال بھی وہی ہے جو برسوں پہلے تھا۔ آج بھی عورتیں جلائی جا رہی ہیں۔ ہاں کلب لائف کا رواج کچھ زیادہ چل پڑا ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہ ہوا کہ عورتوں کی حالت سدھر گئی ہے۔ وہ پھر سوچوں میں ڈوب گئی۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں اتنا اچھا رشتہ ٹھکرانے کی وجہ کیا ہے۔ گلشن نے سوال کیا وہ بولی...... وجہ ہے بہت خاص وجہ ہے...... میں ایک ایسے لڑکے سے شادی کرنے جا رہی ہوں جو نا ہی میری ذات برادری کا ہے اور نا ہی کسی امیر کبیر خاندان سے اُس کا تعلق ہے...... اور...... اور...... وہ پھر چپ ہو گئی اور زمین تکنے لگی......

اور کیا...... گلشن نے کچھ وقفہ کے بعد سوال کیا...... آپ ذرا جلدی کریں اندر میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ وہ رک۔ رک کر بولی...... وہ...... وہ دیکھ نہیں سکتا......

ایک عجیب سی خاموشی در آئی...... کچھ لمحے یوں ہی بیت گئے...... گلشن نے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا...... کیا آپ کا یہ فیصلہ اٹل ہے...... جی بالکل اٹل...... گلشن اُسے سمجھانے کے خیال سے بولا...... سوچنے کی حد تک ہر شے اپنے اختیار میں ہوتی ہے...... مشکل سے مشکل کام بڑا آسان سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت بہت مشکل ہوتی ہے...... ابھی وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی آگے قدم اُٹھایئے اس راستے کی دھوپ بڑی کڑی ہوگی۔ ایک معذور کے ساتھ زندگی گذارنا آسان نہ ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی سے کچھ عرصے کے بعد ہی محبت کا جنون ٹھنڈا پڑ جائے اور مصیبتوں کا سامنا کرتے کرتے آپ خود سے ہی بیزار ہو جائیں...... پھر اُس پچویشن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ سوائے چھوڑا چھاڑی کے۔

اول تو یہ کہ آپ ایک امیر گھرانے کی لڑکی ہیں، غریبی سے آپ کی جان پہچان نہیں۔ غریبی ایک بُری بلا ہے جس سے سب گھبراتے ہیں۔ دوسری بات یہ...... ہو سکتا ہے آپ کے اپنے آپ سے سارے رشتے ناطے توڑ ڈالیں۔ تو کیا آپ اکیلی اتنی بڑی ذمہ داری اُٹھا پائینگی۔ یہ سوال کر کے گلشن کا حساس دل بُری طرح دکھ کر رہ گیا۔

وہ بولی میں پوری کوشش کرونگی۔ کل کیا ہوگا کوئی نہیں جانتا...... گلشن نے کہا...... سو آپ کا ارادہ اٹل ہے۔ میں تو بس اتنا کہونگا کہ خدا آپ کو ہمت اور صبر عطا کرے...... وہ بولی میری ہمت اور طاقت تو رنجیت ہیں...... وہ غریب ہیں پر ہیں بڑے حوصلہ مند انسان...... محنت مزدوری کر کے اپنی پڑھائی مکمل کی

اور آگے بڑھتے گئے۔ ایک کمپنی میں افسر لگے ہوئے تھے۔ ہم سب مل کر گاؤں میں سوشل ورک کرتے تھے۔ رنجیت بھی اپنی چھٹی کے دن ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہونگے ہماری اسّی پرسنٹ آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ اُن کی شکستہ حالی بیان سے باہر ہے۔ رنجیب گاؤں والوں کی مصیبتوں میں ایسے الجھ گئے کہ اپنی نوکری چھوڑ چھاڑ کر اُن غریبوں کا سہارا بن گئے۔ بالکل اچھے تھے۔ اچانک آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ جس شخص نے اپنا سب کچھ دوسروں کی خوشیوں کے لیے قربان کر دیا آج جب اُسے سہارے کی ضرورت ہے تو کیا یہ میرا فرض نہیں کہ اُسے سہارا دوں۔ مانا کہ محبت ایک بہت خوبصورت جذبہ ہے لیکن میری نظر میں چاہت اور محبت سے بڑھ کر فرض کی ادائیگی ہے......

اگر آپ شادی کے لئے انکار کر دیں۔ اگر آپ مجھے ریجیکٹ کر دیں تو میرا پرابلم کچھ حد تک سول ہو سکتا ہے۔

گلشن مسکرایا......او......تو یہ بات ہے......آپ نے مجھے ریجیکٹ کر دیا مگر میں آپ کو ریجیکٹ نہیں کر سکتا چار سال کے بعد اپنے ملک لوٹا اور سب سے پہلے آپ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور یہ ملاقات ایسی معمولی بھی نہیں جو بھلا دی جائے......لڑکی نے گھبرا کر گلشن کا چہرہ تاکا......مگر......

اگر......مگر......کچھ نہیں......اس خودغرض دنیا میں آپ جیسے لوگ اکا دکا ہی ہیں......آپ جیسی نایاب ہستی سے دوستی کرنا چاہونگا......اگر آپ اجازت دیں تو......اور دوستوں کے سارے دُکھ اور سارے سُکھ ساجھے ہوتے ہیں......وہ ہولے سے مسکرائی......اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا......گلشن نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا کیا میں اپنی نئی دوست کا نام جان سکتا ہوں......وہ بولی میں سادھنا ہوں۔ سجاتا اور شلپا کی کزن ہوں......گلشن نے ہنس کر کہا۔ آئندہ آپ اپنے کو کبھی اکیلا نہیں سمجھنا......جب بھی کوئی مشکل کی گھڑی آپڑے مجھے پکار لینا......آپ مجھے اپنے پاس پاؤ نگی......میں رنجیت جی سے بھی جلد ملونگا......شادی کے ہنگاموں کے بعد......گلشن نے اپنا کارڈ کچھ امریکن ڈالرز سادھنا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا......یہ غریب گاؤں والوں کے لیے ہیں۔ آپ جیسی طاقتور لڑکیاں ہی اس دیش کو مضبوط بنا سکتی ہیں۔ اگر ہم جیسے لوگ آپ کے نقشِ قدم پر چلیں تو ملک میں غربت کی کمی تو ضرور ہو سکتی ہے۔

دونوں مسکرائے......اور گلشن نے آگے قدم بڑھائے۔ وہ سوچنے لگا واقعی کام تو مشکل ہے پر لڑکی میں ہمت بھی بہت ہے۔

سنجیونی ڈرتے ڈرتے ہولے ہولے آگے بڑھ رہی تھی۔ رنگ برنگی پھولوں سے سجا احاطہ ایک

باغ سا دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں مہکتے گلابوں کے گلدستے تو کہیں گیندے کے پھولوں کی لڑیوں کے ہار...... قسم قسم کے پھولوں کو دیکھ کر اُس نے سوچا آج ساری دنیا کے پھول یہاں ہی دیکھ لوں۔ پھر شاید یہ موقع کبھی نہ ملے......سورج کی روشنی ذرا مدھم ہوئی تو ایک بٹن دباتے ہی چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی تھی۔ اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا......

مہمان آرہے تھے...... نئے نئے اسٹائل کے لہنگے، کرتی......رنگ برنگی بھڑکیلی چمکیلی بنارسی ساڑیوں میں ہنستی مسکراتی لڑکیاں۔ زیورات اور پھولوں سے سجی تتلیوں کی طرح ہواؤں میں اڑ رہی تھیں...... یوں لگتا تھا جیسے اندر فیشن پریڈ ہونے جا رہی ہو......کم مائیگی کے احساس سے سنجیونی کی گردن جھکی ہوئی تھی......

اچھا ہی ہے یہاں نہ کوئی مجھے جانتا اور نہ ہی میں کسی کو پہچانتی......وہ آنا نہیں چاہتی تھی گھر آج اُس کے پتاجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو اُسے آنا پڑا تھا......لیکن اب وہ پچھتا رہی تھی......کاش اماں ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھے روک لیتیں......اس اجنبی ماحول میں اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا......

تب ہی پیچھے سے کسی نے اُسے پکارا......سنیئے......وہ پلٹی نہیں۔ کیسے پلٹی......اس میں تو ہلنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی......خوف سے ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپ اٹھے تھے......اس کا ذہن جو ابھی تک سویا جاگا سا ہو رہا تھا ایک نوجوان کو اپنے مقابل کھڑا دیکھ چوکس ہو گیا تھا......اُس نے اپنا جھکا سر اوپر اٹھایا......پھر گھنی سیاہ پلکیں اوپر اُٹھیں۔ اُس کی دو بڑی بڑی سیاہ چمکیلی آنکھوں نے دو مسکراتی آنکھیں دیکھیں تو ہوش اُڑ گئے......

لڑکے نے سنجیونی کے سراپے پر نظر ڈالی اور آنکھیں اُس کی چوٹی پر ٹک گئیں۔ وہ بولا......اتنے خوبصورت بال چار سال کے بعد دیکھ رہا ہوں......وہ اس انجانے شخص کو اتنے قریب دیکھ کر سہمی۔ ڈر کے مارے سانس رک کر رہ گئی......

اُسے مردوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ کتنے آئے اور چلے گئے۔ پھر یہ کوئی فرق تو نہیں ہو سکتا...... لیکن کچھ تو ضرور تھا ان انجانی مسکراتی آنکھوں میں جو اُس کے دل کو بھا گیا تھا۔ اُس نے دائیں بائیں دیکھا۔ گھبرائی......کسی نے دیکھ لیا تو......پھر وہی آواز......"کون ہیں آپ"......وہ......اپنے حواس میں کہاں تھی جو جواب دیتی......بس دیکھتی ہی رہ گئی......دو دلوں میں عجیب سی ہلچل مچی......دلوں کی ہر دھڑکن کہہ رہی تھی موسم گل آ گیا تھا۔ پھر لڑکی کے ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ پھیلی اور نظریں خود بخود جھک گئیں......

آپ نے جواب نہیں دیا......خیر آپ جو بھی ہیں......دنیا والے حُسن کے پجاری ہیں لیکن میں تو آپ کی سادگی کا اسیر ہو گیا......سارا قصور تو آپ کی اس خوبصورت چوٹی کا ہے جسے دیکھ کر دل قابو میں نہیں

رہا...... وہ انجانا شخص اپنی محبت کا اظہار بیحد خوبصورتی اور گمبھیرتا سے کرتا ہوا لڑکی کے دل میں اُترتا چلا گیا۔ وہ بھونچکّی سی اُسے گھورتی رہ گئی...... وہ پھر مسکرایا اور بولا...... ارے آپ بھی تو کچھ بولیے۔ وہ آہستہ سے بولی...... میں کیا بولوں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا......

وہ پھر ہنس کر بولا...... ہمارا دوش نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ہمارا دل کہہ رہا ہے...... گلشن نے جھک کر کہا...... اس دل سے ہم مجبور ہیں...... وہ بولی۔ اور دل کی باتیں ہم سمجھتے نہیں...... سب سمجھ جائیں گی...... آہستہ آہستہ...... اگر اس دل کی بات غور سے سنیں گی جو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ یہ پیاری سی سیدھی سادھی لڑکی صرف میرے لیے ہے...... یہ دل آپ کا ساتھ مانگتا ہے۔ اب تو بولیے......

لڑکی کی سانسیں بے ترتیب ہو کر تھم سی گئیں...... ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے...... دل پر یکایک شک کے بادل چھا گئے...... وہ بولی...... ایسا نہیں ہو سکتا...... یہ بہت مشکل ہے...... وہ بولا...... مشکل ہی ہے...... ناممکن تو نہیں...... میں ہر مشکل کو آسان بنا دونگا...... لڑکے نے اتنی سرعت سے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی...... لڑکی کو یقین نہیں ہوا...... اُس کے چہرے پر بے یقینی اور نا امیدی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ گھبرا کر بولی...... سب ادھر ہی دیکھ رہے ہیں...... آپ راستہ چھوڑیں...... مجھے جانے دیں...... وہ راستہ روکے کھڑا مسکراتا رہا...... بولا آپ پہلے اپنا نام بتائیں...... وہ بولی نام جان کر آپ کیا کریں گے...... اُس نے بنا جھجھک کہا بیاہ کرونگا آپ کے ساتھ...... لیکن آپ کی مرضی معلوم کرنے کے بعد...... بولیے...... ہاں یا نہیں...... وہ ہڑبڑا گئی...... یہ کیسا سوال ہے...... مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔ سوال جیسا بھی ہو۔ ہے تو سوال ہی۔ جواب آپ کو ہی دینا ہوگا۔

وہ بولی...... میں پنڈت اوم پرکاش شرما کی بیٹی ہوں۔ وہ اندر میں پوجا کی تیاریاں کر رہے ہیں اب تو جانے دیں...... نام بنا جانے میں آپ کا راستہ نہیں چھوڑونگا......

وہ مسکرا کر بولی...... سنجیونی...... اُس نے ایکدم آگے بڑھنے کی کوشش کی پر وہ ہل کر نہ دیا۔ یہ تو میرے پہلے سوال کا جواب ہے۔

وہ شرما گئی...... آپ کے باقی سوالوں کا جواب میرے پتاجی دے سکتے ہیں۔ میں نہیں۔ حیا میں ڈوبی آواز تھی۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا...... بولا...... ''اب دیکھئے کیا حال ہمارا ہو سحر تک''...... اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا......

سنجیونی سوچتی ہی رہ گئی...... ''آپ کون ہیں'...... پھولوں کی مہکار۔ ہواؤں کی سرسراہٹ چاند

کی چاندنی...... پوری کائنات ...... اس معصوم لڑکی کو خوش دیکھ کر کہہ اٹھی ...... یہی تو ہیں وہ ...... شہنائی کی مُدھر راگنی نے یقین دلایا۔ کہ یہ سب سے فرق ہے۔ سب سے جدا، جب زندگی بالکل ویران ہوگئی ...... اور میں نے ناامید ہوکر اپنے دل کے کواڑوں پر قفل لگالئے تو آپ آگئے ...... میرے ہمدرد میرے غمگسار بنکر ...... پر اماں ایسا ہونے نہیں دیں گی۔ وہ خود سے ہمکلام تھی۔

گلشن کمار کا گھر میں بہت زبردست استقبال ہوا۔ دونوں بواؤں نے انہیں اکیلا دیکھا تو بولیں شکر ہے کہ اکیلے لوٹے ہو۔ شلپا بولی تمہیں برادری کے اچھے اچھے خاندانوں کی لڑکیوں کی تصویریں بھیجی تھیں ...... کیا ہوا ...... وہ بولا ...... ایک بھی نہیں جچی ...... تو کیا عمر بھر اکیلا رہنے کا ارادہ ہے ...... یا کوئی میم کو دل دے بیٹھے ہو ...... وہ ہنس کر بولا ...... میرا دل اتنا سستا نہیں اور نا ہی میں احمق ہوں جو اپنے یہاں کی سیدھی سادھی لڑکیوں کو چھوڑ کر ایک آفت اپنے گلے لگالوں۔

کچھ وقفہ کے بعد سوال کیا ...... بواجی ایک بات بتائیں یہ اچھے اچھے خاندان کیسے ہوتے ہیں۔

بوا بولی ...... ارے بھئی جیسا ہمارا خاندان ہے۔ بس ایسے ہی ......

کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ ان اچھے اچھے خاندانوں کی لڑکیاں بھی اچھی اچھی ہیں۔ ان اچھے اچھے خاندانوں کے ذاتی معاملات کس قدر الٹے سیدھے بھی ہو سکتے ہیں یا سب اچھے ہی ہیں۔

شلپا نے ہنس کر کہا۔ ہم کوئی سی۔ آئی۔ ڈی۔ لگے ہیں جو ہر خاندان کے اندرونی معاملات کی چھان بین کرتے پھریں۔ سجا تا بڑی تھیں ڈانٹ پھنکارنے میں بھی ماہر تھیں ...... بولیں یہ کیا الٹی سیدھی بک رہے ہو ...... اچھی طرح ایک بات سمجھ لو کہ اس دفعہ تم اکیلے واپس نہیں جاسکتے ...... اُدھر تم اکیلے ہوتے ہو ادھر ہمارے دل گھبراتے رہتے ہیں کہ کہیں ...... وہ ہنس کر بولا کیسی میم کو نہ پکڑلوں ...... بے فکر رہیں ایسا نہیں ہوگا ...... اگر ایسا ہے تو آج ہی کچھ فیصلہ کرلو۔ آج بہت لڑکیوں سے ملوگے۔ پڑھی لکھی۔ امیر۔ خوبصورت اور فیشن ایبل ......

وہ بولا ...... بواجی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ ایسی تو امریکہ میں بھی بہت ملیں پر ایک بھی دل کو نہیں بھائی۔ شلپا نے سنجیدگی سے کہا ...... بڑا عجیب دل ہے تمہارا۔ اس کا حال تو تم ہی جانو پر فیصلہ تمہیں آج ہی کرنا ہوگا

فیصلہ ...... لیجئے کرلیا فیصلہ ...... جو لڑکی سب سے زیادہ سیدھے سادھے لباس میں ہوگی اور جس کے بال سب سے زیادہ لمبے اور خوبصورت ہونگے میں اس سے ہی شادی کرلونگا ...... مجھے بھڑ کیلے لباس اور بال کٹی لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔ اگر وہ لڑکی غریب گھر کی ہوئی تو آپ دونوں بھی میرا ساتھ دیں گی

مجھے تیز طرار لڑکیوں سے ڈر لگتا ہے۔ سیدھی سادھی لڑکی ہی چاہے جانے کے قابل ہوتی ہے۔

باہر میوزک چل رہا تھا...... بہارو پھول برساؤ مرا محبوب آیا ہے...... اور اُسی وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں تو ایک محفل جمی تھی اور وہ محفلِ جاں بنا بیٹھا تھا...... وہ خود اپنے حواسوں میں نہیں تھی بہت عرصے کے بعد دل میں خوشیاں مسکرائی تھیں...... جھکی جھکی نظریں...... سہمی سی گھبرائی لڑکی نے ہولے سے کہا...... ''شلپا دیدی کہاں ملے گی...... میرے پتا جی انہیں بُلا رہے ہیں۔''

اُس کی آواز سن کر وہ مڑا...... دونوں کی نظریں ملیں...... دو دل بڑی زور زور سے دھڑکے۔ آنکھوں میں محبت کی قندیلیں جل اٹھیں...... اُس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ اس سے پہلے کوئی کچھ کہتا وہ مڑی اور باہر نکل گئی...... دل کی دھڑکنیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتے کہیں اور تھے......

گلشن کے چہرے پر رنگ برس پڑے تھے...... سجاتا بولی...... پنڈت جی کی لڑکی کتنی سندر اور سشیل ہے۔ میں نے اسے آج پہلی بار دیکھا اور سوچا...... پھر مسکرا کر گلشن سے سوال کیا......

پسند آئی...... وہ انجانا سا بنکر بولا...... کون...... یہی جو ہوا کے جھونکے کی طرح آئی اور سب کے دلوں پر چھا گئی...... کیا تم نے دیکھا نہیں کہ معمولی سے کپڑوں میں اپسرا سی لگ رہی تھی...... گلشن کا دل مسکرا رہا تھا اور وہ اپنی بوا کا چہرہ تکے جا رہا تھا......

تب ہی عقب سے آواز آئی...... یہ مرد بھی عجیب ہوتے ہیں۔ چھم چھما چھم کرتی لڑکیوں کو تو بڑے غور اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں...... موتیوں پر نظر نہیں ڈالتے...... جبکہ انسان کو پہچاننے کے لئے صرف ایک نظر چاہیے...... سچ کہتی ہوں یہ جتنی خوبصورت ہے اس سے بہت زیادہ خوب سیرت ہے۔ اور بات یوں کرتی ہے جیسے منہ سے شہد ٹپک رہا ہو۔ اس میں جو بات ہے وہ کسی اور لڑکی میں نہیں۔ ارچنا نے گلشن کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر سوال کیا...... گلشن بھائی آپ کا کیا خیال ہے......

سجاتا بولیں...... تم بولو یا نہ بولو...... تمہارا چہرہ بول رہا ہے۔ اب فیصلہ بھی سنا دو۔ جہاں دو منڈپ سجائے ہیں وہاں تیسرا بھی سجا دیں...... وہ گھبرائی گھبرائی آواز میں بولا۔ منڈپ...... تیسرا...... سجاتا بولی۔ ہاں ہاں...... منڈپ...... یہ کام بھی پورا ہو جائے۔ وہ پھر بولا...... کونسا کام...... اس کے لہجے میں خوشیوں کی بوچھار تھی......

اوہو...... یہ لڑکا بڑا نادان ہے...... کچھ بھی نہیں سمجھتا...... ارے بھئی تمہارا بیاہ...... ہم اس پیاری سی لڑکی کو اس گھر کی بہو بنانا چاہتے ہیں...... اگر تم ہاں کہہ دو تو میں ابھی پنڈت جی سے بات کروں اور لگے

ہاتھ یہ کام بھی ہو جائے۔......

گلشن منھ سے تو کچھ نہ بولا...... دل کی بات آنکھوں میں چمکی...... چہرہ دمکا اور شلپا نے چھیڑا......اب اور نہ شرماؤ...... ہاں کہہ ڈالو...... اُس کا روم روم گنگنا اٹھا...... یہی تو میری دلی تمنا ہے...... بڑے سنجیدہ لہجے میں بولا...... میں نے آج تک کبھی اپنے بڑوں کا حکم نہیں ٹالا۔ میں جانتا ہوں آپ لوگ جو بھی کریں گی میری بھلائی کے لئے ہی کریں گی...... سجاتا نے اُسے سینے سے لگا کر کہا...... ہمیں تمہارا یہ فیصلہ دل سے منظور ہے...... بھگوان تمہیں سدا خوش رکھے۔ دعائیں دیتی وہ آگے بڑھ گئیں۔

پنڈت جی نے سنا تو ہڑبڑا کر بولے...... یہ نہیں ہوسکتا...... اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ پنڈت جی انکار کی کوئی خاص وجہ...... جگ موہن نے پوچھا...... پنڈت جی نے اپنی کم مائیگی کا ذکر کیا۔ اور بولے جو آپ کہہ رہے ہیں وہ تو میں نے کبھی اپنے خواب وخیال میں بھی نہ سوچا تھا...... صرف بھگوان سے اتنا ہی مانگا تھا کہ میری بیٹی کو ایسا شوہر دے جو اُس کو محبت۔ تحفظ اور مضبوط سائبان دے سکے...... ایک غریب پنڈت اس سے زیادہ اور کیا چاہ سکتا ہے......

کچھ وقفہ کے بعد پنڈت جی بولے میرا خیال ہے کوئی کام کبھی جلد بازی میں نہیں کرنا چاہیے۔ آپ لوگ اچھی طرح سوچ لیجئے تا کہ بعد میں...... جگ موہن بیچ میں ہی بول اٹھے۔ جو کام بھگوان کی طرف سے ہوتے ہیں انہیں ہو جانا چاہیے...... جلد از جلد...... آپ کے ہمارے خاندان سے بہت پرانے مراسم ہیں...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں ہم اپنے قول کے پکے ہیں...... کبھی جھوٹ نہیں بولتے...... آپ سے ہمارا وعدہ ہے آپ کی بیٹی اس گھر میں بہو نہیں ہماری بیٹی بن کر رہے گی...... ہم نے کبھی اپنی امارت کا غرور نہیں کیا...... یہ تو آخر جانے والی شے ہے...... اب جوڑے تو آسمان میں بنائے جاتے ہیں جس میں انسان کا دخل ہو ہی نہیں سکتا...... بس یہ سوچ کر کہ یہ کام بھی بھگوان کے حکم سے ہی ہو رہا ہے اپ ہاں کر دیجئے...... جگ موہن نے پنڈت جی کو منا ہی لیا......

پنڈت جی پل بھر کو ماضی کی دنیا میں کھو گئے...... میری بچی کے پاؤں کانٹوں پر چل چل کر گھائل ہو گئے ہیں اچانک ہی بیٹی کے مقدر کا دروازہ کھلا اور آنکھوں کے سامنے پھول ہی پھول نظر آئے...... اور سامنے سے بیٹی پھولوں پر آہستہ آہستہ چلتی اپنے بابو جی کی طرف آرہی تھی...... بچی کو پہلی بار مسکراتے دیکھ پنڈت جی حال کی دنیا میں لوٹ آئے......

اور بولے...... آپ جانتے ہیں...... یہ بے ماں کی بچی ہے۔ اس بچی نے میری چھوٹی سی کٹیا کو

باغ بنا رکھا تھا...... کبھی بھی کہیں بھی کوئی چیز بد نظمی کا شکار نہ ہونے دیتی تھی...... مجھے یقین ہے یہ اپنے نئے گھر کو اپنے پیار سے سجا دیگی...... کیونکہ اس غریب پنڈت کی لڑکی کے پاس سوائے پیار بانٹنے کے اور ہے ہی کیا...... چھوٹی ہے...... بہت سی غلطیاں کریگی...... اس کی غلطیوں کو معاف کر دینا......

جگ موہن بولے...... مانگنے والا ہمیشہ چھوٹا ہی ہوتا ہے...... ہم جھولی پھیلا کر آپ سے آپ کی بیٹی مانگ رہے ہیں...... دینے والا تو بھگوان ہوتا ہے۔ بڑا مہان ہوتا ہے...... آج سے آئندہ ہمارے درمیان دولت کا مول تول نہیں ہونا چاہیے...... آپ ہمارے بزرگ ہیں...... بیٹی دے کر ہم پر احسان کریں گے...... بیٹیاں تو گھر کی جان ہوتی ہیں...... آپ کی دی ہوئی روشنی سے ہم اپنے گھر میں اُجالا کریں گے...... بس ہمیشہ یہ دھیان میں رکھئے کہ آپ کی بیٹی ہمارے گھر کی رونق ہوگی......

پنڈت جی خوش تھے...... اُن کی بیٹی کو سوتیلی ماں کے ہاتھوں اور ذلت و رسوائی نہیں اُٹھانی پڑے گی۔ انہیں بھگوان پر پختہ یقین تھا...... جانتے تھے تیرگی دیر تک نہیں رہتی...... انہیں اس صبح کا انتظار تھا۔

سنجیونی بڑی بیقراری سے روپا کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی اب تک تو گاڑی واپس آجانا چاہیے تھی...... اس بھری دنیا میں ایک روپا ہی تو اُس کے دُکھ درد کی ساتھی تھی۔ آج اس کا خوشیوں سے لبریز دل بولنا چاہتا تھا تو روپا کیں آس پاس نہیں تھی۔ وہ روپا کو بتانا چاہتی تھی کہ جس کو اماں نے راستے کا پتھر سمجھ کر ٹھوکریں ماری تھیں۔ جسے حقیر سمجھتی رہی تھیں اُسے ایک انجانے شخص کی محبت نے احساس دلایا ہے کہ میری ہستی کی بڑی اہمیت ہے...... اگر میں اُسے نہ ملی تو اُس کی زندگی بنجر ہو جائے گی......

"وہ روپا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا میرے ساتھ ہوا......
ایک انجانے شخص نے دل کی دہلیز پر دستک دی اور لمحے میں میرے دل کے آنگن میں آن کھڑا ہوا...... اور اب وہ میرے روم روم میں بس گیا ہے......

پھر ایک دم اس کو روپا کا خیال آیا...... روپا کی شادی...... راجکمار کے چھوٹے بھائی کے ساتھ...... ہم دونوں سدا ایک چھت کے نیچے رہ سکینگے...... نہیں...... نہیں...... ایسا ہوگا تو میری گڑیا کے سجے سجائے سپنے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے...... میں اپنی چھوٹی بہن کی زندگی میں بہاریں دیکھنا چاہتی ہوں...... سوکھے زرد پتے نہیں۔

سنجیونی نے نظر اٹھائی سامنے اپنی ماں اور روپا کو آتے دیکھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ لرز گئی۔ پوسوچنے لگی اماں کے دل میں میرے لئے نفرت ہی نفرت بھری ہے...... بچپن سے آج تک سوتیلی اولاد ہونے کا

عذاب اُٹھا رہی ہوں یہ کسی حال میری خوشیاں برداشت نہ کر سکینگی اور میری شادی میں رُکاوٹ ڈالنے کے لئے میرے خلاف زہر ضرور اُگلیں گی...... ابھی تو رشتہ جڑا بھی نہیں...... نیا نیا پیار ہے اس پیار کو نفرت میں بدلنے کے لئے کتنی دیر لگے گی...... اُس کا دل ڈوبنے لگا...... تب ہی اُس اجنبی کے پیار بھرے میٹھے بول یاد آئے۔ چاہے جانے کے احساس نے اُس کے اندر ایک نئی طاقت ایک نئی قوت بخش دی۔ آج پہلی بار اُسے ایک عجیب قسم کے تحفظ کا احساس ہوا۔ اور وہ سہمی سہمی سی لڑکی یکا یک بدل گئی...... ماضی کی ساری محرومیاں سارے دکھ بھول کر سوچنے لگی اب مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا...... اماں بھی نہیں......

اماں کو اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے سنجیونی کو دیکھے ہی چلی گئیں۔ سجاتا کے پاس کھڑے اور اُس کی پذیرائی ہوتی دیکھ اماں کا دل خاک ہوگیا۔ چہرہ دھواں ہو گیا...... وہ عجیب کش مکش میں مبتلا تھیں...... اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں من موہن جی نوکروں کو تیسرا منڈپ تیار کرنے کی ہدایتیں دیتے ہوئے اِدھر ہی آ نکلے۔

پنڈت جی سے بولے...... تین منڈپ...... ایسا ہوتا نہیں...... چار ہونے ضروری ہیں...... اُن کی نظر اندر آتی روپا پر پڑی...... وہ بجلی کی تیزی سے روپا کی جانب بڑھے...... ارے تم...... تب ہی پنڈت جی بولے یہ میری چھوٹی بیٹی روپا ہے...... من موہن کے منھ سے بے ساختہ نکلا...... پھر تو ہمارے چوتھے منڈپ کا مسئلہ حل ہوگیا......

پنڈت جی کچھ سمجھے نہیں...... فوراً سوال کیا...... وہ کیسے...... من موہن جی مسکرا کر بولے وہ ایسے۔ کہ جب ہم نے کالج کے فنکشن میں آپ کی بیٹی کو فیشن ایبل اور ماڈرن لڑکیوں کی بھیڑ بھاڑ میں جدیدیت کی راہ روی سے دور دیکھا تو ایکدم فیصلہ کر لیا کہ اس کی شادی ہم اپنے بیٹے برج موہن کے ساتھ کریں گے۔ بڑا ارمان تھا کہ ہم ایک گھر کی دو بیٹیاں اس گھر میں بہو بنا کر لائیں...... اگر آپ 'ہاں' کہہ دیں تو آج ہمارا یہ ارمان بھی پورا ہو جائے گا

انسان کو جس چیز کی بیحد ضرورت اور خواہش ہوتی ہے اگر نہ ملے تو وہ نا امید ہو جاتا ہے...... پھر اچانک وہ چیز اُس کے دامن میں آ گرے تو وہ خوشی کے مارے گنگ رہ جاتا ہے...... آج پنڈت جی کا بھی حال وہی ہو رہا تھا...... کچھ بولنا چاہتے تھے پر آواز ہی نہ نکلی...... اور اُدھر من موہن ان کے "ہاں" کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک مکمل خاموشی چھائی رہی...... من موہن جی کہہ رہے تھے آپ کی دونوں بیٹیاں اب ہماری بھی بیٹیاں ہیں......

روپا نے سنا تو تڑپ اٹھی...... اس کے دل کے درپن میں تو کسی اور کی تصویر بجی ہوئی تھی۔ حد نظر تک اُسے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا تھا...... جاتے جاتے اُسے یقین دلا گیا تھا کہ وہ اس کا ہے۔ صرف اس کا...... تب سے ہی سندر سپنوں نے اُسے گھیر رکھا تھا...... اور یہاں یہ لوگ اُسے مانگ رہے تھے۔ روپا کے لئے یہ بڑی آزمائش کی گھڑی تھی...... اگر پتا جی نے ''ہاں'' ...... کردی تو اُس کی محبت کی موت ہوجائے گی اور وہ زندگی بھر پیار کو ترسے گی...... روپا کے ہوش وحواس تو چھن چکے تھے۔ نادان تھی...... انجام تے بے خبر...... بغاوت پر اُتر آئی...... ''میں یہ شادی نہیں کرسکتی''......

باپ کے اوپر تو آسمان سے آگ کا گولا برس پڑا تھا...... پل بھر میں سب کچھ بھسم ہوگیا تھا۔ مذہبی رسوم اور سماجی رواجوں کے بانی کے بیٹی کے ہاتھوں ہی رسموں کا خون ہو رہا تھا۔ پنڈت جی کے اندر باہر بڑا شور اور ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔

اماں یہ منظر دیکھ ششدر رہ گئی تھیں...... پشیمان نظروں سے بیٹی کو دیکھ کر کہا...... کیا...... کیا۔ کہا تو نے...... شادی نہیں کرے گی...... تو اپنے انکار کے انجام سے واقف نہیں...... تیرے پتا جی یہ اپمان سہہ نہ سکیں گے...... ہم سب کو تباہی سے بچانے کے لئے تجھے یہ شادی تو کرنی ہی پڑے گی......

اُس وقت روپا بلا کسی جھجھک اور ڈر کے بولی...... اماں میں تو بالکل ناسمجھ سی سیدھی سادھی ٹین ایج گرل ہوں۔ ابھی اٹھارہ برس کی بھی نہیں ہوئی...... میں کیا جانوں شادی وادی کیا ہوتی ہے...... میں ذہنی طور پر شادی کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں...... نہ مجھے خانہ داری کا سلیقہ ہے اور تم تو جانتی ہو مجھے کھانا پکانا بھی نہیں آتا...... اماں مجھے بچالو...... مجھے بیحد ڈر لگ رہا ہے...... میں مرجاؤ گی مگر شادی نہیں کرونگی......

اماں جانتی تھیں کہ اُن کی لاڈلی بیحد ضدی ہے جو ٹھان لیتی ہے وہ کر کے ہی دم لیتی ہے۔ مرنے کا سنا تو گھبرا کر بولیں...... میری بیٹی شادی نہیں کرنا چاہتی پھر اُس کے ساتھ زبردستی کیوں کی جارہی ہے۔

پنڈت جی جو اپنی مذہب فطرت سے مجبور ہو کر گھر میں ہمیشہ خاموش رہ جاتے آج گرج پڑے۔ تم خاموش رہو...... یہ سب تمہاری ہی لاپرواہی کا نتیجہ ہے جو آج میری بیٹی کی زبان بے لگام ہوگئی...... اور اس نے کھلے عام شادی کرنے کے لئے انکار کردیا...... پھر بیٹی سے مخاطب ہوئے...... ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... یہاں تیری دیدی تیرے ساتھ ہوگی...... ہم بھی بے فکر ہوجائینگے۔ روپا نے سوال کیا...... دیدی...... یہاں...... وہ کیوں اور کیسے......

باپ بولے...... آج اُس کی بھی شادی ہورہی ہے...... روپا نہیں جانتی تھی کہ اس کی دیدی اپنی سسرال میں کھڑی ہے...... اُس کو ایکدم خیال آیا...... تو یہ ساری سازش دیدی کی ہے۔ اماں ٹھیک ہی کہتی

تھیں سوتیلی بہن پر کبھی بھروسہ نہ کرنا...... اُس نے غم اور غصے بھری نگاہوں سے دیدی کی طرف دیکھا جو بے بسی کی حالت میں اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور مجرمانہ سی خاموشی کے ساتھ روپا کو دیکھے جا رہی تھی......

روپا دھیمی آواز میں بولی...... دیدی میں نے کہا تھا ناں مجھے نہیں چاہیے تمہارے راجکمار کا چھوٹا بھائی پھر یہ سب کیوں...... میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں۔ نہیں چاہیے مجھے دھن دولت...... تم نے آخر میرے ساتھ سوتیلی بہن جیسا سلوک کر ہی ڈالا...... میرے سارے سپنے توڑ ڈالے...... اب میں کیسے جیونگی......

سنجیونی بولی...... یہ کیا کہہ رہی ہے تو...... سوتیلی...... نہیں گڑیا...... ایک تو ہی تو میری اپنی ہے...... میری مجبوری اور بے بسی کو سمجھنے کی کوشش کر...... جتنی مجبور تو ہے اُس سے کئی گنا زیادہ بے بس اور مجبور میں ہوں۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تکے جا رہی تھیں۔ تب ہی کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری......

لمبا قد...... حسین مسکراتا چہرہ...... پہلے سنجیونی نے دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ ایک نظر لڑکے کو دیکھ تو لے...... شاید...... روپا کو دیکھ کر لڑکے کے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے تھے...... وہ کھڑا اُسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا اور اس کی مسکراہٹیں پیغام دے رہی تھیں کہ وہ ''انکار'' سننے کو تیار نہیں......

من موہن جی کہہ رہے تھے...... زمانہ بدل رہا ہے...... تم گھبراؤ نہیں...... میرا بیٹا تمہیں کھانا پکانا سکھا دے گا...... شرم و حیا کی لالی سے روپا کا چہرہ چھلک اٹھا تھا...... اُس نے اپنی دیدی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تم کتنی اچھی ہو دیدی اور میں ہمیشہ ہی غلطیاں کرتی رہتی ہوں۔

گنگا حسب عادت سچویشن کے مطابق خود کو کس قدر تبدیل کر لیتی تھی۔ آج بھی سب کے سامنے سنجیونی کی سگی ماں ہونے کا ڈھونگ رچا رہی تھی......

دل کی چوٹوں نے پنڈت جی کو ایک پل چین سے جینے نہیں دیا تھا...... آج منڈپ پر دونوں بیٹیوں کو بیٹھا دیکھ اُن کے دل کو سکون مل گیا تھا...... وہ دونوں کے خوبصورت مستقبل کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے......

انہوں نے بھگوان سے ہمیشہ یہی تو مانگا تھا...... بیٹیوں کے لئے ایک مضبوط سائبان''

☆☆☆

یہ زندگی ایک عجیب سفر ہے

اماں آپ جانتی ہیں جہاں شور و ہنگامہ اور دولت کی نمائش ہو مجھے وہاں جانا بالکل پسند نہیں۔اماں نے مسکرا کر کہا بس آج تو جانا ہی ہوگا...... تمہارے بابو جی باہر گئے ہیں تمہارا جانا ضروری ہے...... جب دونوں اندر گئے تو شادی کے ہنگامے عروج پر تھے۔اماں نے ایک نظر اپنے روٹھے بیٹے پر ڈال کر کہا...... نہ معلوم کون تمہاری آئندہ زندگی کی ساتھی ہوگی...... تمہیں تو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی...... دیپ ہنس دیا...... وہ بھی آجائے گی اماں اتنی جلدی کیا ہے...... اماں مسکراتی ہوئی خواتین کی مجلس میں غائب ہوگئیں...... سدھاکر کو دیکھتے ہی دیپ نے پوچھا...... بھارتی نہیں آئی...... وہ بولا آتی ہی ہوگی...... یہ لڑکیاں سجنے سنورنے میں بڑا وقت ضائع کرتی ہیں...... دونوں باتیں کرنے میں مگن تھے۔

اچانک دیپ نے نظر جو اُٹھائی آنکھیں سامنے میں جمی ہی رہ گئیں...... وہ پلکیں جھپکانا بھول گیا...... بھارتی کے ساتھ وہ بڑے شاہانہ انداز میں ہولے ہولے آرہی تھی...... دیپ من ہی من میں مسکایا...... ''لو اماں آپ کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہوگیا''...... سدھاکر نے دیپ کی جانب دیکھا پکارا...... کوئی جواب نہ ملا تو کونی سے ٹہوکا دیا...... دیپ چونکا...... کہاں کھو گئے بھئی...... زمین پر ہو یا جنت میں پہنچ گئے۔دیپ ہڑ بڑا کر بولا...... یہ دنیا ہی جنت ہے...... سدھاکر نے ڈانٹا...... بکواس نہ کر...... یہ شادی گھر ہے...... کوئی جنت ونت نہیں...... اسی لمحے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔دیپ کی سوالیہ نظریں جیسے پوچھ رہی تھیں...... ''آپ کون ہیں''

دیپ آنکھوں میں جگمگاتا چاند سمیٹے گھر پہنچا تو پھر نیند کہاں...... اس کا ہی خیال آتا رہا...... اب آگے کیا ہوگا...... رات بھر اسی تار بتار نے سونے نہیں دیا...... اماں کے لاڈلے نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالے تو فوراً گر سدھاکر کو طلب کیا گیا اور اس اچانک تبدیلی کا راز معلوم کرنے کا حکم صادر کر دیا۔سدھاکر نے دروازہ دھڑ دھڑایا...... دیپ نے بڑی گہری سانس گویا آہ بھرنے کے انداز میں لی تو سدھاکر نے حیرانگی سے اُس کی صورت دیکھ کر کہا...... کیوں بھئی تمہیں کیا ہوگیا۔اکیلے بیٹھے ہارے عاشق کی طرح ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہو۔نا فون نہ کوئی خبر۔تجھے کسی سے عشق تو نہیں ہوگیا...... دیپ نے مسکرا کر سوال کیا...... یار یہ عشق کیا بلا ہے...... سدھاکر ہنس دیا...... عشق؟ مجھے اس کا کچھ تجربہ نہیں...... سنا ہے ویسے عشق بری بلا ہوتی ہے۔یہ جس پر نازل ہو جائے وہ بیچارہ اپنی ذات سے لاپتہ اور بیگانہ ہو جاتا ہے...... اگر محبوب

کا ساتھ میسر ہو جائے تو یہ دنیا بہشت نظر آنے لگتی ہے اور اگر نصیب ساتھ نہ دے اور دونوں بچھڑ جائیں تو زندگی شعلہ بن جاتی ہے...... بیچارے جدائی کے الاؤ میں آہستہ آہستہ جلتے سلگتے رہتے ہیں۔ انسان نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے خیر یہ تو بیتے زمانوں کے قصے کہانیاں ہیں...... اب وہ وفا و مہر کے دن ہوا ہو چکے ہیں...... آج کل عشق کرنے کا بھی اسٹائل بدل گیا ہے۔ درمیان میں دولت آ ٹیکی ہے...... تو ہوشیار رہنا...... یہ بڑا پر خطر راستہ ہے۔ اور تو بڑے گھر کا واحد چشم و چراغ ہے......

دیپ کچھ سوچ کر بولا...... اگر اسی کو عشق کہتے ہیں تو یہ بلا مجھ پر نازل ہو چکی ہے۔ یہ حیرت انگیز خبر سن کر سدھاکر چونک پڑا...... کیا؟ کیا کہا تو نے...... مجھے قطعی یقین نہیں ہوتا...... عشق کرنے کے لیے ایک عدد لڑکی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور تجھے تو لڑکیوں سے پیدائشی چڑ ہے۔ پھر بھلا عشق کیسے ہو سکتا ہے...... یہ سن کر دیپ ہنس کر بولا...... اب تو ہی کچھ کر...... اُس محفل میں تو اُسے نظر بھر کر بھی دیکھنا میسر نہ ہوا...... میں ایک بار اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ سدھاکر گھبرا کر کھڑا ہو گیا...... نہیں یار...... تو مجھے بخش دے۔ ماسی کو پتا چل گیا تو ہم دونوں کو دروازے کے باہر پھینک دینگی...... بچپن کے یار سے دیپ کو ایسی امید نہ تھی...... بیزاری سے بولا...... تو کیسا دوست ہے...... اتنا بھی نہیں کر سکتا...... اب سدھاکر کچھ وقفہ کے بعد بولا...... یہ کام بڑے جوکھم کا ہے۔ دیپ نے کہا اگر تو نے میرا ساتھ نہیں دیا تو یاد رکھ اپنے جگری دوست کو کھو دے گا...... عاشق کی میت ذرا دھوم دھام سے اُٹھانا...... میری چتا میں آگ بھی اُسی سے ہی لگوانا...... سدھاکر دیپ کی جنونی حالت دیکھ کر ہنس دیا...... اب حق دوستی تو ادا کرنا ہی ہوگا...... کون ہے وہ جس کو دیکھتے ہی تیرے پتھر دل میں پھول کھل اُٹھے...... دیپ سر تھام کر بیٹھ گیا...... اُس کی معصومیت پر سدھاکر کھلکھلا کر ہنس پڑا...... معلوم ہوتا ہے یہ تیرا جنون ہے۔ یعنی یہ کہ ادھر عشق عروج پر ہے اور معشوق کا اتہ پتہ ہی نہیں......

معاملہ ذرا سنگین لگتا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں اُسے کہاں ڈھونڈھنے جاؤں جس کا نام تک نہ معلوم ہو...... دیپ نے آہستہ سے کہا۔ وہی یار...... لگتا تھا نیلے آسمان میں ماہتاب جگمگا رہا ہو...... سدھاکر کی حیرت بھری نگاہیں دیپ کے چہرے پر ٹکی رہ گئیں...... وہ لمبی چوٹی والی...... دیپ نے اثبات میں سر ہلایا...... تو اُسے دل دے بیٹھا ہے...... دل کا کھیل کھیلنا آسان نہیں ہوتا۔ بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں...... بہتر ہے تو اُسے بھول جا......

دیپ نے کہا اب تو دل کا دل سے سلسلہ جوڑ ہی لیا ہے تو قربانیاں بھی دینگے...... اب انجام جو

بھی ہو...... سدھاکر فکر آمیز انداز میں بولا...... اگر تیرا یہ جنون عشق سرد پڑ گیا تو وہ ناحق بدنام ہو جائے گی...... یہ زندگی بڑی قیمتی شے ہے اس کا سودا جلدی میں نہیں کرتے...... دونوں خاموش تھے۔ سدھاکر پھر بولا۔ اپنے دل سے بار بار سوال کر، کیا تیری محبت سچی ہے۔ تو اس سے بے وفائی یا کسی اور طرح کی بے انصافی تو نہیں کرے گا۔ دیپ خفگی سے بولا...... تو مجھے اس قدر ذلیل اور حقیر سمجھتا ہے۔ سدھاکر بہت فکر مند اور سنجیدہ تھا...... نہیں...... اس وقت میں تیرے لیے نہیں اُس لڑکی کے لیے سوچ رہا ہوں کیونکہ اس دنیا میں اُس کے لیے سوچنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ بیچاری یتیم ہے...... دیپ نے کہا ٹھیک ہے تو جا...... اپنے فرض نبھا...... بس اتنا بتا تا جا کہ وہ ہے کون...... سدھاکر بولا...... وہ جو بھی ہے تیری ہائی سوسائٹی کی نہیں ہے...... اگر وہ شہر کے اس کھوکھلے ماحول میں ایڈجسٹ نہ کر پائی تو...... دیپ خوش ہو گیا...... یہ کونسا بڑا مسئلہ ہے...... ہم اُس کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لینگے۔ اب اس ماحول کے چکر میں ہم اپنی خوشیاں تو نہیں مٹا سکتے...... سدھاکر نے سمجھایا...... اُس کے ماحول میں عشق کی کوئی جگہ نہیں...... وہاں سیدھی سادی شادی بیاہ کی بات چلتی ہے...... دیپ خوشی سے اُچھل ہی پڑا۔ پھر اس نیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے...... ارے بھئی لڑکی کی مرضی کے بنا تو شادی ممکن نہیں...... اور فیصلہ اُس کے بزرگ کرینگے...... میں صرف کوشش کر سکتا ہوں۔ دیپ نے بے چین ہو کر کہا۔ اب لیکن ویکن کچھ نہیں...... وہ مجھے نہ ملی تو اُس کے سوا جی کر بھی کیا کرونگا...... تو بہت ضدّی انسان ہے ٹھیک ہے کہہ کر سدھاکر چلا گیا......

دیپ گہری سوچ میں غرق کھڑکی کے باہر جھانک رہا تھا۔ سدھاکر دبے قدموں سے اندر آیا...... کیا حال ہے دیپ سے پوچھا...... بس انتظار ہے لیکن تو کیا جانے انتظار کی گھڑیاں کتنی اذیت ناک ہوتی ہیں۔ سدھاکر نے اُس کو پریشاں حال دیکھ کر کہا تیری آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے رات جاگ کر کاٹی ہے۔ خیر...... میں نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ بس ایک شرط ہے اس کو سنبھال کر رکھنا...... تب دیپ پلٹا۔ خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا...... وہ اُسی شاہانہ انداز میں کھڑی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی...... دیپ کو دیکھ کر ہلی تک نہیں...... بھارتی نے تعارف کرایا...... درتیکا یہ دیپ ہیں...... اُس نے دیپ کو دیکھا سدھاکر نے جلدی سے شرارت آمیز لہجے میں کہا اور یہ دیپ کی درتیکا ہیں...... اُس کی حیا میں ڈوبی نظریں جھک گئیں...... گلابی چہرے پر سرخی چھا گئی...... سدھاکر اور بھارتی دروازے کی طرف مڑے تو وہ بھی چل دی...... سدھاکر ہنسا...... ارے تم کہاں چلیں...... تم تو مہمان خصوصی ہو۔ آرام سے بیٹھو......

دیپ خاموش بیٹھا اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا...... اُس کی نظریں اب بھی جھکی تھیں...... وقت سرکتا

گیا...... آپ کو شہر کے لوگ کیسے لگے...... تب وہ نظریں اُٹھا کر دھیرے سے بولی...... ہم یہاں کسی کو نہیں جانتے...... جذبوں اور خماروں میں ڈوبی آواز میں دیپ نے سوال کیا۔ آپ کی ہمارے بارے میں کیا رائے ہے...... وہ چونک کر بولی...... بھلا ہماری رائے کی کیا اہمیت ہے...... دیپ کے چہرے پر شرارتی مسکان پھیل گئی...... بولا...... ہم اپنی ماں کی واحد آس ہیں اور ہم اپنی زندگی داؤ پر لگا بیٹھے ہیں...... اب ہم آپ کو کیسے سمجھائیں کہ آپ کی رائے پر ہی سارا دارومدار ہے۔ وہ بڑی خود اعتمادی سے بولی ہم گاؤں میں رہتے ہیں لیکن ایسے سادہ لوح بھی نہیں کہ شہر کا کوئی لڑکا اپنی باتوں سے ہمارا ذہن ادھر سے ادھر کر دے۔ دیپ چونک کر بولا...... یہ تو ہمارے سوال کا جواب نہ ہوا...... وہ اُسی انداز میں بولی شاید شہر کے لڑکے ہر لڑکی سے اسی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ اس میں آپ کا نہیں یہاں کے ماحول کا قصور ہے۔ جو بات آپ نے کہی سو فیصد سچ بھی ہو سکتی ہے لیکن آپ نے اتنا اہم فیصلہ اتنی جلدی کیسے کر لیا۔ دیپ بولا آپ کو دیکھا اور اُسی لمحہ ہمارے دل نے یہ فیصلہ کیا...... اُس لمحے سے اس لمحے تک ہم آپ سے ملنے کے لیے بیحد بے چین رہے...... وہ بڑی مضبوط آواز میں بولی آپ عالی تعلیم یافتہ...... ہمارے میں وہ ذہانت کہاں...... شہر کی عارضی چمکتی دنیا ہمیں پسند نہیں۔ آپ کی ہائی سوسائٹی میں ہماری جیسی دیہاتی لڑکی ایک دم ان فٹ رہے گی۔ شادی ہمیشہ برابر والوں میں ہی پنپتی ہے...... ہم دونوں کا کوئی میل ہو ہی نہیں سکتا...... بہتر ہوگا آپ اپنی زندگی کے اس باب کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیں...... دیپ اُس بلا کی با اعتماد اور سنجیدہ لڑکی کو دیکھتا ہی رہ گیا...... دیپ اس کی انوکھی فرمائش سن کر حیرت زدہ تھا...... بولا آپ اُس سوسائٹی کا خیال دل سے نکال دیں...... سادگی سے بھی زندگی بسر کی جا سکتی ہے...... دھرتیکا نے دیپ کا چہرہ بغور دیکھ کر کہا اچانک بدلنا بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ آپ اُس ماحول میں ڈھل چکے ہیں...... انسان کو اپنی فطرت بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ ایک بھول کر کے آپ زندگی بھر پچھتائیں...... وہ بیحد سنجیدہ تھی...... اس پچھتاوے کی آگ میں سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے...... وہ ہنس کر بولا...... یہ خوبصورت بھول تو ہم کر چکے ہیں...... آپ ہماری زندگی کا مقصد ہیں کیا آپ ہمارا ساتھ دیں گی...... درتیکا اب ہولے سے مسکرا کر بولی ہم نے خوشیاں کم اور دُکھ زیادہ پائے ہیں...... یتیموں کے دل ہمیشہ محبتوں کے لیے ترستے ہیں۔ اس پیاس کی شدت نے ہمیں ہمیشہ ہی تڑپایا ہے۔ نظریں خود بخود جھک گئیں...... اس خوبصورتی سے دل کی بات لبوں پر آئی تو دو دلوں کی سنسان نگریوں میں کہکشاں کا ایک نیا جہاں آباد ہو گیا......

دوسرے دن دیپ نے سدھاکر کا فون نمبر ملایا...... یار تو نے تو کمال کر دیا۔ اب پھر کب

ملاقات کروائے گا...... سدھاکر نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا...... اب ملاقاتوں کا سلسلہ بند...... یہ بتا شادی کب کرنا چاہتا ہے...... دیپ زور سے ہنسا...... ابھی...... اسی وقت نہیں یار اتنی جلدی بھی نہ کر...... صبر سے کام لے...... آج شام کو لڑکی والے تیرے گھر پہنچ رہے ہیں۔ دیپ بے تحاشہ گھبراہٹ کے ساتھ بولا۔ تو ان کے ساتھ ضرور آنا...... اکیلے میری تو سٹی گم ہو جائے گی...... سدھاکر نے مزاحیہ انداز میں کہا...... پہلے ہی مرحلے پر تیرا یہ حال ہے...... پھر تیرا یہ ناتواں دل محبت کا بھاری بوجھ کیسے اُٹھائے گا......

دیپ نے صاف کہہ دیا اگر تو نہیں آیا تو میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤنگا...... سدھاکر ہنسا...... ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا...... لڑکی والے سوچیں گے ضرور لڑکے میں کوئی عیب ہے۔ بس بات وہیں ختم...... پھر روتا رہنا زندگی بھر۔ میں آگے کچھ بھی نہیں کر پاؤنگا۔ دیپ بولا...... یہاں میری جان پر بنی ہے اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے...... سدھاکر زور سے ہنسا...... اچھا پریشان نہ ہو۔ شادی پکی...... عجیب اتفاق ہے جس لڑکی پر تو مرمٹا ہے وہ میرے چاچا کی بیٹی ہے۔ دیپ حیرت اور خوشی سے بولا سچ یار! تو نے وہ خوشی دی ہے کہ آج میرا دل میرے بس میں نہیں۔

اور یہ معصوم لڑکی اپنے گاؤں کی سہیلیوں اور گلیوں کو چھوڑ کر بڑی شان بان سے پوری عزت و وقار کے ساتھ شہر کے اس نامی گرامی خاندان میں بہو بنکر آن پہنچی۔ جہاں دنیا کی ہر نعمت کے ساتھ محبت اور وفا کے پھولوں کی مہکار تھی...... مہمانوں سے فارغ ہوا تو دیپ نے اس کمرے کا رُخ کیا جہاں اُس کی زندگی منتظر تھی۔ وہ کچھ دیر تو اُس رُخِ روشن کو دیوانہ وار گھورتا رہا۔ پھر اُس کے نازک حنائی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر دھیرے سے دبایا تو اُس نے آنکھیں کھولیں...... دیپ کی شرارتی مسکان دیکھ اُس نے شرم سے پلکیں جھکا دیں...... آپ پلکیں نہ جھکائیں...... آج کے یہ حسین پل ہم اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے ہیں۔ آپ کا یہ انوکھا روپ ہم اپنی آنکھوں میں اتار لینا چاہتے ہیں تاکہ زندگی کے ہر آنے والے دن ہر آنے والے لمحے آپ کا یہی روپ دیکھتے رہیں۔ ہم ان آنکھوں میں ڈوب جانا چاہتے ہیں......

ہم اپنی ساری محبت آپ کے دل میں اتار دینگے تاکہ آپ کو کبھی اُس تشنگی کا پھر احساس نہ ہو جس کے لیے آپ کا دل ہمیشہ ترستا ہے۔ بس آج ہمیں نہ روکنا...... جی بھر کے پیار کر لینے دیں...... یہ زندگی ایک عجیب سفر ہے...... نہ جانے کل کیا ہو جائے۔ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ خدارا یہ دل لرزانے والی باتیں نہ کریں...... اُس رات کا پورا چاند اُن کے جالنے کے سامنے رکا تھا۔ درتیکا نے چاند دیکھ کر کہا آپ کے ساتھ ہمارا آج بیحد حسین ہے ہم جانتے ہیں ہمارے آنے والے سارے کل خوشیوں سے بھرپور

ہو نگے ۔ وہ سہانی رات اُن کی سب سے پیاری رات تھی......

درتیکا سسرال میں آ کر اپنے ماضی کے سارے دکھ بھول گئی تھی ۔ اس چھت کے نیچے تو جنت کا ذخیرہ تھا۔ اماں بابا دونوں کو خوش دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے ۔ اماں بلاتیں تو وہ درتو کو روک لیتا...... اماں ہنس کر ٹال جاتیں...... دوستوں کے دعوت نامے قبول نہیں کیے...... دیپ نے کلب جانا بند کر دیا...... یونیورسٹی کا تو راستہ ہی بھول گیا تھا...... اماں اور سدھا کر نے سمجھایا بھی پر سب بے سود رہا...... سدھا کر اور بھارتی آتے تو ڈھیروں باتیں ہوتیں...... دونوں جب نانی جی سے ملنے گاؤں جاتے تو آزاد پنچھیوں کی طرح کھیتوں میں سیر کرتے...... نانی جی بھی دونوں کو آسودہ اور خوش دیکھ کر خوش ہو جاتیں......

یوں دنوں پر دن بیت گئے ۔ دیپ سب سے بے نیاز...... اپنی نرالی دنیا میں مگن تھا تو یہ دیکھ کر بابا کو فکروں نے گھیر لیا...... اماں سے بولے...... بھئی یہ ماجرا کیا ہے...... آپ کے لاڈلے نے شادی کیا کی کہ وہ دنیا بھلا بیٹھا ہے...... اُن کا مستقبل خطرے میں ہے...... آپ انہیں سمجھائیں...... اماں حسب عادت بدحواسی کے عالم میں ہانپتی کانپتی بیٹے سے بولیں...... تمہاری تعلیم سے بے توجہی اور دوستوں سے کنارہ کشی نے ہمیں فکرمند کر دیا ہے ۔ تمہاری اپنی ذات اس ایک کمرے میں کہیں گم ہوگئی ہے...... تمہاری اپنی کوئی پسند اور زندگی ہی نہیں رہی...... شاید درتو کی تعلیمی کمی کا احساس تمہیں زیادہ پریشان کر دیا ہے...... درتو سے بولیں آج کل پڑھائی کا زمانہ ہے ۔ لڑکیاں علم حاصل کر کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں ۔ علم سے ہی انسان کی قدر اور عزت بڑھتی ہے ۔ سو اب تم بھی پڑھائی شروع کر دو...... دیپ کی طرف دیکھ کر بولیں...... اس کمرے میں مقید ہو کر تم اپنی ذمے داریاں نہیں نبھا سکتے...... دنیا کے ساتھ ساتھ چلو ورنہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاؤ گے ۔ ایک دن سب سے علیحدہ ہو کر اپنی اس تبدیلی سے خود ہی بیزار ہ جاؤ گے اور اس قید سے رہائی کے لیے پھڑ پھڑاؤ گے ۔ سنتے ہی درتو کانپ اُٹھی وہی الفاظ...... نہ جانے کل کیا ہو جائے دماغ میں چکر لگانے لگے ۔

اماں کے لہجے کی سختی نے درتو کو حالات کی سنگینی کا احساس دلایا لیکن دیپ سے اُن کی بات کا قطعی نوٹس نہیں لیا تو درتو کو ایک عجیب سی گھبراہٹ ہوئی ۔ جب درتو نے دیپ کو سمجھانے کی کوشش کی تو اُس نے حیرانگی سے درتو کا چہرہ دیکھ کر کہا۔ آپ نے بھی ہمارے خلاف مہم شروع کر دی...... کام سمیٹنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے بس یہ کچھ دن ہی تو ہمارے ہیں...... جب سب کوششیں نا کامیاب رہیں تو ایک دن بابا نے اپنے بیٹے کو اپنا فیصلہ سنا دیا...... برخوردار اس دنیا میں عزت سے جینے کے لیے دولت کے ساتھ ایک

پوزیشن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔تم اپنا مستقبل گنوانے پر تلے ہو اور ہم ایسا ہونے نہیں دینگے۔آج کل لوگ کرسی کو سلام کرتے ہیں۔کرسی نہیں تو انسان کی کوئی وقعت نہیں...... ہم نے تمہارے امریکہ جانے کا بندوبست کر دیا ہے۔اگلے ماہ تمہاری روانگی ہے۔دیپ چونک گیا...... چہرے پر یکا یک گہرا استعجاب چھا گیا...... بڑی بے بسی سے اماں کی طرف یوں دیکھا کہ آپ سے یہ توقع نہ تھی...... اندرونی بے یقینی کی کیفیت چھپا نہ سکا اور برق رفتار سے باہر نکل گیا......

حالانکہ چاروں کے لیے یہ خیال بہت اذیت ناک تھا پر بابا کے حکم کو توڑنا آسان کام نہ تھا...... گھر میں ساری خوشیاں معدوم ہو گئیں۔ ورتو کے دماغ میں طرح طرح کے وہم اور شبہات جنم لینے لگے...... وہ رندھی آواز میں بولی آپ تو پریوں کے دیش جا رہے ہیں...... نہ جانے کل کیا ہو جائے۔دیپ نے اُس کے آنسو پونچھے...... پہلے تو آپ رونا بند کریں...... آپ ہماری زندگی ہیں...... ہماری زندگی کی ہمسفر...... ہم پریوں کے دیش میں ہوں تو وہاں بھی آپ ہی ہر قدم پر ہمارے ساتھ ہونگی...... ہم آپ سے کوسوں دور ہوں...... فاصلے ہمیں جدا نہیں کر سکتے...... جدائیاں تو محبت کو اور زیادہ مضبوط کرتی ہیں مگر شرط یہ ہے کہ دلوں میں بے اعتباری اور بدگمانیاں جنم نہ لیں...... وہ خود ہی بیقرار سا ہو اٹھا...... ہمیں خود نہیں معلوم آپ سے جدا ہو کر ہم جی بھی پائیں گے یا نہیں...... ہماری دنیا تو آپ ہیں...... ہم بہت جلد اپنی دنیا میں لوٹ آئیں گے۔دیپ کی بے تابیاں اور بے قراری اُس کی محبت کا ثبوت دے رہی تھیں اور ورتو کو یقین دلا رہی تھیں کہ دیپ کبھی بھٹک نہیں سکتا...... اُسے خود اپنی خوش قسمتی پر رشک آ گیا......

وہ رات بہت اداس اداس تھی۔دو دل ایسے بیقرار پہلے کبھی نہ تھے۔غضب کی پریشانی دونوں کو مسلسل جھنجھوڑ رہی تھی۔دیپ نے اپنی مضبوط بانہوں میں تھام کر ورتو کی افسردہ نگاہوں میں دیکھ کر کہا آپ ہماری طرف دیکھ کر بتائیں کیا آپ کو ہم کبھی بھول سکتے ہیں...... ورتو کی چھلکتی آنکھیں برسنے لگیں۔تو بولا آپ کے آنسو ادھر بہیں گے اور ہم اُدھر پریشان رہینگے...... ہم تو اپنا دل اور اپنی زندگی آپ کے سپرد کر کے جا رہے ہیں...... وہ رو کر بولی اگر آپ نے ہمیں بھلا دیا تو ہم۔یہاں مر جائینگے...... وہ جلدی سے بولا کوئی اپنی زندگی کو بھلا سکتا ہے۔آپ ہیں تو ہم ہیں۔دو دل آہیں بھرتے رہے اور رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی......

صبح بابا کہہ رہے تھے وہاں قدم قدم پر آزمائشوں کا سامنا کرنا ہوگا...... مجھے فخر ہے ہمارا بیٹا ذہنی طور پر مضبوط اور پُر اعتماد ہے۔تم کبھی بھول نہیں سکتے اور اس مٹی سے دور نہیں رہ سکتے...... اماں الگ نصیحتیں

دے رہی تھیں...... مجھے نہیں معلوم اپنے اکلوتے بیٹے سے جدا ہو کر میں کس طرح زندہ رہونگی...... بس تمہارا انتظار مجھے زندہ رکھے گا...... سدھاکر اور بھارتی بھی آ گئے تھے...... بچھڑنے کی گھڑی قریب آئی تو ورتو اپنے کمرے میں چلی گئی دیپ دوڑ کر آیا...... اضطراری کے عالم میں بولا...... روکیئے اپنے آنسوؤں کو یہ ہمارا راستہ روک سکتے ہیں...... دیواروں پر تصویریں دیکھ کر بولا...... دیکھئے...... ہم تو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہیں گے...... آنکھوں میں آنسو بھر آئے...... بابا کی آواز پر چونک کر بولا...... ہم چلے اپنے انہوں نے نئے سفر پر...... چلنا شروع کرینگے پھر کسی نہ کسی طرح یہ لمبی جدائی کا سفر بھی کٹ ہی جائیگا...... ہم پر بھروسہ کریں...... ہم آپ کے ہیں اور تا عمر آپ کے ہی رہینگے۔ اپنے ذہن سے سارے شک اور وہم نکال دیں۔ اور وہی پیار بھرے الفاظ...... آپ ہماری جان ہیں اور ہماری جان آپ کے حوالے کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا...... وہ دوڑ کر بالکنی میں جا کھڑی ہوئی...... دونوں کی نظریں ملیں...... اور...... پھر گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی...... اور ورتو کے دلمیں ویرانیاں پھیل گئیں...... ورتو تھکے تھکے قدم اُٹھاتی دھیرے دھیرے اپنے کمرے میں گئی...... کھڑکی سے باہر جھانک کر سوچ رہی تھی کیسے کٹیں گے یہ لمبے دن اور کالی راتیں کہ فون کی گھنٹی بجی...... چاند سے باتیں ہو رہی تھیں...... آپ کو کیسے معلوم وہ افسردگی سے بولی...... چاند دیکھا آپ کا پیغام ملا...... بس سارے بیتے پل یاد آ گئے...... بس یہی یادوں کا خزانہ ہم اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں آپ اماں بابا کا خاص طور سے خیال رکھنا...... ہم پہلی بار ان سے دور جا رہے ہیں...... اور ہاں پڑھائی ضرور شروع کر دینا...... وہ روہانسی آواز میں بولی۔ آپ اماں بابا کی بالکل فکر نہ کریں...... ہم تو آپ کے بنا بالکل تنہا ہو گئے...... ارے نہیں...... ہم تو جلد ہی آپ سے ملنے آئینگے۔ اچھا ہم چلیں...... وہ فون تھامے ہی رہی...... وہ جا چکا تھا اُس کے کہے پیارے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے...... اور اُسی وقت آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور زمین میں پیوست ہو گیا...... ہائے کیسا ظلم ڈھا رہا تھا۔ یہ وقت...... ورتو تھر تھر کانپ اُٹھی......

اماں واپس آئیں تو سیدھی ورتو کے کمرے میں گئیں...... اسکا معصوم اور مسکین چہرہ دیکھتے ہی اُن کے اندر ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ ممتا پھوٹ پڑی ساس سینے سے لگا کر بولیں ابھی ابھی تو وہ گیا ہے اور تم ادھر بالکل مرجھا گئیں۔ تم سے دور رہ کر وہ بھی خوش نہیں رہ سکتا...... اُس نے میری بات نہ مانی جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ جب دل گھبرائے اپنی ماں کے پاس چلی آنا...... ورتو کی پیشانی چومی...... ممتا کی یہ بارش ورتو کے دکھی دل پر شبنم کی طرح برسی۔ کچھ دل کو ٹھنڈک ملی تو دیکھا ماں کے چہرے

پر بھی غم اور فکر کے آثار تھے...... دھیرے سے بولی اماں آپ بھی صبر کریں...... دونوں بے حد پریشان تھیں اور ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہی تھیں......

دل یوں بے چین ہو تو نیند کوسوں دور بھاگ جاتی ہے اور اس وقت تو درتو خود اپنے آپ سے کوسوں دور تھی۔ معلوم نہیں کہاں...... ہواؤں میں...... فضاؤں میں...... اُس سے بھی بہت اوپر وسیع و عریض خلاؤں میں...... وہ تو اپنے دیپ کے ساتھ تھی۔ اس زمین سے بہت دور۔ بہت ہی دور...... اس عجب سی بیقراری کے ساتھ رات لمحہ بہ لمحہ بیت ہی گئی......

صبح کوٹھی پر عجب ہی پریشانی کا موسم اترا کہ خاموشی میں صرف اضطراب ہی اضطراب تھا...... ہر پتہ خاموش...... ہر خوشی جیسے غم کے بوجھ سے جھکی جھکی ہو...... پھولوں میں رونق نہ تھی۔ ان کی رنگ و بو وہ ساتھ لے گیا تھا...... دو دن کے بعد فون آیا تو سب کے دلوں کو چین ملا...... درتو کے سارے بدن میں خوشیاں پھیل گئیں...... درتو سے بولا...... آپ نے رات بھر سونے نہیں دیا...... آپ کے ساتھ رہنے کے عادی جو ہو گئے ہیں اب اکیلے یہ بے حساب رات دن کیسے کاٹینگے...... ہمارا بیتاب دل بس آپ کو پکارتا رہا...... دیپ کی باتیں محبت کے سارے انداز یاد دلاتی رہیں...... فون آتا...... درتو کا دل بہل جاتا...... لیکن پھر وہی خیال۔ وہی بے کلی...... دماغ سے ہٹتا ہی نہ تھا...... نہ جانے کل کیا ہو جائے......

ابھی مشکل سے دس دن ہی گذرے تھے درتو کو تیز بخار نے آ دبوچا...... جب اماں کے بلائے پر اُٹھ نہ سکی تو اماں خود اوپر گئیں...... اُس کی جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو چونک گئیں۔ فوراً ڈاکٹر کو لایا...... کچھ دن سنبھلنے میں لگ گئے...... پھر سب کھایا پیا اُلٹ دیا...... ڈاکٹر نے دیکھ کر خوش خبری دی کہ درتو ماں بننے والی ہے تو اماں نے اُسے چوم کر کہا بس اسی دن کا تو ہمیں بیحد انتظار تھا...... درتو کے دل کی سونی بستی میں شادیانے بجنے لگے...... سونی کوٹھی کا موسم پھر بدل گیا......

درتو کی طبیعت بھاری بھاری تھی۔ ادھر فون آیا تو بولی اماں سے کوئی خاص بات ہوئی...... اظہار خوشی کرتے ہوئے وہ بولا۔ اب تو یقین ہو گیا آپ اکیلی نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں...... ہم تو ابھی سے بیٹی کے خواب دیکھنے لگے...... ہم آپ کو کیسے بتائیں کہ ہم اپنی بیٹی کی ماں کو کتنا پیار کرتے ہیں...... ہماری اس نعمت کو سنبھال کر رکھنا...... آپ کی طرح کتنی لڑکیاں ہیں جن کو اتنا پیار نصیب ہوتا ہے۔ وہ بڑے فخر سے بولی...... سچ ہم دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ہیں...... وہ ہنس کر بولا...... بالکل درست فرمایا آپ نے۔ آج تو ہمارے دل کی دنیا میں دھوم مچ گئی ہے۔ دیپ کی پیار بھری باتیں درتو کے

دل کو سیراب کرتی رہیں...... جوں جوں بچہ درتو کی کوکھ میں بڑھتا جارہا تھا دیپ کی محبت کا احساس اور بھی مضبوط ہوتا جارہا تھا...... سارے وہم سارے شک مٹ چکے تھے۔

سدھا کر کی پوسٹنگ باہر ہوگئی تھی۔ بھارتی روز ہی آتی...... دیپ کا فون آتا۔ سارا حال تفصیل سے پوچھتا...... یوں وقت بڑے سکون سے بیت رہا تھا...... ایک دن بولا...... یہاں پارٹی ہوئی...... شراب کا دور دیر تک چلا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے ہمارا تو دم ہی گھٹنے لگا تھا...... یہاں کی لڑکیاں عجیب ہیں۔ ناحیا ناشرم...... بس جوان لڑکے کو دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھتی ہیں۔ سب نے خوب ڈانس کیا۔ ہم سب سے دور ہی رہے...... ہماری تو ہر خوشی آپ سے ہے...... حالانکہ دیپ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن اُس کی پرسنلیٹی کا سحر تو کسی بھی لڑکی کو بے خود بنا سکتا تھا...... اماں کی کہی باتیں یاد آگئیں...... اس کمرے سے آزاد ہونے کے لیے پھڑ پھڑاؤ گے...... اب وہ بالکل آزاد تھا...... اور امریکہ کی آزادانہ فضا میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ درتو کے دماغ میں ہنگامہ برپا ہوگیا......

درتو کی طبیعت مضمحل تو تھی ہی۔ بابا کے کمرے میں سکوت چھایا دیکھ وہ دبے قدموں اندر گئی...... دونوں تفکرات میں ایسے ڈوبے تھے کہ درتو کو کسی سنگین نقصان کی بو آئی...... بہت اصرار کے بعد اماں نے آبدیدہ ہوکر بتایا کہ دیپ نے زیادہ ڈالرز کی مانگ کی ہے...... سنتے ہی درتو کے دل پر جیسے قیامت گذر گئی۔ بمشکل خود پر قابو پا کر بولی...... اماں کچھ ضرورت آن پڑی ہوگی...... اُنہیں ڈھارس دلا رہی تھی اور خود سوچوں کے بیابان میں تنہا بھٹکنے لگی...... ہزاروں اندیشے اُس کے دماغ میں کلبلانے لگے...... اب بڑی شدت سے دیپ کے فون کا انتظار تھا......

کئی دن بیت گئے۔ حالانکہ درتو بیحد پُر اعتماد تھی لیکن دیپ کی طرف سے اتنی لمبی خاموشی اور بدلتے حالات نے اُس کے دل کو بے چین کر دیا تھا...... فون کی گھنٹی بجی تو دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے ریسور اٹھا کر مدھم آواز میں ہیلو بولی...... دیپ نے تو حال بھی نہ دریافت کیا۔ ناامیدی اور مایوسی بھرے لہجے میں بولا...... آپ اپنا اور اماں بابا کا خیال رکھنا...... آپ سمجھدار ہیں...... اب ہم اتنی دور سے آپ کو کیا بتائیں...... اور اُس ہی وقت درتو کو فون پر زور کی آوازیں سنائی دیں...... وہ بلک کر بولیں آپ خاموش کیوں ہیں...... کچھ تو بولیں...... لیکن دیپ نے کوئی جواب نہ دیا...... بات کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا...... اس معصوم لڑکی پر غم پوری قوت سے حملہ آور ہوا تو وہ خوف زدہ پوری کی پوری لرز کر بے ہوش ہوکر زمین پر آگری...... جب ہوش سنبھلے تو بے تحاشہ روتے ہوئے اماں سے بولی...... انسان بہت سے خواب

دیکھتا ہے سارے خواب پورے تو نہیں ہو جاتے...... نہ معلوم قسمت ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ آپ انہیں فوراً واپس بلالیں۔ اماں کیا کرینگے کرسی اور پوزیشن کا...... اماں خود تڑپ رہی تھیں۔ بمشکل بولیں۔ اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ بچے پر بُرا اثر پڑے گا۔ ہم تینوں تو کسی کے سامنے منہ بھی نہیں کھول سکتے...... ہمیں اس غم کو پی جانا ہوگا۔ اپنے آنسو اندر ہی اُتار لینے ہونگے...... بابا جی بہت ہمت اور طاقتور شخصیت کے مالک تھے، پلوں میں بکھر گئے تھے۔ بولے ہم برباد ہو گئے۔ ہمارا گھر اُجڑ گیا...... مجھے تو کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ میرا خون وہاں جا کر بدل جائے گا اور ہمیں یوں دھوکہ دے گا...... بیٹی میں نے تیری تقدیر بگاڑ دی...... ورتو کا دماغ پھٹا جا رہا تھا...... دل کے اندر کی سلگتی آگ سارے تن من کو جلا رہی تھی۔ تینوں کا قرار اور چین لُٹ گیا تھا...... اُن کی چھوٹی سی دنیا غم کے سمندر میں ڈوب گئی تھی......

دوسرے دن ورتو اور دیپ کی شادی کی پہلی سالگرہ پر بھی دیپ کا فون نہ آیا تو ورتو رو رو کر نڈھال ہو گئی۔ اُس کا دل کہتا تھا کہ دیپ اُس سے کبھی بے وفائی نہیں کر سکتا۔ ضرور کوئی بُری مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ رات بھر اپنے دیپ کی یاد میں جاگتی رہی اور لرزتی کالی رات آہستہ آہستہ کٹ گئی۔ آفتاب طلوع تو ضرور ہوا پر اس گھر پر سحر نہ اتری۔ اماں بابا خود شکستہ دل۔ شکستہ حال تھے۔ اماں کی محبت اور بے پناہ ہمدردی نے ورتو کو تھام لیا تھا۔ جب جب ورتو کی شدت نا قابل برداشت ہو جاتی تو وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر خوب روتی...... رات کے سناٹے میں دیپ کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر رو رو کر سوال کرتی۔ کہ آخر کیا جُرم تھا میرا...... کیوں خفا ہو گئے...... جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو اپنے شکست خوردہ دل کو خود ہی سمجھالیا کہ ہیں تو میرے ہی ایک دن ضرور میرے پاس لوٹ آئینگے......

بابا کے دوست امریکہ جا رہے تھے۔ ورتو نے انہیں اپنے سارے زیورات دیکر اُن سے التجا کی کہ سب کچھ فروخت کر کے ڈولرز دیپ کو دے دیں۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ پہلے اُس کا کوئی سراغ تو ملے۔ وہ آس و نراش کے دن کاٹنے بیحد دشوار ہو گئے۔ واپسی میں ہولناک خبر کہ دیپ لاپتہ ہے سب پر بجلی کی طرح گری۔ ایکدم بے تحاشہ خوف اور ہیبت نے ورتو کو جکڑ لیا...... وہ بدحواسی کے عالم میں اوپر دوڑی۔ محبت اور اعتماد کا یوں خون ہوا تو دل کی ہر دھڑکن چیخ اٹھی...... ''آپ کے بنا کیا جینا'' جیسے ہی چھت سے نیچے کودنے کا ارادہ کیا اندر سے ایک دھیمی سی آواز پر وہ چونکی...... اماں میں تو ہوں'' ...... وہ رُک گئی...... تب ہوش آیا...... وہ تو مر بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس کی کوکھ میں اُن کی محبت سانسیں لے رہی تھی...... وہ وہیں بیٹھ کر چیخ چیخ کر رونے لگی...... اماں اوپر دوڑی گئیں اور ورتو کے ہچکولے کھاتے ہوئے وجود کو اپنے سینے میں

بھینچ لیا...... ایک بچے کی پکار اور ایک ماں کی ممتا کی بوچھار نے درتو کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کاتب تقدیر کا لکھا تو کوئی مٹا ہی نہیں سکتا...... اور مجھے تو ازل سے ہی مقدر میں ویرانیاں۔ محرومیاں اور وحشتیں ہی ملی ہیں۔ سو اب خدا جیسے چلائے میں ویسے چلے جاؤنگی...... وہ رات بھر روتی رہی، سسکتی رہی...... اور جدائی کی تپش سے سلگتی ہوئی بے رحم رات بیت ہی گئی...... اور پھر ایسے ہی بے شمار سیاہ راتیں گزرتی چلی گئیں......

نانی جی کا کمزور دل یہ روح فرسا خبر برداشت نہ کر سکا۔ ان کی سانسوں کی ڈور ٹوٹی اور درتو کا ایک اور سہارا اٹوٹ گیا۔ اُسے پیار کرنے والے ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ سامنے بکھری دولت اُسے ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ بے شمار غم۔ فکریں ذمے داریاں...... مسائل اور وہ تنہا...... اُس کی زندگی بھڑکتی ہوئی آگ سے کم نہ تھی۔

وقت بڑی دھیمی چال سے سرک رہا تھا...... آخر قدرت کو اُس کے اوپر رحم آ ہی گیا...... اُس کے خالی دامن میں اپنا سب سے بہترین تحفہ ڈال دیا۔ بچے کی پہلی چیخ دل تک پہنچی تو دل کے کونے کونے سے آوازیں اُٹھیں...... ''آپ کی جان ہمارے پہلو میں ہے'' درتو نے ایک گہری اداس سانس لے کر بھارتی سے سوال کیا...... کیا دنیا میں سب سے کم وقعت اور کم قسمت والی عورت میں ہی ہوں...... خدا کی عدالت میں میری سنوائی کیوں نہیں ہوتی...... درتو کی دردبھری آواز سن کر بھارتی ہل ہی گئی...... پھر سنبھل کر بولی خدا بڑی نصیب والی لڑکی کو ماں بننے کا اعزاز بخشتا ہے...... مائیں کبھی بدقسمت نہیں ہوتیں...... یہ سنتے ہی یکا یک اس ماں کے بنجر دل میں ممتا کے پھول پھوٹے اور ایک نئی طاقت و توانائی بن کر وہ مہک سارے جسم میں پھیل گئی...... دل بار بار کہہ رہا تھا ایک بار آیئے اور اپنی اس دنیا کو دیکھ جایئے......

چندا کی آمد سے ماحول بدلا تو سب کے دلوں کو تھوڑی راحت نصیب ہوئی...... درتو اپنے اندر کے دکھوں اور پریشانیوں کو چھپا کر کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ایک سال کا لمبا عرصہ بیت گیا...... دیپ کی کوئی خبر نہ ملی تو بابا کو درتو اور چندا کے مستقبل کی فکر لاگو ہوگئی۔ انہوں نے سارے کاغذات پر درتو کو دستخط کرنے کو کہا تو اُس کے حواس ہی اُڑ گئے۔ بولی نہیں...... یہ سب تو اُن کا ہے''۔ بابا بڑی مایوسی سے بولے میری بچی وہ ہی ہمارا نہیں رہا۔ تم بہت بھولی اور معصوم ہو جو اس حقیقت کو قبول نہیں کرنا چاہتی ہو...... میں جانتا ہوں اگر وہ کبھی لوٹ آیا تو تم دولت تو کیا اگر وہ تمہاری جان کا بھی سودا کرے گا تو تم دریغ نہ کرو گی...... تم اپنی نانی کی دی ہوئی دولت جس طرح چاہو خرچ کر سکتی ہو وہ تمہاری ہے...... میری ساری دولت کی وارث چندا ہوگی۔ اُس نے ہمارے خاندان کی عزت، عظمت، اور ہماری بزرگی کا بھی خیال نہیں کیا......

ہمیں تباہ ورسوا کر دیا...... بیٹے ہمیشہ سوچتے ہیں وہ سیاہ کریں یا سفید باپ کی دولت پر اُن کا ہی موروثی حق ہوتا ہے...... میں بڑا بدقسمت باپ ہوں اپنے اکلوتے بیٹے سے اُس کا یہ حق چھین رہا ہوں۔

درتو کے اندر ایسا زبردست شور مچا کہ اُس کی پوری ہستی کو ہلا گیا...... پلوں میں اپنے مایوس احساسات پر قابو پا کر بولی...... بابا یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ ہمیں بھلا نہیں سکتے۔ وہ ضرور کسی بڑی مصیبت میں گھرے ہیں...... بابا جو خود کو مظلوم سمجھتے تھے پھوٹ کر رو پڑے۔ درتو بے اختیاری کے عالم میں اپنے بابا کے پاس گئی اور اپنے پلو سے اُن کے آنسو پونچھے...... کسی طرح اپنی جان کو سنبھالا اور لرزتے کانپتے ہاتھ سے دستخط کر دیئے......

رات میں درتو اُس کمرے میں گئی جہاں کبھی زندگی مسکراتی تھی...... محبت ہی محبت تھی خوشیاں قہقہے لگاتی تھیں اور آج تنہائی تھی اور ایسی بھیانک خاموشی کہ دم گھٹتا جاتا تھا...... آج وہ ایک مجبور باپ کا دکھڑا اُس کے بیٹے کو سنا رہی تھی...... اُس کی یاد دلا رہی تھی کہ وہ اُن کے جسموں حصہ ہے...... ان کی آنکھوں کا نور ہے...... اُن کے دلوں کا سرور ہے...... ان کی خواہشات۔ امیدوں اور محبت کا خیال کر کے اُس سے جلد واپس آنے کی التجا کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دیپ بھی اپنے لہو سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا...... اور اگر آنے میں دیری کی تو سب کچھ تباہ ہو جاۓ گا......

دیپ کا سراغ لگانے کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوئی تو بابا کو جوان بہو کی فکر لاحق ہوئی۔ اُن کے بعد درتو کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا...... رندھے گلے سے ورتو سے کہا کہ میری گرتی صحت بتا رہی ہے کہ تمہارا یہ سہارا بھی جلدی ہی گرنے والا ہے۔ عورت تو ہمیشہ ہی سہاروں کی محتاج ہوتی ہے...... سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی انسان سہاروں کے بغیر نہیں جی سکتا...... میرا بیٹا بڑا بدنصیب ہے جو تم جیسی نیک اور وفادار لڑکی سے ناتا توڑ کر نئے رشتے جوڑ رہا ہے...... سنا ہے وہاں کسی سے...... وہ آگے نہ بول پائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے...... ورتو کے اندر ایسا بڑا دھما کہ ہوا کہ اُس کی ساری دنیا ہل گئی...... جلد ہی اپنے تن من کو سنبھالا اور بولی یہ سب جھوٹی باتیں لوگوں نے پھیلائی ہیں...... وہ ضرور کسی ناگہانی آفت میں پھنسے ہیں...... نہ معلوم وہ کس حال میں ہیں۔ بابا جب اعتماد اور یقین کو چوٹ لگتی ہے تو انسان اندر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ کیا ہم تینوں مل کر ایک دوسرے میں تھوڑا سا اعتماد پیدا نہیں کر سکتے...... میں صدموں پہ صدمہ سہتی رہونگی لیکن یہ رسوائی ہرگز برداشت نہ کرونگی...... میرے مقدر نے مجھے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے...... ایک حصہ اُن کے ساتھ ہے اور دوسرا آپ لوگوں کے...... میرے اس آدھے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے

بچالیں...... میں اُنہیں بھلا کر اپنی بیٹی کو یتیم نہیں بنا سکتی...... کوئی ہزار شفقتیں لٹائے باپ کی جگہ کبھی نہیں لے سکتا...... مجھے کسی غیر کے سہارے کی ٹیک منظور نہیں...... میں بیحد مصیبتوں اور عذابوں میں گھری ہوں...... میرے دُکھوں میں اور اضافہ نہ کریں...... آپ کا یہ فیصلہ پہلے فیصلے سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوگا...... آپ صرف مجھے میری ٹوٹی زندگی کے ٹکڑے سمیٹنے کا موقع دیں۔ میں ابھی ناسمجھ اور نادان ہوں...... علم سے ہی عقل اور فہم میں اضافہ ہوتا ہے...... اعتماد پیدا ہوتا ہے...... مجھے پڑھنے کی اجازت دے دیں...... مجھے اپنے اندر میں مکمل اعتماد پیدا کرنا ضروری ہے...... اور یہ اعتماد نہ کسی مرد کے سہارے سے مل سکتا ہے اور نا ہی دولت سے خریدا جا سکتا ہے۔ یہ اعتماد تو انسان کو صرف علم سے ہی حاصل ہوتا ہے...... بھارتی اس کی زندہ مثال ہے...... میں کالج جانا چاہتی ہوں......

درتو کی آہ وزاری اور بیقراری دیکھ بابا تار تار ہو گئے...... دھیمی اور شکستہ آواز میں بولے، دنیا والوں کی حقارت آمیز نظریں تمہیں تیروں کی طرح چھید دیگی...... ظالموں کی باتیں ہی تم جیسی کمزور لڑکی کو قتل کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ لوگ پتھر برسا کر تم کو زخمی کر دیں گے...... کس کس کے سوالوں کا جواب دو گی...... درتو بڑی ہمت سے بولی بابا میں تو پوری کی پوری دُکھوں کے پہاڑ تلے دبی زخمی ہو چکی ہوں اب کنکروں سے کیا ڈرنا۔ میں گاؤں کی لڑکی ہوں میرے قدم ڈگمگا نہیں سکتے آپ مجھ پر بھروسہ کریں...... اور پھر اُس کے اندر کا سارا لاوا آنسو بن کر باہر نکل پڑا۔ ایک کم عمر لڑکی کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر بابا کی جُھکی گردن اوپر اٹھی...... اماں نے درتو کو گلے لگا کر کہا تم بڑی بہادری سے اس آفت کو جھیل رہی ہو...... مجھے یقین ہے کہ تم سارے حالات پر قابو پالو گی اور تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں...... درتو کو اپنی اندھیری دنیا میں ایک بار پھر ہلکی سی روشنی دکھائی دی......

بابا کی باتوں نے یہ تو واضح کر ہی دیا تھا کہ سماج میں ٹھکرائی ہوئی عورت کا کوئی درجہ نہیں...... کوئی حیثیت نہیں...... اُس کا دل تو سڑک پر رولتے ہو پتھر سے بھی بدتر ہوتا ہے...... یہی غم درتو کے لیے سارے غموں سے بھاری تھا...... اُس کے انگ انگ نے دیپ کو پکارا...... یہ کس جرم کی اتنی کٹھن سزا دے رہے ہیں کہ میری جان بھی نکلی جاتی ہے...... بچپن سے ملی محرومیوں نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا...... میری ہر خوشی دوسروں کی خوشیوں پر قربان ہوتی رہی، نانی جی کے آنسوؤں نے میرے قدم روک لئے۔ میں شہر جا کر پڑھ نہ سکی...... آپ کی محبت کی سریلی دھن میں ایسی دلکشی تھی کہ میں اپنے آپ کو بھول گئی۔ جب ہوش آیا تو دیکھا جس کی ایک نگاہ پر میں اپنا تن من وار چکی تھی وہ مجھے تنہائی کی دہکتی آگ میں چھوڑ کر چلا گیا...... آپ

نے مجھے دیدہ و دانستہ زخمی کیا ہے اور آج بابا نے میرے ہرے زخم پر تیزاب چھڑک دیا...... میں تڑپ رہی ہوں۔ بڑی توہین ہوئی میری...... اگر آج یہ دیہاتی لڑکی کمزور پڑ جاتی تو آپ کی عزت نیلام ہو جاتی۔...... آپ کی بیوی...... بیٹی...... نام و عزت کچھ بھی باقی نہ رہتا...... سن رہے ہیں آپ...... بابا سوچتے ہیں صرف مرد ہی عورت کی زندگی سنوار سکتا ہے۔ آپ کی عدم موجودگی نے یہ تو ثابت کر ہی دیا کہ مرد کا مضبوط سہارا کبھی بھی گر سکتا ہے...... پھر کسی مرد کا سہارا کیوں لوں...... اب میں گاؤں کی وہ کمزور لڑکی نہیں رہی کیونکہ میں اب جان چکی ہوں کہ جب کمزور عورت پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں تو نہ زمین پھٹتی ہے ناں آسماں گرجتا ہے۔ ساری کائنات خاموشی سے اُس کی بربادی کا تماشہ دیکھتی رہتی ہے...... اور عورت منہ بند کر کے سب کچھ سہتی جاتی ہے...... اب آپ ہی میرا فیصلہ کریں جس کو آپ نے اتنی بڑی دنیا میں بے آسرا چھوڑ دیا ہے۔ کیا میں ایک اور مرد کے قدموں میں سر جھکا دوں یا خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں...... خود مضبوط اور پر اعتماد ہونگی تب ہی تو آپ کی بیٹی کی صحیح طور سے پرورش اور تربیت کر سکونگی...... آج پہلی بار اُس نے گلہ کیا تھا اور پھر کچھ دیر کے بعد خود سے شرمندہ بھی ہوگئی...... یہ میں کیا سوچ گئی...... نہ جانے آپ کن اذیتوں کا سامنا کر رہے ہیں درتو کے آنسو سلسلہ وار بہتے رہے......

کالج جانے کا دن بھی آ گیا...... درتو نے اپنی اندرونی تمام تر توانائیوں اور قوتوں کو مجتمع کیا...... رات کے اندھیرے میں اپنے تمام جذبوں کو دل میں دفن کر کے ماتھے سے لال بندیا مٹا ڈالی...... کانچ کی لال اور ہری چوڑیاں جن کی کھنک دیپ کے دل کو لبھاتی تھی اتار ڈالیں...... مانگ کا سیندور دھوڈالا...... یہ کرتے ہوئے آنکھیں متواتر برستی رہیں...... کانپتے ہاتھ بار بار رک جاتے...... ننگی کلائیاں دیکھ ستانے لگیں...... آئینہ میں دیکھا تو اپنی ویرانی اور بے بسی پر ترس آ گیا...... اُس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے سارے رنگین کپڑے الماری میں بند کر دیئے۔ آج اس شاہراہ کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر چکے تھے...... زندگی نے ایک نیا موڑ لے لیا تھا...... وہ جانتی تھی آگے کے سفر میں کانٹے ہی کانٹے ہیں...... پر آگے چلتے رہنا ہوگا۔

درتو اپنی ضبط کی ساری حدیں پار کر گئی تھی...... صبح سفید ساڑی میں ڈھکا...... چھپا اپنا بدن آئینہ میں دیکھا تو پاؤں تلے دھرتی دھڑ دھڑ کرنے لگی...... دماغ تیزی سے ماضی کی طرف دوڑا...... اُس وقت بھارتی نے اُس کے ڈگمگاتے وجود کو تھام لیا...... بھارتی کا چہرہ غم سے بے حال تھا...... دھیمی آواز میں بولی...... یہ کیا حال بنالیا...... درتو نے پست اور مایوس لہجے میں کہا قسمت کو یہ ہی منظور تھا...... جو ہوا سو ٹھیک

ہی ہوا...... درتو نے کتابیں اُٹھائیں اور بھارتی کے ساتھ سب سے کٹھن منزل کی طرف بڑھی...... اماں اور بابا کا سامنا کرنا آسان کام نہ تھا لیکن اُسے ان سے آشیرواد بھی تو لینا تھا۔ اپنی بہو کا یہ منحوس روپ دیکھ کر دونوں کی بھاری بھاری لال آنکھوں سے آنسو برس پڑے...... اماں کے دل سے ایسی آہ نکلی کہ ساری کائنات ہی کانپ اٹھی...... ورتو بڑی ہمت سے اس عجیب مرحلے کو بھی پار کرگئی......

شہر کی دنیا سے وہ واقف نہ تھی۔ دماغ میں اندیشوں کا جال بچھا تھا۔ پہلے پہل بہت گھبراہٹ ہوئی اور پھر راہیں خود بخود آسان ہوتی گئیں...... درتو کی زندگی ایک معمول پر چل پڑی تھی۔ رات جب سارے کاموں سے فراغت ہوتی تو وہ اپنی پناہ گاہ میں جا کر سارا حال دیپ کو سناتی۔ اُسے محسوس ہوتا دیپ اُس کے روبرو بیٹھا باتیں کرر ہا ہے تو دل کو تھوڑا سا اطمینان ہو جاتا......

بھارتی اور درتو لان میں بیٹھی تھیں۔ اُسی وقت سدھاکر آ گیا...... ماحول ہی حال سنا رہا تھا۔ سدھاکر پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ بڑی پریشانی سے سوال کیا...... یہ کب اور کیسے ہوا جو مجھے خبر بھی نہ دی...... پھر درتو کی زبانی اُس کی زندگی کا وحشت ناک قصہ سن کر اُسے اور بھی شدید دھچکا لگا...... بہن کو بانہوں میں تھام کر بولا برسوں کی دوستی کے باوجود بھی میں اُسے پہچان نہ سکا...... بڑا دھوکہ دیا ہے...... بڑی بے انصافی کی ہے دیپ نے ہمارے ساتھ...... کبھی کبھی شخصیتیں اتنا بڑا دھوکہ دے جاتی ہیں کہ انسان اپنے ہوش بھول جاتا ہے...... بھائی اپنی بہن کی بربادی کا الزام اپنے سر لے رہا تھا۔ اور بہن اپنی تیرہ بختی کو الزام دے رہی تھی...... بڑی آزادگی سے بولی انہیں الزام نہ دو۔ وہ نہ ہوتے ہوئے بھی ہر وقت میرے ساتھ ہیں...... مجھے تو بچپن سے ویرانیاں ہی ملی ہیں۔ مجھے ان پر بے پناہ اعتبار ہے وہ کبھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کسی طرح آگے کھسک رہی تھی۔ ایک دن جب چندا نے اپنے بابا کے لیے پوچھا تو درتو دیر تک ہل بھی نہ سکی...... بس آنسو رواں رہے۔ جب چندا بڑی ہوئی تو ماں کے سفید لباس نے ہی سب کچھ ظاہر کر دیا...... پھر اُس نے کبھی سوال نہیں کیا...... برس کے برس اپنی تعلیم کی منازل طے کرتی ورتو آگے بڑھ رہی تھی۔ اور اب کالج میں پڑھانے لگی تھی...... بابا کا حال ابتر ہوتا ہی گیا...... اُن کے دل میں امید کی لو بجھی تو غموں کے اندھیروں میں وہ ڈوبنے لگے۔ درتو بہت محبت سے لبھاتی لیکن اُن کے درد کا درماں نہ بن سکی...... اُن کے اس غم کا علاج کہیں نہ ملا...... آخر بابا نے دکھوں کی بھاری سلوں کے نیچے دب کر دم توڑ دیا...... کوٹھی پر غموں کے سیاہ بادل اور گھنے ہو گئے...... بابا کے جانے سے درتو کو تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ سب جس کشتی میں سوار تھے اس میں ایک بڑا سوراخ ہو گیا ہو۔ کشتی میں پانی بھر گیا ہو اور

طوفانی لہروں سے ٹکرا ٹکرا کر ڈوبنے ہی والی ہو...... اماں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ یوں ہی بیحد دل گرفتہ تھیں اب جیون ساتھی جو گیا تو کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئیں...... درتو انہیں تسلیاں دیتی۔ اماں میں نے بھی تو صبر کر لیا۔ ہماری خاطر آپ بھی صبر کر لیں...... ذرا سوچیں آپ کے بنا ہمارا کیا حشر ہو گا۔ آہستہ آہستہ اماں تھوڑی سنبھل گئیں......

چندا اب سولہ برس کی ہو گئی تھی...... دنیا کی اونچ نیچ سمجھنے لگی تھی...... بیحد ذہین اور خوبصورت تھی لمبا قد گورا گورا رنگ۔ اُس کی سیاہ گہری آنکھوں میں باپ کی مسکراہٹیں تھیں۔ ویسی ہی چال۔ وہ تو دیپ کا ہو بہو عکس تھی۔ اماں اور درتو کے دلوں کی راحت تھی...... اس کوٹھی کی چھت پر مسلسل مصیبتوں اور آفتوں کی بوچھار جاری رہیں...... اماں سیڑھیوں سے ایسی گریں کہ پھر دوبارہ کھڑی نہ ہو سکیں...... اب وہ کاندھے نہ رہے جن پر سر رکھ کر درتو آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی...... اُن کے ہی پیار اور تعاون کا یہ ثمر تھا کہ درتو اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تھی......

درتو اکیلے بہت تھک گئی تھی۔ فکروں اور غموں نے ایسا جکڑا کہ دل کا روگ لگ گیا...... ڈاکٹر نے آرام کرنے کی ہدایت دی تھی...... درتو کے دل میں ایک عجیب سی گھبراہٹ اور بے چینی تھی جیسے کوئی بڑا ہولناک حادثہ ہونے والا ہو...... رات کافی ہو چکی تھی...... چندا ماں کو دوائیاں دے کر بتی بجھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی...... اور تب ہی گھنٹی بجی...... درتو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...... ''آپ'' چندا کی نفرت انگیز آواز نے درتو کے اندر ایک شور برپا کر دیا...... بھونچال آ ہی گیا...... اُس اندھیرے میں نہ جانے وہ اس شخص کو کیسے پہچان گئی تھی جسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا...... ''بیٹا میں تمہاری ماں سے ملنا چاہتا ہوں'' درتو کے دل میں یادوں کے سارے دریچے کھل گئے۔ ساری اُمنگیں توانا ہو گئیں...... دل اپنے محبوب سے ملنے کو تڑپ اٹھا...... اس آواز کو سننے کے لیے وہ برسوں سے ترس رہی تھی...... چندا کے زہر خند لہجے پر چونکی...... جب تک میں زندہ ہوں میں آپ کو اُن سے ہرگز ملنے نہیں دونگی...... کبھی نہیں...... رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ چیخ رہی تھی۔ جو وحشیانہ برتاؤ آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے اُس کے بعد آپ نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی...... آپ کی لگائی آگ میں سب کچھ جل کر بھسم ہو چکا ہے راکھ ہو گیا سب کچھ...... اب آپ کیا راکھ بٹورنے آئے ہیں۔ آپ نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے ماں باپ کو بڑی بیدردی سے تڑپا تڑپا کر موت کے گھاٹ اُتارا ہے...... میری ماں کی محبت اور وفا کا بھی کیا خوب صلہ دیا...... ایک سہاگن کو بیوگی کا چولا پہنا دیا...... آپ نے میری ماں کے مار ڈالنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی

تھی...... خدا اُن پر مہربان ہو گیا کہ ان کی خالی جھولی میں مجھے ڈال دیا اور میں اُن کے جینے کا بہانہ بن گئی...... میں پوچھتی ہوں کیا قصور تھا اُن کا جو آپ نے اُنہیں اتنی سخت سزا دی...... آپ نے اپنوں ہی پر اتنے ظلم اور ستم کیوں ڈھائے۔ ''بیٹی میری بات تو سنو'' ...... چندا کے اندر سے سلگتا انگارہ بھڑکا...... مجھے بیٹی کہہ کر مت پکاریئے...... کیونکہ آپ اس رشتے کا مطلب بھی نہیں جانتے...... میں نے جب سے ہوش سنبھالا کوئی ایسی باوقار شخصیت کو اپنے اردگرد کبھی نہیں دیکھا جسے باپ کہہ کر پکار سکوں...... باپ کا رتبہ دے سکوں...... میں صرف اپنی ماں کی بیٹی ہوں...... وہ پھر بولے...... یہ خط اپنی ماں کو دے دو''۔ وہ وحشت زدہ انداز میں چیخی...... آپ نے اس گھر میں آگ لگا دی۔ جلا ڈالئے اس خط کو بھی...... آپ نے میری ماں کی کسی ضرورت کو نا ہی سوچا نا سمجھا...... برسوں بیت گئے...... اب میری ماں کے پاس بھی آپ کے لیے وقت نہیں رہا...... زہر آلودہ لہجے میں بولی...... چلے جایئے...... فوراً چلے جایئے...... آئندہ ادھر کبھی مت آنا......

دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا...... بیٹی کو دیکھتے ہی باپ کے مردہ دل میں جان آ گئی تھی اب وہی دل خون کے آنسو بہا رہا تھا کہہ رہا تھا کاش وہ کچھ دیر اور کھڑی یوں ہی چیختی چلاتی رہتی...... میری آنکھوں کے سامنے تو رہتی۔ وہ دیر تک کھڑے اپنے ہی گھر کا بند دروازہ دیکھتے رہے...... دروازے کے ادھر در تو کے اندر اتنی زور کا دھماکہ ہوا کہ یکا یک سارے زخموں کے منہ کھُل گئے اور اسے اندر سے لہولہان کر گئے...... اُس کا دم گھٹنے لگا...... چندا تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی......

کتنی غلط فہمی تھی ماں کو کہ بیٹی اُس کے سارے دکھوں سے بے خبر تھی...... وہ تو نہ جانے کب سے اتنا بڑا دُکھ اپنے دل میں پالے تھی...... اپنی ماں کی طرح وہ بھی اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی۔ در تو بیٹی کی سسکیاں سن رہی تھی...... باپ نے بیٹی کے ساتھ بڑی بے رحمی برتی تھی۔ بڑا دھوکہ دیا تھا اپنی اکلوتی بچی کو۔ آج اُس بیٹی کا زخم خوردہ دل چیخ چیخ کر اُن سارے مردوں سے مخاطب ہو رہا تھا جو نادانی میں اپنی نازیبا خواہشات کی خاطر مستقل خوشیوں کو رد کر دیتے ہیں۔

اُن سے سوال کر رہی تھی کہ کیا تم نہیں جانتے باپ کی شفقت اور محبت کی محرومی کا احساس تمہاری اولاد کے دلوں میں جو خلاء چھوڑ دیتا ہے اُسے دنیا کا کوئی بھی شخص۔ یہاں تک کہ ماں کی ممتا بھی نہیں بھر سکتی۔ وہ زخم ہمیشہ ہرا رہتا ہے......

کیا اولاد سے بڑھ کر بھی کوئی اور نایاب رشتہ ہے جسے پا کر تم سب کچھ بھول جاتے ہو۔ اپنے فرض...... اپنی ذمے داریوں سے کنارہ کر لیتے ہو۔ اپنے نشیمن کو خود ہی پھونک ڈالتے ہو...... تمہیں خوف

خدا بھی نہیں ہے...... بیٹی کو گہرا صدمہ پہنچا تھا...... یہ مجبور ماں اُسے کیسے دلاسہ دیتی...... کیسے کہتی چپ ہو جا میری جان۔ صبر کر...... کیونکہ یہ ایسا رشتہ ہے جس کے ٹوٹنے سے بیٹی کے دل کو کبھی صبر وقرار نہیں آتا ہے...... درتو پھر اپنے کو ہی الزام لگا رہی تھی۔ لیکن اس کی کم عمر بیٹی تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ ایک مشرقی عورت اپنے شوہر کے سارے جرم، سارے الزام اپنے سر لے لیتی ہے...... ہمارے سماج میں مرد کبھی مجرم نہیں ٹھہرایا جاتا...... ہمیشہ عورت ہی خطاوار ہوتی آئی ہے...... لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آج کی مشرقی لڑکی بدل گئی تھی کہ۔ بیٹی نے اپنے بے رحم اور خود غرض باپ کے لیے چھپ چھپ کر بے تماشا آنسو بہائے تھے۔ اپنی ماں کی تڑپ محسوس کی تھی...... آج جب باپ دہلیز پر کھڑا گڑگڑا کر محبت کی بھیک مانگ رہا تھا...... اپنی بیٹی کو بیٹی پکارنا چاہتا تھا تو بیٹی کا دل بھی پتھر کا ہو گیا تھا...... یہ وہی خود غرض باپ ہے جس نے اپنی خوشیوں کی خاطر تین تین عورتوں کے پیار کو روندا تھا...... ماں...... بیوی اور بیٹی کو دنیا میں قابل ملامت اور حقیر کیا تھا...... پھر بیٹی کا دل کیسے موم ہو جاتا۔ اُس نے اپنے سنگدل باپ سے انتقام لے لیا تھا آج ایک مرد کی بڑی زبردست ہار ہوئی تھی......

درتو دیر تک روتی رہی تھی...... بڑا زبردست طوفان آ گیا تھا۔ سب کچھ توڑ پھوڑ گیا تھا۔ رشتے کی آخری ڈور بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ماں کے درد دونے ہو گئے تھے۔ یہ رات اس پر بڑی بھاری تھی...... بیٹی کے دل سے بھڑکتی چنگاریوں نے ماں کے بدن میں لگی آگ کو اور بھی بڑھکا دیا تھا...... اس خوفناک رات کا ایک ایک پل بڑے دھیرے دھیرے سرکا۔ صبح ماں نے بیٹی کے چہرے پر بھاری بھاری سوجی آنکھیں دیکھ کر بڑی لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا...... رات میں کوئی آیا تھا...... چندا نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر بڑی سادگی سے جواب دیا...... کب اماں...... آپ تو سو گئی تھیں...... کوئی بھی تو نہیں آیا......

درتو نے بھارتی کو بلایا۔ سارا حال سنایا...... بولی تم میری دوست اور ہمراز ہو۔ نانی کی ساری دولت اُن کے نام کرنی ہوگی۔ اور اس کی خبر چندا کو نہیں ہونا چاہیے۔ بھارتی نے انکار کیا تو بولی میں ان کی کسی قسم کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتی...... اگر ایسا نہ ہوا تو نہ معلوم کیا ہو جائے...... شاید میں جی نہ پاؤں گی......

بھارتی جانتی تھی درتو اپنی دھن کی پکی ہے۔ بولی۔ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ ایک اور چیک اُسے دے کر بولی یہ میرے گاؤں کے اسکول کے لیے ہے...... اگر مجھے پڑھنے کا موقع ملا ہوتا تو زندگی ایسی نہ ہوتی...... جب میرے ہاتھوں میں تھوڑے اختیارات آئے تو میں نے ہمیشہ سرکاری اداروں سے بھی عورتوں کے حقوق کی اپیل کی...... ہر لڑکی کو تعلیم ملنا ضروری ہے...... ہمیں لڑکیوں کو اندھیرے سے روشنی میں لانا چاہیے تاکہ کوئی

لڑکی میری طرح دُکھ نہ اُٹھائے...... بھارتی نے کہا...... تمہیں تمہاری منزل مل گئی...... درتو کی آنکھیں بھر آئیں...... بھرائی آواز میں بولی...... میں صحرا کی تپتی ریت کو عبور کر کے یہاں تک پہنچی ہوں۔ لیکن جہاں میں کھڑی ہوں یہ تو میری منزل نہ تھی۔ کیا اسی کو عورت کی جیت کہتے ہیں...... اُس عورت کو جس کا پورا خاندان اجڑ گیا ہو۔ جو اکیلی اپنی بیٹی کو زندگی کی راہوں پر چلنا سکھا رہی ہو...... جو اپنے شوہر کی راہ تک رہی ہو...... کیا میں کبھی اپنی اس جیت پر فخر کر سکتی ہوں۔ کبھی اپنی فتح کا پرچم ہاتھ میں اُٹھا کر خوشیوں کا اظہار کر سکتی ہوں۔ نہیں بھارتی مجھے تو میری منزل مل چکی تھی...... قسمت نے ساتھ نہ دیا...... منزل پر پہنچ کر ہم سفر بچھڑ گیا...... سب کچھ پا لیا تھا اور اچانک سب کچھ کھو دیا...... پا کر کھو دینا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے...... یہ زندگی کا سفر تو جاری رہے گا...... بھارتی نے اُسے گلے لگا لیا...... اب تو ہمسفر آ گیا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا...... تم چندا کو سمجھانے کی کوشش تو کرو......

درتو کی بیقراری اور بڑھ گئی...... ذرا کھٹکا ہوتا تو یہی گمان ہوتا وہ آ گئے ہیں...... دیپ سے ملنے کا اشتیاق بڑھتا ہی جا رہا تھا...... آنکھیں اُسے دیکھنے کو ترس رہی تھیں...... درتو نے اپنی رنگین کپڑوں کی الماری کھولی...... نیلی ساڑی پہنی...... ماتھے پر لال بندیا لگائی۔ ہاتھوں میں کانچ کی کھنکتی چوڑیاں پہن کر کلائیوں کو دیکھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ مانگ میں سیندور بھرا...... اپنی لمبی چوٹی میں موتیا کے پھول لگا رہی تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا...... چندا نے اُس خوبصورت کمرے کو غور سے دیکھا جہاں اُس کی ماں کا سارا جہان آباد تھا...... دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ گئی...... اماں تم کتنی پیاری لگ رہی ہو...... پھر دیواروں پر نظر ڈالی۔ دوڑ کر شادی کی تصویر کو جا کر چوما...... وہیں سے گردن گھما کر بولی...... اماں یہ سب کتنا اچھا تھا...... پھر یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا...... میری اماں بہت چھپا لیا آپ نے مجھ سے آج آپ مجھے سب کچھ بتا دیں۔ دونوں کی آنسوؤں کی جھالر بن گئی...... درتو نے دھیرے سے کہا...... سب معلوم کر کے بھی کیا کرتیں...... تقدیر تو بدل نہیں سکتی تھیں۔ بس میری تو یہی کوشش رہی کہ تمہارے معصوم دل کو ٹھیس نہ لگ جائے...... چندا رو کر بولی آپ نے اپنا اصلی روپ چھپا کر اپنی ذات پر اتنا ظلم ڈھایا...... درتو بڑے افسردہ لہجے میں بولی، اس منحوس روپ کی وجہ سے کبھی کسی نے مجھے آلودہ نظروں سے نہیں دیکھا...... دنیا والے دُھتکاری ہوئی عورت کو کبھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور تم بھی بڑی ندامت اور رسوائی سے بچ گئیں...... تمہارے لیے سچ کا سامنا کرنا پڑا کٹھن ہوتا۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہوتا کہ میرے باپ نے میری ماں کو اور مجھے چھوڑ دیا ہے۔ تم کس کس کو اپنی ماں کی بے گناہی کا یقین دلاتیں...... بیٹا یہ مردوں کی دنیا ہے یہاں ہمیشہ

عورت ہی مجرم ٹھہرائی جاتی ہے۔

تم بڑی ہوئیں پھر بھی زبان نہ کھل سکی...... میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اپنے بابا سے نفرت کرنے لگو۔ اُن کے بارے میں کبھی بھی برا سوچو کیونکہ وہ ایک بلند کردار اور مضبوط سوچ کے مالک ہیں۔ اُن جیسا شخص کوئی نیچ حرکت کبھی کر ہی نہیں سکتا...... میں نے تو اپنے چہرے پر مصنوعی خوشیوں کی نقاب ڈال لی تھی نہ جانے کب چہرہ بے نقاب ہوگیا اور تم نے میری آنکھوں میں جھانک لیا...... بھلا اس طرح بھی کوئی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ جس طرح تمہارے بابا نے مجھے چاہا...... وہ اپنے ماں باپ کو بھی بہت چاہتے تھے۔ بڑی عزت کرتے تھے ان کی...... تمہارے بابا مجھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ان میں تمہارے دادا جی کا حکم ٹالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کیسے ٹالتے بُرا وقت جو آنا تھا......

وہ گئے۔ ہمارے لئے تو نہ سورج میں روشنی رہی اور نہ چاند میں چاندنی۔ یہ گھر تاریک ہوگیا۔ وہ بڑا ہی بھیانک دور تھا۔ ماں اور بیٹی دونوں کے آنسو متواتر بہہ رہے تھے۔ چندا سسک کر بولی...... ''اماں آپ نے زندگی کے ہر موڑ پر بس دُکھ ہی دُکھ دیکھے ہیں...... ماں نے بیٹی کو سینے سے لگا کر کہا...... نہیں بیٹا...... ایسا سوچ کر کبھی اپنے دل کو دکھی مت کرنا...... یہ دنیا دکھوں اور سکھوں کا میلا ہی تو ہے...... کبھی خوشیاں تو کبھی غم...... انہوں نے مجھے دنیا کی ہر خوشی اور مسرت دی تھی...... خوشیوں اور پیار کی گھڑیاں کتنی بھی کم ہوں زندگی بھر کا سرمایہ ہوتی ہیں...... جب وہ تھے تو اس چھت کے نیچے زندگی ہنستی تھی۔ خوشیاں قہقہے بکھیرتی تھی۔ میں تو خود اپنی تقدیر پر نازاں تھی......

چندا نے ماں سے سوال کیا...... آپ نے ایک بے وفا اور بے اعتبار شوہر کے نام ساری زندگی گذار دی۔ کیسے صبر کرلیا...... ماں نے اداسی سے کہا...... اپنے بابا کے لیے ایسا کبھی نہ سوچنا...... پہلے میں سوچتی تھی اُن کے بغیر میں رہ نہیں سکونگی...... رشتوں کا تعلق تو صرف دل اور ذہن سے ہوتا ہے۔ بس وہ دل و دماغ پر چھائے رہے پھر تم آگئیں...... ڈھیروں خوشیاں اور روشنی لیکر...... تم تھیں ناں...... اُن کی نشانی۔ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے پھر صبر تو کرنا ہی تھا...... ہم لوگ جیسے دوبارہ زندہ ہو گئے تھے۔ تم نے مجھے جینا سکھایا۔ پھر سے ہنسنا سکھایا...... بڑی ذمے داریاں تھیں میرے کاندھوں پر...... ان کی یادوں کی چادر لپیٹے تمہارے لئے جیتی رہی...... بیٹا انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نہ جینا نہ مرنا...... لیکن ایسے حالات میں اپنے آپ کو زندہ رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے......

درتو نے پھر سوال کیا...... ''اماں تو کیا آپ نے اُنہیں معاف کردیا...... ماں نے بیٹی کو گلے لگا

کر کہا۔ معاف تو اُسے کرتے ہیں جو قصوروار ہو...... وہ تو بے قصور ہیں...... محبت میں تو رعایت ہی رعایت ہوتی ہے۔ محبت جتنی زیادہ ہو اتنی ہی زیادہ دل میں معافی کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔...... وہ کل آئے تھے۔ میں نے اُن کی آواز سنی تھی۔ تمہارے غضبناک انداز سے صرف انتقام کا پہلو نمایاں تھا۔ لیکن بیٹا یہ انتقامی راستے ہمیشہ بربادی کی طرف لے جاتے ہیں...... اپنا دُکھ تو میں برسوں سے جھیل ہی رہی تھی۔ کل تمہارا ایک ایک آنسو مجھے تڑپا رہا تھا۔

میری جان اپنوں سے انتقام نہیں لیتے۔ اُنہیں تو دل معاف کر دیتا ہے۔ سخت فیصلے مسلط کرنے سے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔ اس دنیا میں ان کے تو بس ہم ہی ہیں...... تم اور میں...... خون اور دل کا رشتہ ہے محبت گہرے سے گہرے گھاؤ بھر دیتی ہے...... تم اُن سے کب تک ناراض رہ سکتی ہو...... تم تو ان کی جان ہو...... مجھے یقین ہے تمہارے بابا ضرور آئیں گے۔ اُن سے کبھی کوئی سوال نہ کرنا...... جواب دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ماں کے لہجے میں عجیب سی التجا تھی......

وہ جو کھڑا ماں بیٹی کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہا تھا دو قدم آگے بڑھ کر اُن کے مقابل آ گیا...... چندا اپنے بابا سے لپٹ گئی۔ باپ نے دھیرے سے کہا...... بیٹا میرے پاس تمہارے ہر سوال کا جواب ہے۔ چندا کو چومتے اور آنسو بہاتے درتو کی طرف بڑھا...... ہم پر جو گذری وہ آپ کا ذہن تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ سے جھوٹ بولنا بھی ہماری مجبوری تھی۔ آپ کے لئے شک کی دنیا میں جینا زیادہ آسان تھا۔ اگر حقیقت بتاتا تو وہ اتنی زہریلی تھی کہ آپ سن کر جی نہ پاتیں۔

میں اتنے سال وہاں تھا جہاں انسان کو اپنی خبر نہیں رہتی۔ ایک بے گناہ انسان اُن جیسے مجرموں کے ساتھ زندہ رہ کر بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہاں پورا کا پورا انسان دوسروں کے اختیار میں ہوتا ہے۔ پیروں میں بیڑیاں۔ کوئی دریچہ نہیں۔ کوئی کھڑکی نہیں۔ دروازے پر قفل پڑا تھا...... اور میں اندر بس بیتے ہوئے دنوں کی یادیں ذہن میں محفوظ رکھتے کسی طرح سانس لیتا رہا۔ مجھے پتہ نہ تھا...... کچھ لوگ مجھے نقصان پہنچانے کے خواہاں تھے۔ میرے خلاف شہادتیں پیش کر دیں۔ میں اجنبی اکیلا...... میرا کوئی ساتھی نہ تھا......

زور آوروں کے سامنے کمزوروں کی نہیں چل سکتی۔...... کسی نے میری فریاد نہیں سنی۔ پھر چندا سے بولے...... میری جان...... کل جو ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں جانتا تھا تم مجھے قبول نہیں کرو گی۔ جو خود اپنی نظروں میں گر جائے اسے کون قبول کر سکتا ہے...... تمہارے لئے بہت ترسا ہوں......

ورتو کے دل میں سرور اور غرور کی لہر اٹھی ...... بولی ...... بس کریں ...... اب تا عمر اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ جو ہو گیا سو ہو گیا اسے بھلانا ہی بہتر ہے۔ مشکل سے خوشیاں ہاتھ آئی ہیں۔ اب ان خوشیوں کے دنوں کو بے مزہ نہیں کرنا چاہیے ...... دیپ نے دوسرے ہاتھ سے ورتو کو اپنے قریب کیا ...... وہ تو برسوں سے بہاروں کا منتظر تھا اور مستحق بھی تھا ...... دونوں کو مسکراتا دیکھ کھل کھل اٹھا ...... چندا نہایت حیرت اور خوشی سے اس مدھر ملن کو دیکھ رہی تھی ......

ورتو نے جالنے سے باہر جھانکا۔ آج پھر پورا چاند سامنے ہی آ ٹکا تھا۔ سدھا کر اور بھارتی بھی اس انوکھے ملاپ کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ گھر خوشیوں سے منور ہو گیا تھا۔ تینوں کے اوپر پھول برسا رہے تھے۔ برسوں کے بعد بچپن کے یاریوں گلے ملے جیسے کبھی جدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ پھر وہی خوشیاں یاد آ گئیں ...... سدھا کر نے دیپ کا چہرہ ورتو کی طرف گھما کر کہا ...... یار مجھے نہیں ...... اُدھر دیکھ ...... نیلے آسمان میں ماہتاب جگمگا رہا ہے ...... اُن کے قہقہوں سے کمرہ گونج اُٹھا تھا ......

☆☆☆

آخری سانس

سلیم کے حسین چہرے اور شوخ نگاہوں کو دیکھ کر لڑکیوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں...... اُن کی قربت حاصل کرنے کے لئے دل بے قابو ہو جاتے...... اُن کے خصوصی انداز اور دلکش آواز نے سب کا دل جیت لیا تھا۔ سلیم کے بغیر ہر محفل بے جان سی ہوتی۔ اب جانِ محفل کچھ عرصے سے گم صم رہنے لگے تھے۔ دوستوں نے اُداسی کا سبب پوچھا تو بولے......

''ہم اپنی شوخ جواں محبت کے پھول کسی کے آنچل میں ڈال آئے ہیں...... ستم تو یہ ہے کہ وہ بالکل بے خبر ہیں...... وہ تھی تو سانوی پر تھی بڑی سلونی...... بڑی بڑی غزالی آنکھیں...... ہونٹ...... چہرے پر ایسے سجے تھے جیسے پھول کی پنکھڑیاں ہوں...... مسکراتی تو ایسا لگتا آسمان سے موتی برس رہے ہوں...... لمبا قد...... بھولی بھالی سی...... لیکن سنجیدہ اتنی کہ کسی لڑکے کی مجال کیا جو نظر ملا سکے یا اُن کے سامنے لب بھی ہلا سکے......

بڑا خوشگوار موسم تھا۔ وہ گھر کی طرف جا رہی تھی...... اُن کی آواز پر چونکی...... دل دھڑکنے کا سبب سامنے تھا...... کچھ پل گذرے تو وہ بولے...... ''آج مدت کے بعد آپ کو دیکھ لیا ہے''...... تسکین نے چاروں طرف بے چینی سے نظریں گھمائیں۔ اُنہیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا کی آنکھیں اُن دونوں کو ہی تاک رہی ہیں...... گھبرا کر بولیں...... ''راہ چلتی لڑکیوں کو روکنے کی عادت اب بھی ہے'' وہ ہنسے...... بولے...... حسینوں کی ادائیں ٹھہریں...... خود ہی ہمیں روکتی تھیں اور آخر میں مجرم ہم ہی ٹھہرائے گئے...... یوں سوچ لیں ہم تو سب کے دلوں میں رہتے ہیں اور ہمارے دل کی دنیا سونی پڑی ہے...... خدا گواہ ہے ہم نے تو پہلی ہی نظر میں یہ زندگی آپ کی نذر کر دی...... ہماری تو ابتدا بھی آپ ہیں اور انتہا بھی...... وہ خاموش سنتی رہی...... سلیم کچھ سوچ کر بولے...... آپ کچھ تو بولیں...... لگتا ہے آپ نے ہمارے بارے میں کبھی غور سے سوچا ہی نہیں''...... وہ سنجیدگی سے بولیں......

''وقت کی تیز رفتاری تو دیکھئے کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے۔'' سلیم ذرا مایوسی ظاہر کرتے ہوئے بولے...... ''آپ جیسے پتھر دل لوگ محبت کرنا کیا جانیں''...... وہ مسکرائیں......

چوٹی جھٹک کر پیچھے کر کے بولیں...... ''سلیم صاحب! ہم اتنے بے جان اور بے حس بھی نہیں جو جذبہٗ محبت سے محروم ہوں۔...... ہمارے سینے میں بھی ایک دھڑکتا ہوا دل ہے...... یہ تو عورت کی مجبوری ہے کہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو بھی سینے میں چھپائے رکھتی ہے۔حال دل عیاں ہو جائے تو دنیا والے انگلیاں اُٹھاتے ہیں...... بدنام کرتے ہیں...... اور زندگی محال کر دیتے ہیں...... اظہارِ محبت کا حق تو صرف مردوں کے نصیب میں آیا ہے...... ہم تو...... ایک مدت سے اس گھڑی کے منتظر تھے......''

سلیم حیرت زدہ انہیں گھورے جا رہے تھے۔ان کا حسین چہرہ لال ہو گیا۔کانوں میں جل ترنگ بجنے لگے...... تو پھر ہم اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھیں...... تسکین کچھ سوچ کر بولیں......

''اتنے اہم فیصلے راہ چلتے نہیں ہوتے۔زندگی کے راستے بہت دشوار گذار اور لمبے ہیں...... اگر ساتھ چھوٹ جائے تو بچھڑے ہوئے پھر کبھی نہیں ملتے بس یادیں رہ جاتی ہیں...... ایک انجانے شخص کے ساتھ زندگی عذاب بن سکتی ہے'' ...... وہ تسکین سے نظریں ملا کر بولے ''ہم نے تو زندگی میں ایک ہی خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر آپ ہیں...... اگر ہمارا خواب پورا ہو گیا تو ہم اس تعبیر کی دل و جان سے حفاظت کریں گے۔ہماری محبت کا یقین کریں۔آپ کو پا کر جینے کا مزہ ہی کچھ اور ہو گا......

وہ تو اُن کی محبت میں گرفتار ہو گئیں...... دل کی سونی راہیں جگمگا اُٹھیں...... بولیں...... ''آپ جیسا محبت کرنے والا جیون ساتھی مل جائے تو کانٹے بھی پھول بن جائیں گے...... ''زندگی بھر کے لئے پیار و محبت کے عہد ہوئے...... خوشی و خرمی اور شادمانی کے دنوں کا انتظار شروع ہو گیا......

تسکین چھوٹی ہی تھیں۔جب اُن کی امی کو لندن میں کینسر ہوا تھا...... نواب صاحب نے علاج میں کسر نہ چھوڑی...... یہ موذی مرض تو موت کا پیغام لے کر آتا ہے...... بیگم کا ساتھ کیا چھوٹا نواب صاحب کی تو دنیا ہی اُجڑ گئی...... دیارِ غیر سے دل اُچاٹ ہو گیا...... وطن لوٹ آئے...... اب تو غموں کی دنیا اُن کی جاگیر بن گئی تھی...... انسان خوش حال نہ ہو تو سونا بھی مٹی لگنے لگتا ہے۔وطن کی غریبی دیکھ کر دل بے چین ہو گیا...... سوچا یہ دولت کا پہاڑ میرے کس کام کا...... انسان خالی ہاتھ آتا ہے خالی ہاتھ جاتا ہے...... اپنی دولت کا کثیر حصہ کینسر ریسرچ کے لئے مخصوص کر دیا...... کچھ یتیم اور ضرورت مندوں کے لئے وقف کر دیا......

بیرونی ملک میں رہنے کا اثر تھا لڑکے اور لڑکی میں کبھی امتیاز نہ کیا...... بیٹی کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ

کر دیا۔ جب بھی دوست اپنی بچیوں کی شادی اور جہیز کا ذکر کرتے تو نواب صاحب زور سے کہتے......" بھئی آپ جو بھی کہیں ہمیں خریدا ہوا دُلہا پسند نہیں...... دوستوں نے بہت سمجھایا کہ نواب صاحب یہ ہندوستان ہے جس کو بدلنے میں ابھی صدیاں لگیں گی......اپنی بیٹی پر یہ ظلم نہ کرنا......سسرال والے جینے نہ دیں گے اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری جوان نسل ہی لالچی ہے"

نواب صاحب کو سلیم کا خاندان بالکل پسند نہیں تھا...... بیٹی کی خوشیوں اور سلیم کی قابلیت کا خیال رکھتے ہوئے شادی سے انکار نہ کر سکے......

وہ سسرال پہنچیں تو سلیم کی امی نے بڑی خوشی سے استقبال کیا...... سلیم اور تسکین بہت مطمئن اور خوش تھے۔ کچھ ہفتے آرام سے بسر ہوئے...... پھر امی کے لہجے میں فرق نمایاں تھا۔ سلیم بھی کچھ بدلے بدلے نظر آئے تھے۔ تسکین نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو بولے۔" آفت اور پریشانیوں میں الجھ گیا تھا۔"

سلیم کی امی نے اپنی ساری پونجی سلیم کی پڑھائی پر خرچ کر دی تھی......اب جہیز میں ایک موٹی رقم پانے کی توقع تھی...... سلیم خود بھی بہت بلند پرواز تھے......ستاروں میں آشیانہ بنانے کا خواب دیکھا......اور نواب صاحب کی بیٹی سے محبت کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا...... وہ معصوم تو ان کی محبت میں دیوانی ہوگئی۔ سلیم کو پورا یقین تھا کہ وہ جلد ہی نواب صاحب کی ساری دولت پر قبضہ کر لیں گے...... جب حقیقت سے دوچار ہوئے تو ماں بیٹا دونوں ہاتھ ملتے رہ گئے......

امی کو اب بھی بڑی حویلی پانے کی اُمید تھی...... سو وہ خاموش تھیں...... کرائے کا مکان اب انہیں بھاتا نہیں تھا...... جب ساری امیدیں ٹوٹ گئیں تو امی نے تسکین سے جان چھڑانے کا خیال ظاہر کیا۔ سلیم کو ہمت نہ ہوئی...... بولے...... سرکاری افسر ہوں......اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ سوچ رہی ہیں......عزت کا سوال ہے......

سلیم اور تسکین کو بات کرتے دیکھ لیتیں تو امی کے دل پر سانپ لوٹ جاتا کچھ مہینے اور خاموش رہیں...... پھر بات بات پر بگڑنا شروع کر دیا۔ تسکین کو سلیم کی محبت پر پورا یقین اور بھروسہ تھا۔ گھر کا امن وچین قائم رکھنے کے لئے امی کی کسی بات پر دھیان نہیں دیتی تھیں...... وہ سلیم کی خاطر سب کچھ سہنے کو تیار تھیں......

''وقت گذرتا گیا۔ اور حالات دن بدن بگڑتے ہی گئے...... امی نے مہمانوں کے سامنے تسکین کو ذلیل وخوار کرنا شروع کردیا...... کچھ دنوں تو وہ سنتی رہیں۔ جب برداشت نہ کرسکیں تو سلیم سے امی کی ناراضگی کا سبب پوچھا...... وہ تلخ آواز میں بولے...... قصور تمہارا نہیں تمہارے ابو کا ہے سزا تم کو مل رہی ہے'' ...... وہ آنکھیں پھاڑے سلیم کو گھورتی ہی رہ گئیں...... تمہارے ابو نے غریبوں کی...... قسمتیں چمکادیں لیکن اپنی بیٹی کے راستے میں اندھیرے پھیلا دیا...... کانٹے بو دیئے...... اب وہ کانٹے تو تکلیف دیتے ہی رہیں گے...... ہم تو تم سے شادی کرکے پچھتا رہے ہیں......''

تسکین کو لگا۔ سلیم نے کسی بلند پہاڑی پر سے اُس کو نیچے کھنڈر میں دھکیل دیا ہو...... رو کر بولیں سلیم تم نے تو کہا تھا کہ میں تمہارے واحد خواب کی تعبیر ہوں'' وہ ہنس کر بولے...... اس مہنگائی کے زمانے میں خوابوں میں سونے چاندی کی دیواریں ہی نظر آتی ہیں...... جوانی کے خواب پورے نہ ہوں تو'' وہ بیچ میں بول پڑیں ''بس کرو سلیم...... ہم دونوں کی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ ہماری مالی حالت تو لاکھوں سے بہتر ہے۔ اللہ کی مہربانی سے سب کچھ تو ہے ہمارے پاس...... سلیم دولت سے خوشیاں نہیں ملتیں۔ میرے ابو دولت سے امی کو نہ بچا سکے۔ اُن اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے حسد۔ جلن، غم اور تنہائیاں ہیں...... بالکل کھوکھلی ہے امیروں کی دنیا...... ساری زندگی دولت بٹورنے میں ضائع کردیتے ہیں۔ خوشی سے جی بھی نہیں سکتے...... اُن کی ساری خوشیاں اُن کی دولت کے ڈھیر کے نیچے سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہیں...... دولت کی چاہت...... انسان کا سکون لوٹ لیتی ہے...... اور وہ اپنے ہی گناہوں کے بوجھ تلے دب کر تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں...... اور جاتے وقت سب خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں...... مجھے اپنے ابو پر فخر ہے...... انہوں نے اپنی دولت عیش وآرام کے لئے نہیں بلکہ وطن کے غریبوں کے لئے خرچ کردی۔ وہ بولتی رہی...... اور سلیم کمرے سے باہر نکل گئے......

سلیم کی باتوں پر تسکین کو بے حد دکھ ہوا۔ اتنا دکھ کہ...... اتنا لالچ...... وہ تو سلیم کو فرشتہ سمجھتی تھی...... آج ان کی شرافت کا چوغہ پل بھر میں زمین پر آ گرا...... آج آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ وہ بھی ایک معمولی سے انسان ہیں دولت کے بھوکے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے ہمراز کا بھی یقین نہ کرو......

تسکین کی گود نہ بھری...... اب امی تسکین کے خلاف برے منصوبے باندھنے لگیں...... کھانا ختم ہوتے ہی امی غضب ناک آواز میں بولیں...... ''برسوں انتظار کرچکے اب ان کی تو عمر ہو چکی۔ یہ گھر بے

چراغ رہ جائے گا۔ سلیم تم اپنے بڑھاپے کی سوچو...... اپنی اولاد نہ ہوتو کوئی پانی دینے والا بھی نہ ہوگا۔ اب ان کی طرف سے تو آس ٹوٹ چکی ہے...... تم دوسری شادی کرلو۔"

سلیم کی باتوں سے تسکین یوں بھی ٹوٹ چکی تھیں...... اب امی کی باتوں نے تو دل ہی چھید ڈالا۔ انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا۔ سلیم کی سرد نگاہوں میں وفا اور پیار کا نام بھی نہ تھا۔ ایک سرسری نظر تسکین پر ڈالی اور باہر چلے گئے...... امی دیر تک بہت کچھ کہتی رہیں......

اس رات تسکین بہت پریشان رہیں...... کسی طرح دل کو سمجھا نہ سکیں۔ چاروں طرف سے ناامیدیوں نے گھیر لیا تھا۔ روکر رات کٹی...... گھر کی خوشیوں اور شادمانیوں پر رنج والم کا قبضہ ہو ہی چکا تھا...... بیٹے کو دوسری شادی کی صلاح دے کر امی تو چل بسیں...... اب سلیم کے دل میں نہ پہلی جیسی محبت تھی اور نہ ہی آنکھوں میں وہ الفت تھی جس پر وہ نثار ہوگئی تھیں۔......

رفتہ رفتہ دوریاں بڑھتی گئیں...... سلیم کو گھر کی خاموشی اور تنہائی سے وحشت ہونے لگی...... اور وہ دل بہلانے روزانہ شام کو کلب جانے لگے...... تسکین اپنی تنہائیوں میں لپٹی سلیم کے ساتھ کے لئے تڑپتی رہتی......سوچتی رہتی...... سلیم نے وعدہ کیا تھا ان کے ساتھ خوشیاں ہوں گی...... لیکن امی کے دل خراش الفاظ کانوں میں شور مچاتے رہے۔ یہ تو خشک بیاباں ہے۔ خشک بیاباں میں پھول نہیں کھلتے...... وہ ڈرتی کہ دوسری عورت آکر ان پر حکومت نہ کرنے لگے۔ شاید یہ توہین وہ...... برداشت نہیں کر پائے گی۔ اُن کے لئے تو...... چاند تارے بے نور ہو گئے تھے...... راتیں سلیم کے انتظار میں گذرنے لگیں۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے سلیم تم دولت اور حسن کے پجاری ہو...... وہ جانتی تھی کہ اب زندگی میں دکھوں کے سوائے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ خوشیوں کے پھول تو کب کے مرجھا کر سوکھ بھی گئے تھے......

اللہ اولاد نہ دے تو مرد ہمیشہ عورت کو قصوروار سمجھتا ہے...... اور سزا بھی عورت کو ملتی ہے سلیم کا دن کہاں گذرتا اور راتیں کہاں کٹتیں...... تسکین کو کچھ بھی خبر نہ ہوتی...... سلیم تو الجھے ہوئے کانٹوں سے بھی زیادہ الجھے انسان نکلے سرکاری افسر کے لئے دوسر شادی کرنا جرم تھا...... لیکن اب دوسری عورتوں کے ساتھ وقت گذارنے پر تو کوئی پابندی نہیں تھی...... تسکین کو معلوم ہوا کہ وہ کسی جواں بیوہ عورت کے ساتھ لندن سیر کرنے جارہے ہیں۔ تسکین نے تو رو رو کر بُرا حال کرلیا۔ اس نے سلیم کو گذرے ہوئے محبت بھرے زمانے کی یاد دلانے کی کوشش کی۔ اُن راتوں کا واسطہ دیا جب وہ اُن کے بغیر بے چین رہتے تھے۔ وہ تو سن

کر ایسے حقارت سے ہنسے کہ تسکین کا دل ہی چاک ہو گیا...... بولے مجھے ایک بیٹے کی خواہش ہے۔ جو تم پوری نہیں کر سکتیں...... یہ کیا کہہ دیا...... تسکین کو لگا آفتاب اور مہتاب اپنے اپنے برجوں پر ٹھہر گئے ہوں۔ جھلملاتے ستارے بجھ گئے ہوں...... سارا نظام عالم رُک گیا ہو۔ اُس کے پاؤں تلے زمین تھر تھرا گئی...... وہ تو کانپ رہی تھیں...... سلیم نے سہارا بھی نہ دیا...... تسکین سوچ رہی تھیں جنگلی درندے بھی اپنوں پر وار نہیں کرتے...... مرد کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ جنگلی درندوں سے زیادہ...... خونخوار...... پل بھر میں اپنوں کو چباڈالتے ہیں...... ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں محبت کا قلعہ جس میں وہ اپنے کو محفوظ سمجھتی تھی اور جس کی بنیاد سلیم نے اپنے ہاتھوں سے ڈالی تھی آج اپنے ہی ہاتھوں اُسے مسمار کر دیا۔ انسانی رشتے اور محبت کے دھاگے ٹوٹ گئے۔ دماغ پر ایک دھواں سا چھا گیا'' اتنی بڑی چوٹ...... نہیں سلیم...... میں یہ سہہ نہ سکوں گی'' وہ تو بالکل بے سہارا تھی۔ بالکل اس زرد سوکھے پتے کی مانند جو اپنی شاخ سے الگ ہو گیا ہو...... اور پانی پر بہہ رہا ہو...... نہ معلوم کب ڈوب جائے...... تیز ہوا اڑا کر لے جائے۔ فنا ہو جائے۔ اب بچنے کی کوئی امید نہ تھی......

دوسرے دن سلیم کو دیکھتے ہی بولی...... میری بات مانو...... ایک بچہ گود لو...... ہماری خوشیاں واپس لوٹ آئیں گی...... میں ابھی بچہ دیکھ کر آ رہی ہوں...... لڑکا ہے...... تم کو بیٹا چاہیے'' وہ ہیبت ناک آواز میں چلا کر بولے...... ''شاید تم اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی ہو...... مجھے اپنے گھر میں یتیم خانہ نہیں کھولنا...... مجھ کو میرا اپنا بچہ چاہیے...... جس کی رگوں میں میرا خون ہوگا'' وہ اُداس ہو کر بولی...... سلیم اس عمر میں...... بال پک گئے ہیں...... اب دوسری شادی کرو گے۔ دنیا ہنسے گی...... نہیں سلیم نہیں......

سلیم تو پرانی دنیا بالکل بھلا بیٹھے تھے...... کاش تسکین کو اس قیامت کی رات کی پہلے سے خبر ہوتی وہ سلیم کے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھی تھی۔ وہ آدھی رات گذرے آئے...... وہ...... اُن کے ساتھ تھی...... دونوں مسکراتے ہوئے اندر آئے...... تسکین نے وہ بجلی جیسی چمک سلیم کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی...... چہروں پر فتح ہنس رہی تھی۔ تسکین کی آنکھوں میں ہار کے آنسو اُمڈنے ہی والے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو جلدی سے سنبھالا۔ اُس کے بے جان ہونٹوں سے جیسے قوت گویائی چھن گئی ہو۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ دونوں کو اوپر سے نیچے تک ایک نظر دیکھا اور راستے سے ہٹ گئی۔

یہ زہر کا پیالہ بھی اُس نے خاموشی سے پی لیا...... وہ اُس کو تسکین کے کمرے میں لے گئے......

اور تسکین اپنے ارمانوں کے قاتلوں کو بے بسی سے دیکھتی رہ گئی...... ایسی کربناک گھڑی خدا کسی عورت کو نہ دکھائے...... امیدوں کے سارے چراغ گل ہو گئے...... زندگی کا سورج پل بھر میں غروب ہو گیا......

دیکھتے ہی دیکھتے دوسری عورت نے اس کے دل کے مالک پر اور اس کی خواب گاہ پر قبضہ کر لیا...... آج وہ بالکل تنہا تھی...... کوئی غمگسار نہ تھا...... جس کو اپنے دل کے زخم دکھاتی...... اب تو تقدیر نے بھی ہار مان لی تھی...... خوشیوں کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے۔ وہ دکھ بھری رات بہت ہی لمبی تھی۔ کٹے نہ کٹتی تھی...... اس سیاہ کالی رات میں گذری ہوئی مہکی مہکی بکھری نکھری چاندنی راتوں کی یادیں دل میں آگ لگائے ہوئے تھیں۔ تسکین تو ان کے لئے تڑپ رہی تھی۔ جان لبوں پر اٹکی تھی......

''سلیم تم نے یہ کیا کر ڈالا...... ایک دن تم نے پوچھا تھا...... آج میں پوچھ رہی ہوں۔ کیا تم نے میرے بارے میں غور سے کبھی سوچا......؟...... تم تو یہ بھی بھول گئے کہ میں تم سے دور نہیں رہ سکتی...... مر جاؤں گی تمہارے بغیر...... وہ تو سلیم سے باتیں کر رہی تھی اور سلیم کی آغوش میں کوئی اور عورت تھی یوں روتے اور سوچتے صبح ہو گئی......

وہ بیٹھی اپنی قسمت پر نوحہ کر رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا...... وہ اندر آئے...... ظالم نے یہ بھی نہ پوچھا کہ ان پر کیا گذری...... رات اکیلے کیسے کٹی...... بولے...... ''تم جانتی تھیں یہ تو ہونا ہی تھا...... اس کو تاکید کی یہ راز راز ہی رہے...... کچھ مہینوں ہی کی تو بات ہے شہزادی تمہاری چھوٹی بہن ہے جو افریقہ سے آئی ہے۔

تسکین کی آنکھوں سے تو جھر جھر آنسو بہنے لگے...... آنسو دیکھ کر وہ بولے...... ''جن کے مقدر میں خوشیاں نہیں ہوتیں وہ دوسروں کی خوشیوں پر آنسو بہاتے ہیں۔ اب تو وہی میری سب کچھ ہے۔ مجھے دولت۔ شہرت اور اولاد کی خواہش تھی...... تم سے شادی کر کے شہرت تو بہت ملی۔ تمہارے ابو نے دولت نہیں دی اور تم نے اولاد...... محبت کیا چیز ہے میں نہیں جانتا...... صرف اتنا جانتا ہوں کہ آرام سے رہنے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہزادی کے پاس بے انتہا دولت ہے۔ اس خود غرض دنیا میں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا...... میں جانتا ہوں تم نوحہ گیری میں مہارت رکھتی ہو...... اور تم جانتی ہو مجھے آنسو پسند نہیں...... میں تھک گیا ہوں...... تمہارے ان آنسوؤں سے۔ میرے گھر میں ماتم دیکھ کر شہزادی ناراض جائے گی۔ میں جانتا ہوں اب تم یہاں خوش نہیں رہ سکتیں اس لئے میں تمہیں طلاق...'' وہ زور سے چیخی......

''سلیم مجھ پر اتنے ظلم نہ ڈھاؤ...... تم اپنے سارے وعدے بھول گئے...... زندگی بھر ساتھ رہنے

کے...... کسی کو کھو دینے کا غم تم نہیں جانتے...... میں تو اپنا سب کچھ کھو کر بھی سانس لے رہی ہوں...... مجھ سے میرا گھر تو مت چھینو...... مجھے دربدر کی ٹھوکریں...... کھانے سے بچالو...... میں تم سے اور اس گھر سے ایسی جڑی ہوں الگ ہو کر ایک پل بھی نہ جی سکوں گی...... تم نے مجھے...... اپنے دل سے نکال پھینکا ہے۔ تم جس دل میں رہتے ہو اس کو اتنا نہ دکھاؤ کہ وہ درد کی شدت سہہ نہ سکے اور پھر دھڑکنا ہی بند کر دے''

وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ تسکین گہری سوچ میں بیٹھی تھی...... وہ پھر آئے...... یوں گوشہ نشین ہو کر کب تک ماتم منانے کا ارادہ ہے...... کہتی ہو یہ...... تمہارا گھر ہے۔ تمہارے گھر میں خصوصی مہمان آئے ہیں۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتے...... تسکین اٹھی اور کچن میں چلی گئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دونوں کے چہروں میں خوشیاں بکھری تھیں...... آنکھوں میں گذری رات کا خمار اب بھی رقص کر رہا تھا۔ سلیم تو ایسا خوش نظر آرہے تھے جیسے پہلی بار یہ خوشیاں ہاتھ لگی ہوں۔ تسکین جل کر خاک ہوئی جا رہی تھی...... کھولتا ہوا پانی ہاتھ پر گرا۔ وہ چلائی...... اس کی آواز ان دونوں کے قہقہوں میں کھو گئی یا شاید سلیم نے سننے کی زحمت ہی نہیں کی...... ناشتہ میز پر رکھا...... ظالم نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا...... جوں ہی مڑی شہزادی کا بچہ رویا...... وہ اُٹھنے لگی تو سلیم نے اُسے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور تسکین سے بولے ''ذرا بچہ......' اتنی رسوائی...... دل اندر ہی اندر سسک اُٹھا...... لیکن یہ ظالم دل اب بھی سلیم سے بچھڑنے کو راضی نہ تھا......

نام شہزادی تھا...... قسمت بھی بلندی پر تھی...... لندن میں پہلے شوہر کو طلاق دے کر بے انتہا دولت حاصل کر لی تھی...... اور ہندوستان آکر اپنی دولت کا مظاہرہ کر کے ایک ایسا آدمی ڈھونڈ لیا جو اس کے اشاروں پر ناچے۔ سلیم کو جنت کی حور کے ساتھ قارون کا خزانہ بھی مل گیا تھا۔ بس ایک بیٹے کی کمی تھی......

آہستہ آہستہ محبت کا خمار اُترنے لگا...... سلیم کے لئے اس کے پاس وقت کم تھا...... وہ آرام سے اُٹھتی...... سج دھج کر باہر نکل جاتی اور دیر میں واپس آتی۔ بچے کی دیکھ بھال کے لئے آیا اماں تھیں۔ اکثر کمرے سے دونوں کے چیخنے کی آوازیں آتیں...... سلیم دروازہ...... پٹک کر بغیر کھائے ہی آفس چلے جاتے...... ابھی سال بھی نہ ہوا تھا وہ سلیم کے بیٹے کی ماں بن گئی...... سلیم کی دلی تمنا پوری ہوگئی...... وہ بہت خوش تھے...... عمر کا تقاضہ تھا۔ مگر چہرے پر بڑھاپے کی درجنوں شکن نہ ہوتی تو ہزاروں رنگ بکھرے نظر آتے۔ آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی...... وہ کھڑی سوچ رہی تھی'' کاش میں سلیم کے بچے کی ماں ہوتی اور ان کو یہ خوشیاں دے سکتی پر اللہ کے نظام کے سامنے تو سب کے سر جھک جاتے ہیں......

سلیم نے بیٹے کو اُٹھایا۔ سینے سے لگایا...... تسکین کو بلایا...... بولے...... ''میری امی کو شکایت تھی کہ تمہاری گود خالی ہے۔ بچہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے...... ''لو یہ بیٹا تمہارا ہے۔ ہم نے آج تمہاری گود بھردی...... اس کی دیکھ بھال تم کروگی'...... شہزادی نے غصے سے دیکھا تو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے...... ''شہزادی کو آرام کی ضرورت ہے'' کتنی خوبصورتی سے تسکین کو بچے کی آیا اماں بنادیا گیا......

ہاری ہوئی عورت کی یہی اوقات ہوتی ہے، تسکین کی خود سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یوں مر مر کر کیوں جی رہی ہے۔ کس کے لئے زندہ ہے۔ اس کا مقدر تو ایسا بدلا کہ اب زندہ رہنے کی آرزو ہی مرگئی تھی...... وہ سوچ رہی تھی اس بے مقصد زندگی کا انجام کیا ہوگا......؟

ابھی بچہ چھوٹا ہی تھا۔ دونوں نے مسوری جانے کا پروگرام بنالیا...... دو بچوں کے ساتھ سفر مشکل تھا، شہزادی کے دل میں تسکین کے لئے کراہیت تھی...... اس نے اپنا بچہ تسکین کے ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ سو طارق کو تسکین کے ہاتھوں میں سونپ کر دونوں چلے گئے......

وہ سوچنے لگی عجب انسان ہیں اپنا بچہ ہمارے پاس چھوڑ گئے اور جاتے وقت ہم سے آنکھ بھی نہیں ملائی...... سلیم تم نے تو ایک بھی عہد محبت نہیں نبھایا...... تم مجھے قدم قدم پر رسوا اور پسپا کرتے جا رہے ہو۔ اور ادھر ہم ہیں کہ تمہیں بھلا نہیں سکتے۔...... آنکھوں میں آنسو آئے...... اس نے آنسو پونچھ ڈالے...... آج تو میں آزاد ہوں...... آج رونے کا دن نہیں......

بچہ رونے لگا۔ اُس نے بچے کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی...... ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ اب تو آنسو پھر سے بہنے لگے...... ہائے وہ گذرے زمانے کہاں گئے...... کہاں گئی وہ راتیں...... وہ باتیں...... کیوں...... سب کچھ ختم ہوگیا...... سلیم تم نے کیا کرڈالا۔ تم نے ایک بار بھی میرے لئے غور سے نہیں سوچا۔ میں نے یہ آزادی کب مانگی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی......

بچہ رو رہا تھا۔ سلیم کا بیٹا بھوک سے تڑپ رہا تا...... اور وہ سلیم کے دیئے ہوئے بے انتہا درد سے تڑپ رہی تھی...... بچے کو روتا دیکھ کر بولی...... تم اپنی ماں کے لئے رو رہے ہو...... اُس ماں کے لئے جو تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ تم روتے رہو...... اُس کو بلاتے رہو...... یاد رکھو اس کو تمہاری ضرورت نہیں...... بچہ اور زور زور سے رونے لگا...... وہ کھڑی دیکھتی رہیں۔ پھر اچانک دوڑیں...... بچے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا

تم معصوم ہو...... بے قصور ہو...... تمہاری ماں کا انتقام تم سے لینا گناہ عظیم ہوگا...... نہیں تم سلیم

کے بیٹے ہو...... میں سلیم کے بیٹے کو دُکھ نہیں دے سکتی...... سلیم میرے ہیں...... تم بھی میرے بیٹے ہو''......

دودھ کی بوتل منہ سے لگا دی۔ بچہ چُک چُک دودھ پی رہا تھا۔تھوڑا پیٹ بھرا تو خوش ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔تسکین کا منہ دیکھ کر مسکرانے لگا...... اچانک تسکین کو محسوس ہوا کہ وہ اس ننھے ساتھی کے ساتھ بے اکیلی نہیں ہے...... بچہ سو گیا تھا...... سو وہ بھی بچے کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔اس کا چہرہ گھورتی رہی۔اور پھر آہستہ سے اس کا دل کراہنے لگا...... ہائے ہائے...... پھر سے پرانی یادوں نے گھیر لیا...... ''کاش تم میرے دل کے داغ دیکھ سکتے...... تمہارا دیا درد ناسور بن کر مجھے دھیرے دھیرے موت کی طرف لئے جا رہا ہے...... تم بھول گئے جو دوسروں کو دُکھ پہنچاتے ہیں...... ظلم ڈھاتے ہیں وہ خدا کے شدید قہر سے کبھی نہیں بچ سکتے۔ میں ہر وقت تمہاری سلامتی کی دعا کرتی ہوں۔نہ جانے وہ کب سو گئی۔وہ دیر تک سوتی رہی۔فون کی گھنٹی بجی تو ہڑبڑا کر اٹھی......

کوئی ڈاکٹر بول رہے تھے...... ''اچانک تیز بارش کی وجہ سے پہاڑی راستے ٹوٹ پھوٹ گئے۔سلیم جس بس میں تھے وہ کھڈ میں گر گئی...... سب لوگ ہلاک ہو گئے...... سوائے دو لوگوں کے...... سلیم صاحب اسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔آپ کا بہت جلد...... آنا ضروری ہے''...... سنتے ہی اُس کی تو سانسیں ہی بند سی ہونے لگیں۔باہر دیکھا۔کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔کتنا تیز طوفان کیوں نہ آئے آج وہ رکنے والی نہیں تھی...... سلیم میں آرہی ہوں۔مجھے اکیلے نہ چھوڑنا...... میرا انتظار کرنا......''

جب وہ اسپتال پہنچی...... سلیم بے ہوش تھے...... تسکین نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔وہ سلیم کا ذرا سا دکھ برداشت نہیں کر سکتی تھی...... آج خدا نے اتنی ہمت دے دی تھی کہ وہ سلیم کا جلا چہرہ اور بدن دیکھ رہی تھی...... سر پر پٹی بندھی تھی۔کئی جگہ سے خون اب بھی رس رہا تھا...... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا...... دل کو سمجھایا یہ وقت گھبرا کر ٹوٹنے کا نہیں ہے۔کچھ سنبھلی تو اُن کے پاس بیٹھ گئی۔

''سلیم آنکھیں کھولو...... میں ہوں تسکین...... دیکھو تمہارا بیٹا آیا ہے''...... انہوں نے آنکھیں کھولیں لیکن کچھ بولے نہیں...... سن رہے ہو...... دیکھو تمہاری تسکین تمہیں لینے آئی ہے...... کچھ تو بولو......

انہوں نے آنکھیں کھولیں...... آنکھوں میں موت کی سی اداسی چھائی ہوئی تھی، بہت دھیرے سے بولے...... ہاں تسکین تم میری ہو...... مجھے معاف کر دینا...... طارق تمہارا بیٹا ہے...... اور وہ آواز پھر...... نہ آئی وہ آنکھیں جنہوں نے تسکین کو پیار کرنا سکھایا تھا...... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں...... وہ

زاروقطار روتی رہی...... طارق کو سینے سے لگا لگا کر چومتی رہی......

ڈاکٹر آئے ایک لفافہ دیتے ہوئے بولے یہ سلیم صاحب کی جیب میں تھا...... کانپتے ہاتھوں سے لفافہ پکڑا...... ڈاکٹر بس کے اور باقی لوگ...... ''سب ہلاک ہو گئے...... آگ لگ گئی تھی...... کوئی بھی شناخت کے قابل نہیں رہا تھا'' ...... ڈاکٹر نے پوچھا ''کیا سلیم صاحب کے ساتھ کوئی اور بھی تھا......'' اس نے جلدی سے کہا ''نہیں وہ اکیلے تھے'' ڈاکٹر چلے گئے...... وہ وہیں بیٹھ گئی...... اپنے سلیم کے پاس...... اس کے سلیم بھٹک گئے تھے۔ اور آج پھر وہ اپنی تسکین کے پاس لوٹ آئے تھے...... ''سلیم تم نے مجھے بیٹا دیا ہے۔ آج مجھے اپنی زندگی کا مقصد معلوم ہوا...... اس نے خط کھولا......

''تسکین تم نے ٹھیک کہا تھا دولت کی چاہت میں انسان اپنا سکون کھو دیتا ہے۔ میں نے تو سکون کھویا اور اپنے آپ کو بھی کھو ڈالا۔...... ایک غلطی کے لئے انسان کتنی بڑی سزائیں پاتا ہے۔ گناہ میں نے کئے...... سزا تم بھگت رہی ہو...... شہزادی اپنے نئے فلیٹ...... میں جانے کی ضد کر رہی ہے......

میں جانتا ہوں تم میرے بغیر جی نہیں سکتیں...... شاید میں بھی تم سے الگ رہ کر خوش نہیں رہ سکتا...... تمہارے ساتھ رہنے کی عادت جو ہو گئی ہے...... تم تو محبت کا سرچشمہ ہو...... تمہاری محبتیں...... مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی...... شہزادی کے پاس کسی کے لئے وقت نہیں ہے۔ طارق کو تم نے ہی تو ماں کا پیار دیا ہے۔ اپنے بیٹے کو چھوڑ نہ دینا...... وہ تمہارے بغیر جی نہ سکے گا...... کبھی کبھی اُس سے ملنے ضرور آنا...... میرے گناہ اتنے زیادہ ہیں...... اللہ بھی مجھے معاف نہیں کریگا...... میں جانتا ہوں تم مجھے ضرور معاف کر دوگی...... تمارا سلیم......

اب تو آنسو رکتے ہی نہ تھے...... ''سلیم میں نے تمہیں دل سے معاف کر دیا...... تم جاتے جاتے مجھے بیٹا دے گئے...... دیکھو اس خشک بیاباں میں پھول کھلا ہے...... میں طارق کو بہت پیار سے پالوں کی بالکل اپنے بچے کی طرح...... اُسے کبھی نہیں معلوم ہوگا کہ میں اس کی سگی ماں نہیں ہوں'' ...... بچہ اس کو دیکھ کر مسکرایا تو اس کے تڑپتے ہوئے دل کو چین آیا...... اس راز کو راز رکھنے کی خاطر وہ اپنا وطن چھوڑ کر پھر لندن چلی گئی...... جہاں وہ پیدا ہوئی تھی...... ابو نے اپنی دولت بانٹ دی تھی...... لیکن امی کی ساری دولت تسکین کو ملی تھی...... تسکین نے کئی بار سوچا سلیم کو بتا دیں...... لیکن امی اور سلیم کی نیت میں لالچ بھرا دیکھ وہ خاموش رہیں...... وہ اس دولت کو بھی کسی اچھے کام کے لئے ہی استعمال کرنا چاہتی تھی...... اب وہ...... وقت آ گیا تھا......

انہوں نے طارق کو اچھی تعلیم دی...... بہت عمدہ تربیت دی اور دل کھول کر پیار کیا...... طارق

جوان ہوگیا...... امی بوڑھی ہوگئیں تھیں ...... طارق امی کے گلے میں باہیں ڈال کر بڑے پیار سے کہتا...... ''دیکھئے میں بالکل آپ کی طرح ہوں...... میرا چہرہ بالکل آپ جیسا ہے۔ جو بچے ماں پر جاتے ہیں بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

امی من ہی من میں سوچتیں...... ''سچ مچ تم بڑے نصیب والے ہو۔ اگر اس دن اپنی ماں کے ساتھ چلے جاتے تو کیا ہوتا...... خدا نے تمہیں میرے لئے بچا دیا...... تم نہ ہوتے تو آج مجھے ماں کون پکارتا...... تم نے ہی میری خشک بیابان زندگی میں پھول کھلا ئے ہیں''

وہ بولا......

''امی کیا سوچنے لگیں،

کچھ نہیں...... سوچ رہی ہوں...... ''خوش نصیب تو میں ہوں۔ جس کا تم جیسا بیٹا ہے...... اعلیٰ تربیت کے ساتھ اگر اعلیٰ تعلیم مل جائے تو انسان کی شخصیت نکھر جاتی ہے''......

سب کا کہنا تھا...... طارق ایک مکمل انسان ہے اور جو بھی ہے اپنی امی کی وجہ سے ہے۔

ابھی بیس سال کا بھی نہ ہوا تھا امی نے شادی کی ضد کی...... امی کی بگڑی صحت دیکھ کر وہ انکار نہ کرسکا...... امی اس کو خوش آسودہ حال اور اور آباد دیکھنا چاہتی تھیں...... طارق کی شادی ہوگئی نرگس اور طارق نے امی کی خدمت میں رات دن جاگ کر کاٹے...... خدا کا نظام دیکھو تسکین جو سوکھا بیاباں تھی انہوں نے آخری سانس اپنے بیٹے کی گود میں لی......

طارق آج بھی امی کو بڑے پیار اور احترام سے یاد کرتا ہے...... آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا ہے'' میری امی کی طرح کسی کی امی نہیں ہوسکتیں...... پیار کرنے والی...... حفاظت کرنے والی...... جب ڈانٹتی تھیں تو لگتا تھا منہ سے شہد ٹپک رہا ہے۔

☆☆☆

خدمت کا دوسرا نام محبت ہے

بڑا اندھیرا تھا۔ اُس رات کا اُداس چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سارے ستاروں سمیت ویر سنگھ کی حویلی کی چھت پر آن ٹکا تھا۔ زمین پر ساری شمعیں گل تھیں۔ ویر سنگھ کے لیے آسمان و زمین بے نور ہو گئے تھے۔ خود ان کے دل کی دنیا بڑی سوگوار تھی۔ اب اس عظیم غم کو سہنے کا یارا ان میں نہیں تھا...... بیٹی کی ہر درد بھری سسکی باپ کی جان تک اترتی جارہی تھی اور اُن کا وجود تیرگی کے گہرے سمندر میں ڈوبتا جارہا تھا......

تنہائی کے صحرا میں پھر یادوں کی ہوائیں چلیں...... وہ تمام یادوں کے قیمتی نگینے جنہیں وہ برسوں پہلے اسی صحن کی گرد تلے دفن کر چکے تھے پھر سے ذہن میں اُبھرنے لگے...... بھولی داستانیں یاد آئیں۔ زخمی دل سے ایک ہوک سی اٹھی...... کاش آج تم ہوتیں...... تو نہ معلوم کیا ہوتا...... شاید یہ سب نہ ہوتا......

آنکھوں میں اس رات کا منظر آن سمایا جب ہر طرف رنگ و خوشبو کا ایک سیلاب تھا۔ چاند مسکرا رہا تھا...... ستاروں کی بارات کے ساتھ پدمنی کی ڈولی اسی آنگن میں آکر رُکی تھی...... کتنی چھوٹی سی نازک سی تھی وہ...... بند کلی کی طرح...... پھر کئی رُتیں اور گل کھلنے کا موسم آیا تو بادِ بہاراں کے ٹھنڈے جھونکے نے اس کلی کو بھی چوما...... وہ چٹکی...... لال گلاب کی طرح جو کھلی تو ساری حویلی مہک اٹھی، ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی قوس قزح...... چہرے پر لالی اور دوشرمیلی آنکھوں میں سچے موتیوں جیسی جھلملاہٹ...... یہ حسین نظارہ دیکھ ویر سنگھ کا دل مچل مچل گیا...... پھر حسن و عشق کے وصال کی رات...... اور...... پھر...... شدت کے انتظار کے بعد وہ دلکش چیخ...... کچھ دیر کے وقفے کے بعد اچانک ہی کانوں میں کچھ نامانوس سا شور گونجا تھا...... یہ لڑکی بڑی منحوس ہے۔ آتے ہی ماں کو کھا گئی...... ویر سنگھ حواس باختہ اندر دوڑے گئے۔ پدمنی کو پکارا...... آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہ ملا...... وہاں تو مکمل خاموشی۔ مکمل سکوت تھا۔ وہ حیران تھے...... یہ اچانک کیا ہو گیا تھا...... وہ جو اُن کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہ اُٹھاتی تھی آج اُن سے اجازت لیے بغیر اُنہیں تنہا چھوڑ کر اتنے لمبے سفر پر کیسے چل پڑی تھی...... اپنے سپنوں کا تاج محل۔ اپنی مسرتوں اور ارمانوں کا جنازہ دیکھ اس فولاد نما شخص کی اندر ہی اندر جڑیں تک ہل گئی تھیں۔ اور سارے کے سارے آنسو انہوں نے دل میں اتار لیے تھے۔

پرے کے رشتے داروں اور دوستوں سے آنگن بھرا تھا...... ہر زبان پر وہی زہریلے فقرے......
ہمدردی کے بجائے لہولہان دل پر جس انداز سے نمک پاشی کی گئی تو باپ کا دل دہک اُٹھا...... چہرہ لال بھبوکا
...... آنکھوں میں چٹختے انگارے۔ وہ شعلہ بن کر بھڑ کنے ہی والے تھے کہ اُن کے جگری دوست مان سنگھ جو
اُن کا درد اپنے سینے میں دھڑ کتا محسوس کر رہے تھے فوراً ہی بڑی گہری افسردہ آواز میں بول پڑے...... زندگی
اور موت خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ اس معصوم بچی پر کیوں الزام دھرتے ہو...... اس دنیا میں آنے والا کوئی
بچہ منحوس نہیں ہوتا۔ یہ بچی تو اندھیری راہوں میں روشنی پھیلانے آئی ہے۔ یہ میرے گھر کی شان اور روشنی ہو
گی...... ویر سنگھ نے اپنے اس سچے دوست کا چہرہ تشکر آمیز نظروں سے دیکھا جس نے اس قدر موئثر انداز
میں اتنا بڑا دعوا کر کے اُن کا مان رکھ لیا تھا۔ اُن کی بیٹی کو زندگی بھر کا سہارا دیکر اُس کا بگڑا مقدر سنوار دیا تھا۔

حویلی ویران ہوئی۔ ویر سنگھ پدمنی سے جو بچھڑے تو ان کی زندگی ہی بجھ گئی...... اب نہ کوئی آرزو تھی ناں
خواب...... بس کسی طرح زندگی بسر ہو رہی تھی۔ وہ ابھی جوان تھے۔ دولت اور شہرت اُن کے قدم چومتی تھی......
رشتے تو بہت سے آئے لیکن جب آنکھوں میں ٹوٹے سپنوں کی کرچیاں بھری ہوں وہ کسی اور کے سہانے خوابوں کی
تعبیر کیسے بن سکتا تھا...... وہ اکیلے بھی نہیں تھے...... پدمنی مایوسیوں کے اندھیروں میں ایک دیا روشن کر کے گئی تھی۔
اپنی نشانی چھوڑ گئی تھی...... اُس کی بیٹی میں اس کا پیار رچا تھا...... ویر سنگھ کو جینے کی وجہ مل گئی تھی۔

ویر سنگھ تعلیم یافتہ...... روشن اور وسیع خیال فوجی افسر تھے۔ وہ وطن میں حالات اور واقعات کو
تیزی سے بدلتا دیکھ رہے تھے۔ بڑا شوق تھا بیٹی کو اسکول بھیجنے کا...... مشکل تو یہ آن پڑی تھی کہ مان سنگھ اپنی
قدیمی روایتوں کے قیدی تھے اور ویر سنگھ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ان کے خیالات نہ بدل سکے۔ سماجی
اور خاندانی روایت کے مطابق بارہ سالہ نادان بیٹی کو سسرال بھیجنا پڑا......

مان سنگھ کی بیوی کی شدید مخالفت کے باوجود نرملا اور شمشیر سنگھ کی شادی ہوئی تھی۔ ساس اس بے
ماں کی بچی کو نفرت کے سوائے اور کچھ نہیں دے سکیں۔ اُن کی نفرت اور چیخ وپکار میں اس بچی کا بچپن گم
ہو گیا۔ ساس جیسی بھی کٹھور تھیں نرملا خوش تھی۔ شمشیر سنگھ کی محبت اور رفاقت میں وہ سارے دُکھ بھول جاتی
تھی...... سولہ سال کی عمر میں جب نرملا نے ایک بیٹی کو جنم دیا تو حویلی پر جیسے آسمان پھٹ پڑا...... ساس کو
جائیداد کا وارث چاہیے تھا۔ انہوں نے حشر برپا کر دیا۔ شمشیر سنگھ اور نرملا کی ساری خوشیاں روند ڈالی......
نرملا کی مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا شمشیر سنگھ میں ماں کے سخت رویہ پر ذرا بھی احتجاج کرنے کی ہمت نہ ہوئی

کہ اُس زمانے کے دستور ہی ایسے تھے......

ابھی ساس کے زیرِ عتاب ہی تھی کہ اچانک حویلی میں بارشِ سنگ ہوئی کہ حویلی کے اونچے برج......اونچی دیواریں چور چور ہو کر اس بد بخت لڑکی کے سر پر آن گریں......اُس کی بدنصیبی پر عرش وفرش کانپ اُٹھے......یکا یک زمین کی ساری روشنیاں بجھ گئیں......دمکتی مانگ سونی ہوتے ہی ساس نے اس دکھیاری بے بس لڑکی کا جینا دوبھر کر دیا......حالانکہ ستی کرنا عظیم جرم قرار دیا جا چکا تھا پھر بھی چپکے چپکے بیوائیں نذرِ آتش کی جارہی تھیں......نرملا کی ساس کے ارادے بھی اچھے نہیں تھے۔نرملا کو اپنی زندگی کی تو آس تھی ہی نہیں......فکر تھی تو بیٹی کی......وہ چیخی چلائی بیواہ میں ہوں اس گناہِ عظیم کی سزا مجھے دو مجھے پھونک ڈالو۔میری بچی کو جینے دو۔اب کوئی اُس کی گریہ زاری سننے والا نہ تھا۔کوئی ہمدرد نہ تھا۔کوئی پرسانِ حال نہ تھا......جب نرملا مصیبتوں میں گھری جانکنی کی سی اذیت اُٹھا رہی تھی اُس کے باپو جی کشمیر کی سرحدوں پر وطن کی حفاظت کر رہے تھے......وہ باپو جی کی راہ تک رہی تھی......

زمینوں کے جھگڑے تھے......نہ جانے کس سمت سے دشمن کی دندناتی گولیاں برسی تھیں......مان سنگھ کی آنکھوں کے سامنے اُن کے لختِ جگر کو چھیدتی نکل گئی تھی......اکلوتے بیٹے کی موت کا شدید صدمہ وہ سہہ نہ سکے اور ذہنی توازن کھو بیٹھے......ویر سنگھ جب واپس لوٹے تو بیٹی کی زبانی ساس کی بے رحمیوں کے عجیب وغریب دلخراش قصے سنے تو انہیں مستقبل میں آنے والے طوفان کے خیال نے ہلا دیا......اب حویلی میں صورتِ حال نا قابلِ برداشت اور ناگوار سی معلوم ہوئی......ہوا مخالف تھی......بغیر مانجھی کے بیٹی کی جیون کی ٹوٹی پھوٹی ناؤ دکھوں کے بیکراں سمندر کی تیز لہروں میں ڈگمگاتی دیکھ وہ تقریباً اپنے حواس کھو بیٹھے......اُن دنوں سماجی دستور تھا کہ لڑکی جہاں بیاہی جاتی تھی وہاں سے مر کر ہی نکلتی تھی۔ظالم ساس کی دسترس سے بیٹی کو بخیر وعافیت نکالنا ایک بڑا مشکل اور سخت مرحلہ تھا......باپ کا دل نہ مانا......وہ کر گذرے جو سماجی اور خاندانی روایت کے خلاف تھا۔رات کی خاموشی میں اپنی بیٹی کے سفید ساڑی میں لپٹے بیوگی کے تیروں سے گھائل وجود کو لے کر اپنے گھر لوٹے آئے......

ہر سو وحشت ہی وحشت تھی......دُور دُور تک پھیلی تاریکی کے اس ہولناک سناٹے میں بس نرملا کی سسکیوں کی آواز مسلسل گونج رہی تھی......اور بدنصیب باپ کا دل لہولہو ہو رہا تھا......ہر آتی جاتی سانس پر یوں گمان ہو رہا تھا کہ یہ غم ہرگز کم نہ ہوگا اور نا ہی یہ شب دیجور ڈھلے گی......بس زندگی ٹھہر جائے گی......یہ

آفت نہایت سخت تھی۔ بیٹی کے تاریک مستقبل میں آنے والے غموں اور مصیبتوں کی اٹھنے والی طوفانی لہروں میں باپ کے اوسان ڈوب اور اُبھر رہے تھے...... وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے اور پھر اپنے بکھرے وجود کو سمیٹ بھی رہے تھے کہ اب اور کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہ تھا......

سسکیوں اور آہوں کا سلسلہ بند ہوا تو باپ کے دل کو تھوڑا چین ملا...... کہ اُن کی چھت کی پر سکون چھاؤں میں اُن کی بیٹی کچھ دیر کے لیے ہی سہی اپنے ماضی اور حال کی تلخیوں سے بے خبر تو ہوئی...... بہت سارا وقت گذر چکا تھا...... ویر سنگھ آنکھیں بند کیے انہیں خیالات کے گرداب میں ڈوبے تھے...... ایسے تڑکے کہ ابھی گہرا اندھیرا ہی تھا بچی کے رونے کی آواز پر وہ چونکے...... تیزی سے اندر گئے۔ ایک نظر گہری نیند میں سوئی ہوئی بیٹی پر ڈالی جسکے چہرے پر اب بھی آنسوؤں کے نشان تھے...... بچی کو گود میں اُٹھا کر باہر لے آئے...... ماضی یوں سامنے آگیا جیسے کل کا ہی حصہ ہو، کل گود میں نرملا تھی اور آج اُس کی بیٹی...... دودھ کی بوتل بچی کے منہ سے لگا کر کچھ دیر کے بعد پردہ سرکا کر باہر جھانکا...... پہلی ستم کی رات بیت چکی تھی...... سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا...... پھر سورج کی شعاعیں جالنے سے چھن چھن کر اُس پھول سے مکھڑے کو شعاع ریز کرنے لگیں...... اُس کی دونوں چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری آنکھوں میں زندگی کی لو پوری آب و تاب سے چمکتی دیکھ ویر سنگھ کے افسردہ دل میں بھی نئی امید کی ایک کرن جاگی...... یہی ہمارے اندھیروں میں اجالا بن کر آئی ہے...... یہ ہمارے لئے خدا کا دیا گراں قدر عطیہ ہے۔ بچی کے مسکراتے چہرے پر آنکھیں جمی رہیں اور ڈھیروں آنسو بہہ نکلے...... درد کی شدت آپ ہی آپ کم ہوگئی تھی...... بچی کو آیا اماں کے سپرد کر وہ نرملا کے کمرے میں گئے...... اُس کا حالِ زار دیکھ کر باپ کے دل میں گہری ٹیسیں اُٹھنے لگیں...... اُن کے سینے سے سر ٹکا کر وہ بلک بلک کر روئی تو اُن کے اندر دبا غم والم کا سیلاب اُمڈ کر باہر نکل آیا۔ اُن کو خود اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ کانپتا لرزتا ہاتھ بیٹی کے سر پر رکھ کر بمشکل تھرتھراتی آواز میں بولے......صبر کر حوصلہ رکھ میری بچی...... درد پھر اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے......

اس شدید صدمے نے ویر سنگھ جیسے بہادر مرد کو بالکل ہلا دیا تھا...... کسی طرح نرملا اور سور بھی کو دیکھ دیکھ جی رہے تھے...... وہ نرملا کو دوبارہ شاد و آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ شمشیر سنگھ کی سنگت میں گذارے سال تھوڑے ہی سہی پر حقیقتاً بے حد خوبصورت اور ناقابل فراموش تھے۔ وہ بیتی یادیں ہی تو اب نرملا کی سنگھی ساتھی تھیں...... وہ اپنی محبت کے دھاگے میں پروئی اُن یادوں کی لڑیوں کو کسی اور کے گلے کا ہار ہرگز

بنانے کو راضی نہ ہوئی۔ اس بدنصیب ماں کی صرف ایک خواہش تھی...... سوربھی علم حاصل کرے اور اُس کے اندر سے علم کے گہرے سوتے پھوٹ پڑیں...... سوربھی بڑی ہوئی، ماں نے اُسے آپ بیتی سنائی اور اُس کو پڑھنے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دی سوربھی کو بھی پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اپنی ماں کو خوش دیکھنے کی آرزو دل میں لیے وہ منزلیں طے کرتی آگے بڑھتی گئی......

برسوں لندن میں قیام کے بعد یوراج وطن لوٹے تو یہاں بدلہ ڈھانچہ دیکھ کر حیران رہ گئے...... شوخ لڑکیاں بے محابا اُن کے قریب آنے کے بہانے ڈھونڈھتی تھیں جنہیں وہ بڑی بے نیازی سے نظر انداز کر دیتے۔ انہیں ایک سلجھی سیدھی سادھی لڑکی کی تلاش تھی...... ایک شام کلب میں موٹر پارک کرنے کے بعد نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں...... نظریں ایک گوشہ میں بیٹھی لڑکی پر ٹکی رہ گئیں...... وہ گردو پیش سے بے خبر میگزین کے مطالعہ میں مصروف تھی...... اُس سنجیدہ سی لڑکی میں ایک الگ ہی کشش تھی کہ قدم خود بخود اُس کی جانب اُٹھ گئے...... وہ یوراج کو اپنے اتنے قریب کھڑا دیکھ کر دم بخود رہ گئی...... کئی خاموش لمحے گذر گئے...... سنیئے مس...... اس اجنبی آواز پر چونک کر اُس نے پلکیں اُٹھائیں...... یوراج کو اُس کی شفاف آنکھوں میں اپنی پوری کائنات ڈولتی نظر آئی...... وہ تو اُس کا گلابی چہرہ ہی تاکتا رہ گیا...... بولا کچھ بھی نہیں...... لڑکی نے پھر میگزین سنبھالی...... حیرت ہے آپ کو پاس کھڑے بندے کی موجودگی کا بھی احساس نہیں...... اُس کی بھاری اور گمبھیر آواز سن کر سوربھی نے بڑی لاپرواہی سے کہا...... آپ بیٹھ جایئے۔ وہ ورق گردانی میں مصروف رہی...... خاموشی کے کتنے ہی لمحات سرک گئے...... کیا آپ ہم سے شادی کریں گی...... بڑے پُروقار اور سنجیدگی سے کہے اس جملے نے سوربھی کو بُری طرح چونکا دیا...... وہ قدرت کے اس کرشمہ کو دیکھ کر حیران تھی کہ یہ مغرور شخص جو لڑکیوں کا منظورِ نظر تھا اور بڑی بے رحمی سے انہیں نظر انداز کرتا آرہا تھا آج اپنی تمناؤں کا کشکول دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑی بیقراری سے اُس کے جواب کا منتظر تھا...... انکار کا تو اُسے شاید گمان ہی نہ تھا...... فقط ایک لفظ ''ہاں'' کشکول میں ڈال کر وہ اُس کو دونوں جہان کی مسرتوں سے سرشار کر سکتی تھی پر...... سوربھی نے ایسا نہیں کیا...... کچھ وقفہ کے بعد سر اُٹھا کر حیرانگی کا اظہار کرتی ہوئی بولی تعلیم حاصل کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنے رسم و رواج بھول جائے۔ ہم اپنی روایتوں کے پابند ہیں...... وہ اپنی رائے سے نوازتی کھڑی ہوگئی...... آگے بڑھی...... اُف...... اُس کی ساڑی کا آنچل یوراج کے ہاتھوں میں تھا...... وہ ٹھٹکی...... یوراج نے آنچل کو ہلکا سا جھٹکا دے کر معذرت

خواہاں انداز میں مسکراتے ہوئے کہا...... آپ بیٹھ جائیے...... ہمیں آپ کا فیصلہ چاہیے...... وہ بیٹھی نہیں...... ایک جھٹکے سے آنچل سامنے کیا، بولی ہم اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں حواس باختی کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھ کر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے بولی یوں تو آپ ملکوں ملکوں گھومے ہیں۔ اب آپ ہندوستان میں ہیں اگر کوئی دیکھ لیتا تو غضب ہو جاتا...... وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی باہر نکل گئی......

یوراج اُن خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنہیں ہر پسندیدہ چیز حاصل کرنے کا شوق ہوتا۔ ہر من مانی شے پانے کی عادت ہوتی ہے۔ اب اُن کے دل میں سوربھی کو حاصل کرنے کی خواہش شدت سے اُبھری تھی۔ پہلی پہلی محبت کا پہلا پہلا بخار تھا...... دل سوربھی کو دیکھنے کو بیقرار ہوا تھا۔ وہ پرامید کلب جاتے پر نامراد واپس لوٹ آتے...... جب ملاقات کی کوئی سبیل نہ نکل سکی تو ایک عجب سی مایوسی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا، آخر کار تمناؤں نے منزل کی شاہراہ دکھائی...... سارے بھرم مٹا کر یہ دیوانہ راہرو اُس راہ پر چل پڑا...... پورے مکمل ارادے کے ساتھ کہ سوربھی کو فتح کرنا ہی ہے انہوں نے ویر سنگھ کے دروازے پر دستک دے دی......

یوراج نے بڑے احترام سے چودھری کے پیر چھوئے۔ انہوں نے بھی شفقت بھرے انداز میں کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ خوش رہو۔ پھر سوالیہ نظروں سے پورا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے بڑے رعب سے بولے۔ تمہیں وطن لوٹے تو کافی عرصہ ہو گیا...... لگتا ہے مصروف زیادہ ہو گئے ہو...... خیر...... یہ بتاؤ آج کونسا ضروری کام آن پڑا جو ادھر کا رُخ کیا...... یوراج سٹپٹا ہی گیا...... کوئی جواب نہ بن پڑا تو ویر سنگھ نے کہا...... یہ بتاؤ وطن سے جو بھی باہر گیا پھر لوٹ کر نہیں آیا...... تمہیں کونسی کشش یہاں واپس کھینچ لائی...... یوراج بڑے غرور سے بولے ہم کسی معاشی بہتری کے مقصد سے تو گئے نہیں تھے۔ پڑھائی ختم ہوتے ہی واپس لوٹ آئے...... ہمارا تو سب کچھ یہاں ہی ہے۔ اپنی جڑوں سے کٹ کر زندہ رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہم اپنی سرزمین پر بہت خوش ہیں...... ویر سنگھ نے یوراج کو تعریفی نظروں سے دیکھ کر کہا یہ تم درست کہتے ہو یہ جڑیں ہی تو ہمیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور یوراج کی بیقراری بھی......

کچھ دیر کے بعد یوراج نے بڑے شائستہ اور مہذب لہجے میں پورے اشتیاق اور بھرپور اعتماد کے ساتھ اپنا مدعا بیان کیا...... ویر سنگھ سن کر فکر مند ہو گئے...... اگر یوراج لاکھوں میں ایک تھے تو سوربھی کسی سے کم نہ تھی۔ انہیں ایک ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو سربھی کا ہم خیال ہو۔ وطن پرست ہو اور جس کے

اخلاق میں دردمندی ہو۔ سوچ کر بولے سربھی ایک سوشل ورکر ہے۔ کئی اُن اداروں سے وابستہ ہے جن کا تعلق یتیموں اور بیواؤں سے ہے...... تم تو جانتے ہو تمہارے ملک میں غریبوں اور جاہلوں کی کثیر تعداد ہے اس لیے مسائل بھی بہت زیادہ ہیں۔ مسائل میں پھنسے ہوئے لوگوں کی امداد کرنا اُس کا مقصدِ حیات ہے۔ وہ اپنے اصولوں کی پکی ہے اور شادی کے بعد بھی وہ اس نیک کام کو جاری رکھے گی۔ یوراج چاہت کی اس منزل تک پہنچ گئے تھے اُنہیں سب شرطیں منظور تھیں۔ جوشیلے انداز میں اپنے تعاون کا پورا پورا یقین دلاتے ہوئے بولے ایسی لڑکی سے شادی کرنا ہمارے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔ وطن کی خدمت کرنا ہم سب کا فرض اولین ہے۔ ہم اس دوڑ میں اُن کا ساتھ دیں گے......

ویر سنگھ مصلحت اندیش انسان تھے۔ مسکرا کر بولے جس طرح کھل کر تم نے اپنی چاہت کا اظہار کیا اُس سے ظاہر ہے مغربی تہذیب کی فضاؤں میں رہ کر تمہارے خیالات بدل گئے ہیں۔ ہمارے سماج میں مرد ابھی بدلا نہیں ہے۔ بیویوں کو غلاموں کی طرح رکھتے ہیں...... شادی ہوتے ہی عورت کی پوری شخصیت اور ذات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ آج کی تعلیم یافتہ لڑکی چار دیواروں میں مقید ہو کر نہیں رہ سکتی...... حقیقت تو یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی شہرت اور برتری برداشت ہی نہیں کر سکتا...... اُسے احساس کمتری ستانے لگتا ہے اور پھر وہ عورت پر تشدد شروع کر دیتا ہے۔ اگر کسی کی زندگی بسر کرنے کی آزادی چھین لی جائے تو اُس شخص کے اندر بڑا بھونچال سا آ جاتا ہے...... اور پھر دونوں کی زندگیاں عذاب بن جاتی ہیں۔ خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ یوں بھی عورت ہی اپنے گھر کو سنوارتی ہے سجاتی ہے۔ اپنے وطن کو حسین بنانے کے لیے عورتوں کی صلاحیتوں کو بھی سماج کی تعمیر اور ترقی کے لیے استعمال کرنا بہت ضروری ہے...... ویر سنگھ سوچوں میں بہت دور نکل گئے...... وہ جانتے تھے یوراج کا تعلق ایک انتہائی قدامت پسند گھرانے سے ہے...... اگر...... ایسا ہوا...... یا نہ ہوا...... تو...... اُن کی لمبی خاموشی کا ہر گزرتا پل یوراج کے لیے بھاری ہو رہا تھا۔ پھر یوراج سے مخاطب ہوئے...... تمہیں بھی خدا نے دولت اور طاقت دی ہے۔ وطن کو مستحکم اور خوشحال بنانے کے لیے تم جیسے نوجوانوں سے بھی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں تم جیسے جوان کو ایک چراغ بن کر جلنا ہوگا تاکہ آئندہ نسل کو روشن کر سکو۔ یوراج ہنسے بڑے مغرورانہ انداز میں بولے...... آپ یقین کریں ہم ہر قدم پر سور بھی کا ساتھ دیں گے اور ان کی خوشی ہمارا مقصد ہوگا۔ یوں وہ ہر طور سے ویر سنگھ کو مطمئن کرنے کی سعی میں کامیاب ہو گئے۔ خاندان جانا پہچانا تھا۔ زیادہ تفتیش کی ضرورت

ہی نہیں تھی۔ چودھری نے بتایا شادی سادہ طریقے سے ہوگی کیونکہ ہماری سر بھی فضول قسم کی رسموں کو پسند نہیں کرتی...... یوراج کامیاب ہوکر گھر لوٹے...... برسوں بعد یہ خوشیاں نصیب میں آئی تھیں۔ چودھری بہت خوش تھے اور ایک دُکھی ماں کے دل کو بھی تسکین ہوئی تو اُس کے روئیں روئیں سے دعائیں نکلنے لگیں......

ہر طرف مسرت کی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی خماری تھی۔ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ یوراج اندر آئے۔ خاصی لمبی جدائی کے بعد یہ وصل نصیب ہوا تھا۔ سوربھی کو دیکھتے ہی بولے...... ''ارے آپ کہاں کھوگئی تھیں''...... یہاں تو لمحہ لمحہ آپ کی یاد میں بیقرار رہے آپ پر تو نظر ہی نہیں ٹھہرتی...... ہم آپ کی تعریف میں کیا کہیں آپ تو سراپا خود تعریف ہیں۔ زندگی بڑی سونی سونی بے رونقی میں گذر رہی تھی...... آپ نے آکر ہمارے دل کے سونے دریچوں کو روشن کر دیا...... آج آپ کو پا کر ایسا لگا کہ ہم نے ساری دنیا فتح کرلی ہو۔ سنتے ہی سوربھی کے اندر ایک دھماکہ ہوا...... انہیں بھی وہی ملکیت کا احساس...... فتح...... تو میں بھی ایک فتح کی ہوئی شے ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں...... ایک عجیب سی دہشت اُس کے دل میں سما گئی۔ محبت کے اس اشتہاری انداز نے اُس کے دل میں خدشات پیدا کردیے۔ وہ نہ جانے کن سوچوں میں ڈوب گئی۔ یوراج نے اپنے ہاتھوں سے اُس کا چہرہ اُٹھا کر بڑے والہانہ انداز میں سوال کیا...... کیا آپ بھی ہم سے اتنی ہی محبت کرتی ہیں جتنی ہم آپ سے اور ساتھ ہی اُس کے ہاتھوں کو تھام کر اپنے استحقاق کی مہر ثبت کرتے ہوئے بولے...... دنیا بدل سکتی ہے پر ہماری محبت کی شدت کبھی کم نہیں ہوگی...... وہ خاموش تھی...... ارے آپ بھی تو کچھ بولیں...... سوربھی پہلے ہی زچ ہوگئی تھی...... بولی محبت کی پیمائش کا آلہ تو نہیں ہوتا۔ آپ کے ان وعدوں اور عہد و پیماں کی حقیقت تو وقت آنے پر ہی معلوم ہوگی...... سوربھی کا روپ اور اس کے ہونٹوں پر مدھم مدھم سی مسکراہٹ دیکھ کر اس دیوانے عاشق کو ہوش ہی کہاں تھا جو اُس کی بات دھیان سے سنتے اور پھر مہکی مہکی حویلی پر سہاگ کی شب اتر آئی......

یوراج کئی دن یہی یقین دلاتے رہے کہ سوربھی کو پھولوں کی جاگیر مل گئی ہے...... وہ دن اچھے ہی بیتے...... وقت گذرنے کا پتا ہی نہیں چلا...... شادی سے پہلے سوربھی کی زندگی سیدھی سادھی سی ڈگر پر رواں دواں تھی...... یہاں کا ماحول، اُس کے مزاج اور نظریات سے قطعاً مختلف سا تھا۔ حویلی میں نوکروں کی کمی نہ تھی...... وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ کچھ عرصہ تو آرام سے گذر گیا...... ایک دن گھر لوٹی تو یوراج کو تصویرِ غم بنا بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی...... وہ رکی...... حال پوچھا اور پھر بیمار یتیم بچے کا ذکر کیا تو انہوں

نے بڑی اپنائیت بھری خفگی میں گلہ کیا...... آپ کو پاکر ہمیں اپنی ہی خبر نہیں...... آپ زمانے بھر کا ذکر لے کر بیٹھ گئیں...... دوسروں پر اتنی عنایتیں ہم پر بھی تھوڑا کرم فرمائیں...... اب آپ کو خیراتی ہسپتالوں اور بستیوں میں چکر لگانا زیب نہیں دیتا...... خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع نہ کریں...... غیروں پر محبت لٹاتی ہیں...... سب کا اتنا خیال کبھی ہمارا حال بھی پوچھ لیا کریں...... وہ یہ باتیں سن کر اتنی پریشان ہوگئی کہ ٹھیک سے حیران بھی نہ ہوسکی...... اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ اُسے یوراج کی طرف سے کسی قسم کی رُکاوٹ کی امید نہ تھی...... بڑی بیباکی سے بولی۔ جنہیں آپ غیر سمجھتے ہیں وہ ہمارے اپنے ہیں۔ ہم وطن ہیں...... ہم سب ایک ہی مٹی کے بنے انسان ہیں...... محبت تو وہ خزانہ ہے جتنا لٹاؤ اتنا ہی بڑھتا ہے۔ انسان کو اپنی محبت میں اتنا خودغرض بھی نہیں ہو جانا چاہیے کہ اپنے فرائض ہی بھول جائے...... ہر انسان کو اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے لیے بھی سوچنا چاہیے...... انسان کو انسان کی قدر کرنا چاہیے کیونکہ اس دنیا میں انسان سے ہی رونق ہوتی ہے۔ اگر آج ہمارا ہے تو کل اُن معصوم بچوں کا ہوگا...... بچوں کے اوپر ہی تو ملک کی ترقی کا دارومدار ہوتا ہے۔ آپ سے تو ہمیں ہمدردانہ سلوک کی توقع تھی...... غم اور غصہ سے سوربھی کا چہرہ لال ہو گیا...... آنکھیں نم ہوگئیں بےبسی سے ایک گہری سانس لی اور آگے بڑھ گئی...... یوراج نے اُسے روکا...... ارے آپ تو خفا ہوگئیں...... جبکہ خفا ہونے کا حق تو ہمارا ہے...... اب ذرا سا مسکرا کر ہماری ناراضگی کا ازالہ تو کرتی جایئے...... اُس کی آواز میں خفگی اور طنز گھلا تھا...... سوربھی کوشش کے باوجود بھی مسکرا نہ سکی...... وہ پوری رات یوراج کی سخت دلی کے سبب غمگین اور پریشان سی رہی...... اُسے یوراج کا یہ رویہ نہایت ناگوار گذرا تھا...... اُس کی باتیں ذہن میں چکر لگاتی رہیں اور سوربھی کا ذہن الجھا رہا۔ پھر سوچا اگر شوہر کو خوش کرنے کی خاطر عورتیں اپنے حقوق بھول کر اچھے کام کرنا چھوڑ دیں تو مصیبت زدہ عورتوں اور یتیموں کا ہمدرد کون ہوگا...... نہیں میں ان کی یہ خواہش پوری نہیں کرسکتی......

شب وروز گذرنے لگے...... ایک دن گھر لوٹی تو یوراج کے تیور چڑھے دیکھ کر وہ گھبرا گئی...... وہ کسی ملازم پر گرج رہے تھے۔ یوراج کا یہ نیا روپ دیکھ کر وہ پسینہ پسینہ ہوگئی۔ لب بستہ حیران وہ یوراج کا منہ تاکتی رہی اُن کے غصے کا سبب نہ سمجھ پائی۔ کچھ مہینے خاموشی سے گذر گئے۔ ایک شام یوراج کو بیوہ کی دوسری شادی کا قصہ سنایا تو وہ سن کر طنزیہ مسکراتے ہوتے بولے...... آپ سوچتی ہیں یہ سب کر کے آپ بڑے معرکے سر کررہی ہیں۔ دنیا کے سارے مظلوموں کا بوجھ اُٹھانے کے لیے کیا آپ ہی ایک واحد

انسان رہ گئی ہیں۔ سوربھی اس شخص کو حیرانی اور بے یقینی کے عالم گھورتی رہ گئی...... کچھ سوچ کر بولی۔ اس دور میں اس شادی کو تو آپ ایک معرکہ ہی سمجھیں...... آج کل جہیز کی مانگ اتنی بڑھ گئی ہے کہ اچھی خاصی پڑھی لکھی لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ اس لڑکے نے ایک بے سہارا بیوہ کو خوشیاں دی ہیں جو صرف موت کا انتظار کر رہی تھی...... اس لڑکی کو نئی زندگی بخشی ہے۔ ہمارے بے رحم سماج میں بیواؤں کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔ وہ تو در در کی خاک چھانتی پھرتی ہیں...... وہ بولے۔ آپ بھی اب باہر جانا بند کریں...... ورنہ ہمارے اوپر بھی انگلیاں اٹھنے لگیں گی...... یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ یہ ظالم سماج کسی کو نہیں چھوڑتا...... انہوں نے پھر شکایتوں کا دفتر کھول دیا...... سوربھی اُن کا چہرہ تاکتی رہی جو خود اوپر سے نیچے تک مغربی تہذیب کے زیر اثر تھا اور اس وقت ایک جاہل ان پڑھ مشرقی شوہر کی طرح حماقت کی باتیں کر رہا تھا...... آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں......" وہ پھر بولے...... اب وہ بھی بھڑک اٹھی...... جب شادی سے پہلے ہمارے اوپر کوئی یہ الزام لگانے کی جرأت نہ کر سکا تو اب آپ فکر ہی نہ کریں۔ معاشرے میں بیوی کو تحفظ دینے کے لیے شوہر ہوتے ہیں...... آپ نے تعاون کیا تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا...... کمال سنجیدگی کے ساتھ بولے گئی۔ میں ناسمجھ نہیں ہوں۔ ایک باشعور اور خود اعتماد عورت ہوں۔ مجھے اپنے اصولوں کے تحت زندگی گذارنے کا پورا پورا حق ہے۔ کیا آپ کا سماج عورت کو شادی کے بعد نیک کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ آپ کے عظیم خیالات شادی ہوتے ہی پاتال میں گر گئے۔ کم سے کم ہمارے راستے میں تو رکاوٹ نہ ڈالیں...... وہ اپنا حتمی فیصلہ سنا کر آگے چل دی لیکن دل میں خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ اگر یہی حال رہا تو نہ جانے کیا ہو جائے......

یوراج نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تمام کر پاس بٹھا کر کہا۔ ہمیں تو کام اور خوشامدیوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ وہ قدرے حیران ہو کر اس شخص کو گھورتی رہی جس کا مزاج پل پل میں بدلتا تھا...... گھڑی میں دیوانہ اور دوسری ہی گھڑی بیگانہ...... یوراج کے کچھ اور بولنے سے پہلے ہی بولی آپ کی معاونت ہوتی تو ہمارا کام اور بھی آسان ہوتا اور آپ ثواب کماتے...... یہ وہ بدنصیب لوگ ہیں جنہیں زندگی کی بنیادی ضرورتیں حاصل نہیں ہوتیں...... چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم ہیں۔ بیواؤں پر سب سے زیادہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ نہ آس نہ اولاد بالکل بے سہارا ہیں...... یتیموں کا بھی برا حال ہے نہ گھر نہ در...... یہ کام ہم اکیلے تو نہیں کر رہے...... بہت سے لوگوں کی محنتوں اور قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ ہمارے طبقے کے لوگوں کو اپنے ملک کی بہتری کے لیے جتنا کرنا ضروری ہے اُس کا عشر عشیر بھی

نہیں کرتے۔ ہمارے یہاں مفلسی اور غربت کی انتہا ہے۔کیا دے رہے ہیں ہم ان محتاجوں اور کنگالوں کو۔میں زندگی کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھنے کی عادی ہوں۔میری ماں کی داستانِ حیات اتنی دردناک ہے کہ سن کر ہوش اڑ جائیں...... وہ تو ایک بے ضرری مخلوق تھیں...... خاموش فرمانبردار۔ ہر حکم پر سر جھکا دینے والی۔جب وہ بیوہ ہوئیں تو جان تک کے لالے پڑ گئے تھے...... سسرال کے محل میں ایک کونہ نصیب نہ ہوا...... ایک بیوہ کی مجبوری اور یتیموں کے دکھوں کو ہم سے زیادہ کون محسوس کر سکتا ہے۔ان مسکینوں اور مصیبت کے ماروں کو مصیبت سے رہائی دلوانے کی کوشش کرنا تو سب کا فرض بنتا ہے۔...... یوراج تلخی سے بولے ہم آپ کا روز روز باہر جانا غیر ضروری اور نامناسب سمجھتے ہیں...... ذراسی شہرت کی خاطر آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں جبکہ ہماری نسبت سے آپ کی ہر خاص و عام میں پہچان ہے۔ہم نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔اس کام کے لیے ہم خاصی خیرات دیتے ہیں...... وہ پُرعزم لہجے میں بولی جنہیں خدانے دینے کی توفیق دی ہے انہیں دل کھول کر دینا چاہیے۔آپ کی خیرات سے اُن کا سامان ضرورت تو خریدا جاسکتا ہے۔پیار نہیں...... خیرات تو بنا محبت کے بھی کی جاتی ہے۔جو حقیقی معنوں میں دینا نہیں جانتے وہ محبت نہیں کر سکتے کیونکہ خدمت کا دوسرا نام محبت ہے۔صرف خیرات دے کر انسان اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو جاتا۔اپنے ان ہاتوں سے بھی خدمت خلق کرنا لازمی ہے...... اُن کو جینا سکھانا ہے۔تب ہی تو وہ بھی آگے چل کر دنیا سیکھیں گے۔...... دوسروں کا سہارا بن سکیں گئے،انہیں صرف مالی امداد ہی نہیں ہماری ہمدردی توجہ اور پیار کی ضرورت ہوتی ہے...... یہ بدنصیب لوگ حقیقی رشتوں کی محبت سے محروم ہیں...... اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔کوئی یہ کہنے والا نہیں کہ تم ہمارے ہو۔ان کے چہروں پر کبھی مسکراہٹ نہیں آتی...... وہ نہیں جانتے خوشی کیا چیز ہے...... زندگی کے لطف اٹھانے کے لیے جن لوگوں کو ہر چیز افراط سے ملتی ہے وہ کیا جانیں غربت،بے سائیگی اور فاقہ کشی کیا ہوتی ہے۔وہ کیا سمجھیں ان معصوم بچوں اور بیواؤں کو کن کن مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے۔اگر آپ اُن لاغر...... مٹی میں لت پت لرزتے جسموں اور اُن کے غمگین چہروں پر پھیلی بیچارگی دیکھوگے تو آپ کا دل بھی دہل جائے گا...... اگر ہم جیسے لوگ انہیں بے سہارا چھوڑ دیں گے تو وہ سسک سسک کر مٹی میں مل جائیں گے...... یہ لوگ واقعی قابل رحم ہیں...... آپ ضد نہ کریں...... میرے اپنے کچھ خاص نظریات اور خیالات ہیں جن پر میں سختی سے قائم رہونگی...... وہ بولے ہی گئی کہ شاید اُس کے موئثر اور زبردست الفاظ اس بے حس اور کٹھور انساں کے دل میں

ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا کردے...... شاید یہ دل ودماغ بدل جائے...... نامعلوم اُنکے اندر کیا ہوا۔ وہ خاموش رہ گئے اور سوربھی سے نظریں چرا گئے...... شاید یہی باتیں اُن کی انا کا مسئلہ بن گئیں......

آہستہ آہستہ یوراج کی شخصیت کے اسرار کھل رہے تھے۔ ان کے قول اور فعل میں بہت تضاد تھا۔ حقیقت میں شروع سے ہی انہیں سوربھی کی سوچ سے سراسر اختلاف تھا۔ وہ قطعی بے رحم اور خود پرست انسان تھے جو سب کو صرف اپنے اشاروں پر چلانا چاہتے تھے...... وہ ایک خصوصی روش پر چلنے کے عادی تھے ہر کام اپنی خوشی اور مفاد کی خاطر کرتے تھے...... انتہائی ترش مزاج اور بات بات پر ہنگامہ برپا کردینے والے...... دولت کی فراوانی اور عیش اور تعیش نے انہیں حد درجہ ضدّی اور خودغرض بنا دیا تھا۔ اپنی طاقت اور دولت کے نشے میں یہ بھی بھول گئے تھے کہ کبھی کبھی انسان آسمان سے تارے توڑنے کی کوشش میں منہ کے بل گرتا ہے کہ پھر کبھی سنبھل نہیں سکتا......

یوراج کی مخالفت کے باوجود بھی سوربھی کے حوصلے پست نہیں ہوئے...... وہ اپنے اصولوں کا دامن مضبوطی سے تھامے اپنے کاموں میں مصروف رہی...... وہ اکثر ہی برس پڑتے تھے۔ ایک دن دیکھتے ہی بکھر گئے...... ہمیں ہمارے خوابوں کا محل ٹوٹتا نظر آرہا ہے۔ سنا ہے بیویاں اپنے شوہروں کا انتظار کرتی ہیں...... یہاں تو حال ہی اوندھا ہے...... آپ کا یہی رویہ رہا تو ہمارے لیے بھی برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا...... ارے جناب آپ کب سمجھیں گی کہ مرد بس عورت سے محبت کرتا ہے وہ اُس کی مکمل سپردگی چاہتا ہے...... سوربھی اپنے پر جبر کرکے ہنس کر بولی...... سنبھال کر رکھیئے ہمیں...... ہم صرف آپ کی امانت ہیں...... آپ کی ذاتی جاگیر...... ہماری محبت کی ساری چاہتیں آپ کے نام ہیں...... ہمارے نصیبوں پر آپ کا اختیار ہے...... لیکن اس محبت کے سوا اور بھی محبتیں ہیں۔ مکمل سپردگی کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اپنی ساری ذمے داریاں اور سماجی فرائض بھول جائیں...... اُس نے الٹا سوال داغا...... کیا آپ کی نظر میں نیک کام کرنا قابل اعتراض جرم ہے...... وہ آج بھی لاجواب رہ گئے...... وہ دم کے دم میں باہر نکل گئی...... سوربھی یوراج کو راہِ راست پر نہ لا سکی...... سوربھی کا دل گھبرانے لگا...... سوچتی رہتی اس ضدّی اور سخت گیر انسان کے ساتھ زندگی کیسے بسر ہوگی...... رات بھر اُس کی بے حسی کے بارے میں سوچتی رہی...... کسی طرح نیند نہ آئی......

سالوں پر سال گذر گئے...... دونوں کے درمیاں والی دیوار اونچی ہوتی جارہی تھی...... سوربھی مر تو سکتی تھی لیکن اپنے اصول نہیں توڑ سکتی تھی۔ اور یوراج کو اُن کی جھوٹی انا کے ناگ ڈس رہے تھے۔ اب اسی

ایک مسئلے نے بڑی سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔ اصولوں اور انا کی جنگ چھڑ گئی...... یوراج کے مزاج کی تندہی میں اضافہ ہوا تو سوربھی بیحد فکر مند ہوگئی۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ رشتوں کی اس زنجیر کی ہر کڑی کو وہ ہی جوڑے رکھ سکتی تھی...... لیکن...... اُس سے جڑے اور بھی تو رشتے تھے...... اور بھی تو کڑیاں تھیں...... ذمے داریاں تھیں...... اُسے تو ہر کڑی پیاری تھی...... وہ کسی بھی کڑی کو بکھیرنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس پیچیدہ مسئلہ کو کیسے حل کرے......

اسی کشاکش میں سال پر سال گذرتے چلے گئے...... رکمنی اور دھن راج بڑے ہوگئے تھے۔ ......سوربھی کے لیے بس یہی ایک تسلی بخش بات تھی کہ یوراج دونوں بچوں سے بیحد محبت کرتے تھے جبکہ وہ اپنے اصولوں کی وجہ سے ہمیشہ یوراج کے عتاب کا نشانہ ہی بنی رہی...... سوربھی ضبط اور برداشت کی بیحد کٹھن منزلوں سے گذر رہی تھی...... یوں تو وہ ہر روز اُس کے دل پر ایک نیا زخم لگاتے ہی تھے...... نا جانے اُس قیامت کی رات کیا ہوا...... یوراج کا غصہ عروج پر تھا...... آنکھوں میں بلا کی وحشت لئے بلند آواز میں دھاڑتے جب گھر میں داخل ہوئے تو سوربھی کا دل دہل گیا...... غصے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ میز پر پڑے کاغذات الٹ پلٹ کر کے سوربھی کی طرف لپکے۔ جارحانہ انداز میں سوال کیا...... اس وقت کہاں سے آرہی ہو...... وہ اُن کے لہجے کی ترشی اور حاکمیت کے عنصر بھرے انداز پر حیران تھی...... چند ثانیہ سکتے کی حالت میں انہیں تکتی رہی کہ جانتے تو تھے کہاں گئی تھی...... اس سے پہلے کہ وہ وضاحتیں پیش کرے دوسری خوفناک چیخ آئی...... میں تنگ آگیا ہوں اس زندگی سے۔ تم نے میری ساری خوشیاں خاک کر دی ہیں دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... اتنی دور کہ میں تمہیں پھر کبھی نہ دیکھ پاؤں...... غیظ و غضب کے عالم میں گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عاید کر دی...... وہ ابھی سنبھلی بھی نہ تھی کہ یوراج نے ایک زور کا دھکا اُس کی پشت پر دیا۔ یہ حملہ اتنی اچانک ہوا کہ سوربھی اپنے کو سنبھال ہی نہ پائی اور منھ کے بل گر پڑی۔ اُس کی ناک سے خون کا آبشار بہہ نکلا...... ساتھ ہی دل میں برسوں کا دبا درد ایک ایسی آہ بن کر نکلا جو سن کر دل پھٹ جائے۔ لیکن اس ستم گر پر اثر تک نہ ہوا...... وہ تو آج تک اُس کے ظلم و ستم سہتی آرہی تھی لیکن آج کا وار نہایت زبردست تھا۔ چوٹ گہری لگی تھی...... زخم دل تلک پہنچا تو دل کی دیواریں ڈھے گئیں...... اُس کا دل تو چاہا چیخے اور چیختی ہی رہے جب تک سالہا سالوں کا اکٹھا اندر کا سارا درد سارا دُکھ باہر نہ نکل آئے۔ دل چاہا اُن کے سوالوں کا جواب بھی دے۔ پھر سوچا اس جابر اور کٹھور شخص سے کچھ بھی کہنا عبث ہے۔ وہ جو عورتوں کے

حقوق سمجھتی تھی اور عورتوں پر تشدد کی روک تھام میں مصروف رہتی تھی آج اپنے ہی گھر کے فرش پر ساکت وصامت بکھری پڑی تھی...... مٹی کے ڈھیر کی طرح۔ بے بس...... بے حال...... یوراج کا دماغ تو عرش پر تھا...... بس کھڑے دیکھتے رہے...... اگر وہ جھک کر ذرا سا سہارا دیتے تو شاید سوربھی کے دل کے سارے کے سارے ملال مٹ جاتے وہ بمشکل تمام آہستہ آہستہ لرزیدہ قدموں سے خود کو گھسیٹ کر باہر لے آئی......

اس سانحہ نے سوربھی کو چونکا دیا تھا...... آج کی ہر بات حکم کا درجہ لیے ہوئے کہی گئی تھی...... اب وہ یہاں رہ کر کوئی کام انجام نہیں دے سکتی تھی۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ مرد حاکم ہے عورت محکوم۔ عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ گنوار۔ مرد کی نظروں میں بس ایک سانچے میں ڈھلی وہ صرف ایک عورت ہے۔ بس عورت...... اور کچھ نہیں...... دوسروں کے اشکوں کو اپنے دامن سے پونچھنے والی کا دامن آج آنسوؤں سے تر تھا...... ذہن بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ آج یوراج نے انسانیت کی ساری حدیں توڑ ڈالی تھیں...... سوربھی نے بھی پکا ارادہ کر لیا۔ آئندہ وہ اس بیدرد انسان کا ظلم اور غصہ ہرگز برداشت نہیں کرے گی...... دل پریشان...... دماغ میں طوفان...... شدتِ اذیت سے وہ پاگل سی ہوئی جا رہی تھی...... وہ تو چہار اطراف سے ذمے داریوں سے گھری تھی۔ آج قسمت اُسے کیسے عجیب دوراہے پر لے آئی تھی...... بار بار ذہن میں ایک ہی سوال شور برپا کیے تھا۔ جاؤں تو کدھر جاؤں...... اُس کے لیے تو کوئی راستہ بھی آسان نہ تھا ہر حال میں پل صراط سے گذرنا تھا۔ اس موڑ کے بعد کے سفر کے خوفناک خیال نے اُسے دہلا دیا...... بس ایک دم ہی خیال آیا، اس بیزاری کی زندگی سے تو موت بھلی...... زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اُس نے زندگی سے گذر جانے کی ٹھان لی۔ گھر اور بچوں سے بچھڑنے کے خیال سے وہ خائف ہو گئی۔ اندر ایک محشر برپا تھا...... ''دُور ہو جاؤ میری نظروں سے'' اس صدائے بازگشت نے ایک بار پھر اُس کے ذہن کو بُری طرح جھنجھوڑا...... نہیں اب میں اس دنیا میں رہنے کے لائق نہیں۔ موت کیوں نہیں آجاتی مجھے...... ان سفاک و سیاہ لمحات میں کہیں دُور خلاؤں سے آتی ایک مدھر آواز کانوں میں گونجی...... خودکشی تو بزدل کرتے ہیں۔ تم بزدل نہیں ہو جو آنسو بن کر ماٹی میں مل جاؤ...... دیکھو وہ ماٹی میں پڑے لوگ تمہیں آوازیں دے رہے ہیں۔ اُنہیں تمہاری ضرورت ہے...... یہ اُس کی ماں کی آواز تھی......

اُس نے غور سے سنا...... واقعی اُس کے اردگرد آوازوں کا ہجوم تھا۔ مظلوموں کی پکار تھی۔ اس آواز نے اُسے ایک نئے زاویے پر سوچنے کو مجبور کر دیا...... اُس نے تہیہ کر لیا ہر حال میں زندہ رہ کر اپنی مقدور بھر غریبوں کی

مدد کر گی...... اُس کے اندر ایک نئی طاقت نے جنم لیا...... اندر میں پختگی محسوس کی...... ایسا لگا کہ یکا یک کتنے ہی غموں سے چھٹکارا مل گیا ہو......

شاید یوراج کو زندگی میں پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اپنی کراہت آمیز اور احمقانہ حرکت پر نادم بھی تھے۔ خون بہتا دیکھ کر دل کو ٹھیس سی لگی تھی لیکن اُن کے مزاج میں سمائی انا پھر آڑے آ گئی تھی۔ بے چین وہ بھی تھے۔ اُن کی بھی شب ایسی بیتی جیسے جگ بیتا ہو۔ وہ رات بھر اپنے کو الزام دیتے رہے۔ اُن کا مسئلہ یہ تھا کہ برسوں لندن میں رہنے کے بعد خود تو پورے کے پورے انگریزی رنگ میں رنگے ہوئے تھے لیکن عورتوں کے معاملہ میں خیالات نہیں بدلے تھے۔ وہیں کھڑے تھے۔ جہاں یہاں کا مرد صدیوں سال پہلے کھڑا تھا۔ جو بھی بدسلوکیاں وہ کر رہے تھے جو اذیتیں اُسے دے رہے تھے شوہر ہونے کے ناطے وہ اپنا اقتدار جائز سمجھتے تھے۔ لیکن آج اچانک انہیں احساس ہوا کہ سوربھی کے ارادے پختہ ہیں اور وہ وفا اور قربانی کی دیوی ہے...... اُن کی بیوی صبر اور تحمل کی معراج کا نمونہ ہے۔ وہ قدم قدم پر اُس کا استحصال کرتے آئے۔ اُس کی محبت کا امتحاں لیتے رہے اور اس طرح ایک نرم دل مشفق عورت کے بھرے اعتبار کا خون کر دیا ہے۔

یوراج دل ہی دل میں اپنے سارے جرموں کا اعتراف کر رہے تے اور بڑی بیقراری سے سوربھی کی راہ بھی تک رہے تھے۔ خلاف معمول نوکر کو چائے کی ٹرے لاتے دیکھ پھر غصے کا دورہ پڑا...... انتہائی خوفناک آواز میں چیخے...... ملازم دوڑے آئے...... دھن راج اور رکمنی اداسی اور پریشانی کے عالم میں حویلی کے سارے کمروں میں دوڑتے بھاگتے ماں کو پکارتے رہے۔ کسی گوشے سے کوئی آواز نہ آئی۔ نوکروں نے حویلی کے چاروں طرف پھیلے وسیع علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا۔ سوربھی نہ ملی...... حویلی ماتم کدہ بن گئی۔ بچے کڑھتے بلکتے رہ گئے۔ یوراج کا سارا وجود ڈگمگا گیا۔ وہ صورتحال کی سنگینی سمجھتے ہوئے بھی یہ ماننے کو ہرگز تیار نہ تھے کہ سوربھی اُن سے اس طرح الگ ہو گئی ہے۔ بچے سوال پر سوال کر رہے تھے کہ آخر کیوں اُن سے ماں کے پیار کی گھنی چھاؤں چھین لی گئی...... سالوں جن کی چیخوں سے گھر گونجتا رہا تھا آج وہ بالکل چپ بیٹھے تھے جبکہ نگاہوں میں ایک ایک منظر گھوم رہا تھا۔ اُن کی دنیا میں سناٹا چھا گیا تھا۔ حواس باختہ آبدیدہ اور حیران کن نظروں سے بچوں کو تاکے جا رہے تھے۔ اُن کے پاس آج کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ انہیں اب ایک احساس جرم و گناہ ستا رہا تھا۔ سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں بہتی دیکھ اب ان میں اتنی بھی ہمت نہ رہی کہ بچوں کو تسلیاں دیتے۔ اُن کے سر پر ہاتھ رکھتے۔ انہیں سینے سے لگاتے۔ اُن پر ایک عجب

سکتے کی سی حالت طاری ہوگئی۔ بس ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھتے۔ سوچتے رہتے کاش وقت کا پہیہ اُلٹا چلنے لگے اور ایکبار پھر وہ گذرے دن لوٹ آئیں جب ہم دونوں ملے تھے۔ پیار کیا تھا......

دن انتظار میں بیت گیا...... شام ڈھلے دیر ہو چکی تھی۔ جب آدھی شب بیت گئی تو یوراج کو ایک عجب سے خوف نے جکڑ لیا۔ حویلی میں اس عذاب کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا...... یوراج کا دم گھٹنے لگا...... اُنہوں نے گھبرا کر باہر جھانکا...... وہ بری طرح چونکے...... اس ہولناک اندھیرے میں وہ سارے چہرے نظر آرہے تھے جو کل تک اُن کے خوشیوں کے وقت کے ساتھی تھے۔ جن کے ساتھ اُن کے بہت دیرینہ مراسم تھے۔ یہ سب اُن کے ہی ہم خیال تھے کہ خدا نے مرد اور عورت کو برابر کا درجہ نہیں دیا ہے...... آج وہ سب اُن کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہنس ہنس کر اُن کو شکست کا احساس دلا رہے تھے۔ انہیں لگا سارا کا سارا شہر ہی اُن کا مذاق اڑا رہا ہے۔ تب یکا یک انہیں ہوش آیا کہ آخر زمانے والوں کی سازش کام آہی گئی۔ دل کے سارے درد اُبل پڑے۔ کبھی کبھی دوسروں کے کہنے میں آکر ہم خود پر کتنا بڑا ظلم کر ڈالتے ہیں جس کا مداوا کبھی نہیں ہو سکتا۔ شرمندگی سے سر جھک گیا کہ اب کھوئی ہوئی محبت اور عزت کبھی واپس نہیں مل سکتی۔ اس مغرور شخص کے غموں کا سلسلہ شروع ہو گیا......

بڑی انہونی سی ہو گئی تھی۔ سوربھی اپنی قدیمی روایتوں سے جو صدیوں سے اُس کے خاندان کا ورثہ تھیں باغی ہو گئی تھی۔ دل اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ سوربھی سارے بندھن توڑ کر انہیں ذلیل وخوار کر کے سارے خاندان کو شرمساری سے دوچار کر کے چلی گئی تھی...... اُن کے سروں پر خاک ڈال گئی تھی...... وہ مڑے بمشکل اپنے وجود کو گھسیٹتے آئے اور شکست خوردہ انداز میں پژمردہ پلنگ پر جا گرے۔ آج انہیں اپنی بلند و بالا حویلی کھنڈر سی لگ رہی تھی...... در و دیوار آنسو بہاتے معلوم ہو رہے تھے۔ لگا جیسے ٹپ ٹپ چھت سے پانی ٹپک رہا ہو...... یہ تو خود اُن کے آنسو تھے جو متواتر بہے جا رہے تھے...... ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سوربھی اُن کے جسم سے اُن کی جان بھی کھینچ کر لے گئی ہو......

یکا یک باہر کی دنیا ان کے لیے بند ہو گئی۔ صبح ہو گئی...... پوری حویلی پر ایک سیاہ بادل چھا گیا...... پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ ایک بے گناہ بے قصور عورت کو مجرم ٹھہرایا گیا...... عالیشان حویلی کے دروازے سوربھی کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے گئے۔ بچے بلک پڑے آخر ایسا کیوں...... کیا قصور تھا ہماری ماں کا...... قصور تو بس یہی تھا کہ وہ ایک عورت تھی۔ اور مرد عورتوں کو انسان نہیں سمجھتے

حویلی کے اندر ایک بڑا طوفان اٹھ کھڑا ہوا...... بڑا نوحہ۔ گریہ وزاری اور ماتم ہو رہا تھا۔ بچوں کو ماں بڑے عذاب میں ڈال گئی تھی۔ سوربھی کے رُخ بدلتے ہی یوراج کا سارا طنطنہ خاک ہو گیا...... سارا قہر ٹھنڈا پڑ گیا...... اپنے دل کی ایک ایک دھڑکن سوربھی کے دُکھی دل کے نام کر دی۔ ہر وقت اپنے کو ملامت کرتے...... اُن کی رگ رگ میں اذیتوں کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔ وہ تنہا اُن اُداس دیواروں میں مقید ہو گئے۔ خود ہی اپنے دل کی بات اپنے ناشاد دل سے کرتے...... میں تو ہمیشہ سے ضدی اور تند خو انسان تھا۔ پڑھی لکھی سمجھدار ہوتے ہوئے بھی تم نے احتجاج کیوں نہیں کیا۔ کیوں میرے ظلم اور تشدد سہتی رہی...... کبھی تو شکایت کی ہوتی۔ اپنا حق مانگا ہوتا...... یوراج کو اپنے مقدر پر ناز تھا۔ انہوں نے ہمیشہ کامیابیاں ہی دیکھی تھیں...... آج وہ سو فیصدی جیتی بازی ہار گئے تھے...... اس ہار کا سامنا کرنے کی ہمت اُن میں نہ تھی۔ اُنہیں تو لہلہاتا چمن ملا تھا۔ اپنے ہاتھوں ہی خاردار جھاڑیاں بوئی تھیں۔ اب ایک ایک خار اُن کے جسم و جان کو زخمی کر رہا تھا۔ اپنے ہی ہاتھوں اس چمن میں آگ لگائی تھی۔ اب دھواں اُٹھتے دیکھنے کے غم کی ترشی نے جینے کی امید ہی چھین لی تھی۔ بڑی لاپرواہی سے سوربھی کے جذبوں کو راکھ کر رہے تھے۔ اب اپنی انا کی آگ میں جل کر خود راکھ ہوئے جا رہے تھے۔ زندگی کے سارے لمحات ساری نیندیں سوربھی کی یادوں کے بھینٹ چڑھا دیں۔ شوریدہ دل خاموش ہو گیا...... آخر اُن کے کھوئے کھوئے حوصلے بکھرنے لگے۔ چہرے پر زردی پھیلنے لگی...... وہ اندر ہی اندر محسوس کرنے لگے کہ زندگی کا سفر تمام ہونے سے پہلے ہی زندگی اُن کا ساتھ چھوڑے دے رہی ہے...... اب تو بچوں کی طرف دیکھنے کا یارا بھی نہ رہا تھا...... بڑے آزار میں تھے۔ دم رخصت تک اپنی بے جا ضد اور وحشیانہ حرکت پر پچھتاتے ہی رہے۔ سوربھی سے بچھڑنے کا غم اُن کا مقدر بن گیا...... بالآخر غم جدائی نے انہیں مٹا ڈالا۔ حویلی پر سوگ کے بادل اور بھی گہرے ہو گئے...... دھن راج اور رکمنی کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا......

یوراج کی آنکھیں بند ہوتے ہی حویلی کا نظام درہم برہم ہو گیا...... دنیا والوں کے لفظوں کے تیروں اور گھائل کر دینے والی نظروں سے بچنے کے لیے دھن راج اور رکمنی نے اپنی زندگیاں حویلی تک ہی محدود کر لیں۔ رکمنی کمال کی ضبط کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ خاموشی سے تنہا چپکے چپکے روتی جبکہ دھن راج اپنے غموں کو شراب کے نشے میں ڈبو رہا تھا۔ خود تو تباہ ہو ہی رہا تھا ورثے میں ملی دولت بھی لٹا رہا تھا۔ اُس سراسیمگی کے عالم میں حویلی میں رانا کی آمد وہ برداشت نہ کر سکی...... اُسے دیکھ کر رکمنی کا دم جیسے آنکھوں

میں آ گیا...... نفرت انگیز نگاہوں سے رانا کو دیکھ کر حقارت بھرے لہجے میں گویا ہوئی...... "آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں اور آئندہ نہ آئیں" ...... ورنہ...... رانا ہنسا اور مغرورانہ انداز میں بولا۔ ہم ایک دن اپنی امانت لینے جلد ہی بارات لے کر آئیں گے...... رُکمنی کی نس نس میں چنگاریاں سلگ اُٹھیں...... جلتی کھولتی آواز میں بولی...... رانا صاحب اب ان دقیانوسی روایتوں کا دور ختم ہو چکا ہے نا ہی میں کمسن ہوں اور نہ ہی ان پڑھ جاہل جو ہر شخص کی بات پر سر جھکا دوں...... دماغ رکھتی ہوں اپنا برا بھلا سوچنے کا۔ میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرونگی۔ میں کسی کی امانت نہیں ہوں۔ میں اپنا حق لینا جانتی ہوں اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہوں۔ یہاں تک کہ عدالت کے دروازے بھی کھٹکھٹا سکتی ہوں......

رانا خاصے ٹیڑھے دماغ کا مغرور آدمی تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی جو اُس کے فیصلے سے انحراف کر سکے۔ ایک لڑکی کے ہاتھوں اپنی توہین کیسے گوارا کرتا...... ایک چیخ کے ساتھ اُس کی بات کاٹی۔ بڑی نادان ہو...... ہمیں تم ابھی تک نہیں پہچانتی ہو۔ ہمیں جو چیز پسند ہو اور آسانی سے نہ ملے ہم اُسے چھین کر حاصل کرنے کے عادی ہیں۔ بڑی لاپرواہی سے کندھے اُچکائے اور نہایت غصے سے غیر متوازن قدم پٹختا باہر نکل گیا...... رُکمنی کتنی ہی دیر کانپتی رہی۔ ایک کے بعد ایک بحران آ رہے تھے اور وہ تنہا...... قسمت ستم ڈھا رہی تھی اور اُسے کس قدر خطرناک موڑ پر لے آئی تھی۔...... کوئی ہدایات دینے والا نہ تھا اس پر رانا کی دھمکیاں۔ اب تو نہ رات نیند نہ دن چین تھا......

انسان کے لیے تنہائی کی وہ گھڑی بڑی بے بس اور اذیت ناک ہوتی ہے جب کوئی اُس کا قصۂ درد سننے والا نہ ہو...... وہ بدحواسی کے عالم میں باغ کی طرف نکل گئی...... تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھی۔...... سنئے سنئے...... اس اجنبی آواز پر بڑھتے قدم رک گئے...... رُکمنی نے جلدی سے اپنے رخساروں پر ڈھلتے آنسو پونچھ ڈالے...... وہ ایک دم پیچھے سے سامنے کھڑا ہوا...... بیساختہ اُس کے منہ سے نکلا...... ہائیں آپ...... یہاں...... آپ کو دیکھ کر مجھے خود اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہو رہا...... اُسکے لہجے کا طرز بتا رہا تھا جیسے وہ اُسے واقعی بہت عرصے سے جانتا ہے...... پہچانتا ہے...... رُکمنی نے حیرانگی سے کہا...... ہم پہلے کبھی ملے...... ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ وہ مبہم سا مسکرایا...... ہمیں غلط فہمی کبھی نہیں ہوتی...... بڑے اطمینان سے بولا...... آپ چہرے سے بہت پریشان نظر آ رہی ہیں...... شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں...... جی نہیں...... وہ کرختگی سے بولی...... ہمیں کسی کی مدد اور ہمدردی کی ضرورت

نہیں...... آخر آپ کو ہماری فکر کیوں ہوگئی...... وہ ہنس کر بولا۔ ہم انسانی معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں...... انسان کو ایک دوسرے کی فکر کرنا لازمی ہے۔ اس دور میں کسی کے پاس کسی کے دُکھ بانٹنے کا وقت ہی نہیں رہا ہے۔ اس ہی لیے ہر انسان خود کو بہت تنہا محسوس کرتا ہے...... آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں...... اعتبار...... اس ایک لفظ نے جیسے رکمنی کے سینے میں دبی چنگاری کو بھڑکا دیا...... ایک پل میں کتنی ہی یادیں آتی چلی گئیں...... وہ قیامت کا دن...... جس دن اُس کے خاندان کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا تھا۔ ماں نے اپنے پیچھے صرف جدائی کا غم ہی نہیں چھوڑا تھا وہ تو گھر کی درو دیوار تک مسمار کر گئی تھی...... اس نا قابل برداشت دکھ سے وہ نڈھال تھی۔ کچھ وقفہ کے بعد بولی...... نہیں نہیں...... اس دور میں اپنوں پر اعتبار اور بھروسہ نہیں کیا جاسکتا آپ تو ٹھہرے اجنبی...... وہ دنیا والوں کے طعنے بہت سن چکی تھی اور اب زیادہ سننے کی ہمت اس میں نہ تھی...... سو آگے بڑھ گئی...... اجنبی بھی ساتھ ہولیا...... ایک بار پھر سوچ لیں...... اُس کا راستہ روک کر کھڑا رہا...... جب کوئی جواب نہ ملا تو بڑے دلفریب انداز میں بولا...... اب ہم چلیں...... پھر کب ملنا ہوگا...... ہزاروں امیدوں کے ساتھ وہ جواب کا منتظر تھا...... کبھی نہیں...... اُدھر سے برجستہ جواب آیا...... ''کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں'' ...... وہ اُس کے اس سوال پر ٹھٹکی...... رکمنی بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئی تھی۔ چہرے پر دُکھ اور بے اطمینانی کا اظہار تھا...... رکمنی کا پریشان چہرہ دیکھ کر بولا...... بڑی ظالم ہوتی ہے تنہائی کی آگ۔ انسان کے جسم و جان کو جھلسا دیتی ہے۔ تنہا انسان ایک خشک شجر کی مانند ہوتا ہے جسے نا بہاروں کی ٹھنڈی ہواؤں کا احساس ہوتا ہے اور نا خزاں کی تیرگی کا...... وہ نظریں اُٹھا کر بولی۔ ہمیں ان راز و نیاز کی باتوں پر قطعی یقین نہیں...... اُس کے لہجے میں بے یقینی اور درد تھا...... اجنبی بڑی خوش دلی سے بولا...... ایک بار کسی پر بھروسہ کر کے تو دیکھیے۔ زندگی گلزار بن جائے گی...... اجنبی کی آنکھوں میں خوشیاں رقص کرتی دیکھ وہ بے اختیار مسکرا دی...... وہ بڑے مسرور لہجے میں بولا...... آپ کی ایک ہلکی سی مسکان نے تو ساری کائنات کا رنگ ہی بدل ڈالا...... ابھی کچھ دیر پہلے ماحول کتنا افسردہ تھا، کتنی گھٹن تھی۔ دیکھئے پیڑوں کی شاخیں جھومنے لگی ہیں۔ پھول بولنے لگے ہیں...... ماحول پر خوشگواری چھا گئی ہے۔ آپ ہمیشہ ہنسا کریں...... وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ ہمارے پاس ہنسنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی ہے۔ وہ دیکھتی ہی رہ گئی اور اجنبی یہ جا اور وہ جا......

کئی دن بیت گئے...... کون تھا...... کہاں سے آیا تھا۔ رکمنی کو بار بار اُس شخص کی یاد آتی رہی جس

کی باتیں اُس کے دکھیارے دل کو دلاسا دے گئی تھیں...... وہ اپنے خیالوں میں گم سم بیٹھی تھی۔ وہ دبے قدموں سے نہ جانے کب اندر آ گیا تھا۔ بڑے سکون سے اُس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا تھا...... ذرا کھٹکا ہوا...... اُسے یوں کھڑا دیکھ رکمنی کے سارے وجود میں کپکپی دوڑ گئی...... چونک کر بولی۔ آپ...... یہاں کیسے...... وہ اُس کے قریب گیا اور اُسی سکون سے سوال کیا...... آپ کو بھی ہمارا ہی انتظار تھا...... تھا ناں...... وہ نظریں جھکا گئی...... تو بولا۔ ہمارے ذہن کے پردے پر صرف آپ کے نقش چھائے ہوئے ہیں...... ہم تو بس یہی آس لیے جی رہے ہیں کہ آپ جیسی لڑکی کہیں نہ کہیں ہماری راہ تک رہی ہوگی۔ یقین کریں کبھی یہ سوچا نہ تھا کہ آپ اس حویلی میں ملیں گی...... رکمنی نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا...... بولی ہمیں تنہا چھوڑ دیں...... آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں اور مٹا ڈالیں وہ سارے نقش...... کیونکہ ہمیں محبت کے کسی رشتے پر یقین اور بھروسہ نہیں رہا ہے...... اجنبی نے اُسی پرسکون انداز میں کہا آپ ساری زندگی شک وشبہہ کے اندھیروں میں ڈوب کر نہیں گذار سکتیں...... وہ ایک دم بولی...... یہ شک نہیں ہے ہماری زندگی کی حقیقت ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا...... انسان بہت خود غرض ہوتا ہے۔ ہر رشتہ اپنی خوشی اور مرضی کے مطابق نبھاتا ہے۔ آج کل انسانوں کے نزدیک کسی رشتے ناتے کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اُس کی آواز میں دُکھ بھرا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ پھر سوچا یہ دُکھ میرے ہیں یہ غم مجھے تنہا ہی سہنے ہیں یہ رسوائی اور یہ بدنامی بھی صرف میری ہے ایک غیر کو کیوں اپنے دکھ کی داستان سناؤں۔...... وہ خاموش ہوگئی......

اجنبی بڑی مہربان آواز میں بولا نا امیدی اور بے اعتباری انسان کو بڑے عذابوں میں ڈال دیتی ہے...... محبت کا ہر رشتہ، بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ انسان صرف محبت کے سبب سے زندہ رہتا ہے۔ آپ دنیا میں رہ کر دنیا والوں سے دور نہیں رہ سکتیں...... پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں فوراً ہی وہی سوال کیا...... واقعی کیا آپ چاہتی ہیں ہم چلے جائیں...... ''اور من ہی من میں سوچنے لگا یہ ضروری تو نہیں کہ محبت کے عوض محبت ہی ملے'' ...... پیار جیسی چیز تو مقدر سے ملتی ہے۔ میرے ایسے نصیب کہاں'' وہ کچھ نہ بولی تو بے حد پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ہم جاتے ہیں۔ آپ کو بتاتے چلیں ہم نے آج تک جتنے بھی خواب دیکھے ہیں آپ ہمارے اُن خوابوں کی تعبیر ہیں...... آپ نے اپنے دل کے دروازے اتنی مضبوطی سے بند کر لیے ہیں کہ محبت کی دستک بھی سن نہیں سکتیں...... لیکن کبھی تو کوئی روزن کوئی در کھلے گا۔...... ہم اُس دن کا انتظار کریں گے...... وہ مڑا اور باہر نکل گیا...... رکمنی دیر تک حیرت زدہ

دروازے کو دیکھتی رہی......

دھن راج کے زخمی ہو جانے کی خبر سنتے ہی رکمنی کو لگا جیسے اُس کے جسم میں بہتا لہو منجمد ہو گیا ہو۔ بڑے زور شور سے رانا کے الفاظ اُس کی سماعتوں میں گونجنے لگے...... سر پھٹا جاتا تھا...... وہ کس کو الزام دیتی۔ یہاں تو قسمت ہی ستم توڑ رہی تھی...... اُسے محسوس ہوا کڑی دھوپ پڑ رہی ہو اور وہ بے سائبان تنہا کھڑی رہ گئی ہو...... اُسے شدت سے اُس شخص کی یاد آئی جس کی نرم نرم باتیں اور چہرے کی متانت یقین دلا گئی تھی کہ وہ ہر مرحلے پر ساتھ دے گا...... وہ اس عالم تنہائی میں بیحد خوف زدہ تھی...... ہر لمحہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اُس کے چاروں جانب لوگ ہاتھوں میں سنگ لیے صرف اس پر حملہ آور ہونے کو کھڑے ہیں اور کوئی بچانے والا نہ تھا...... ایسی کٹھن گھڑیوں میں اجنبی نے ایک بار بھی اُس کی خبر نہیں لی تھی...... پھر بھی نہ جانے کیوں سارے شکووں کے ساتھ بھی بے تحاشا اُس کی یاد آ رہی تھی...... ہر پل یہی گمان ہوتا بس وہ ابھی آ جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا......

دھن راج صحت یاب ہو کر جب گھر لوٹے تو سب کو ایسا لگا کہ ایک مدت کے بعد خوشیاں بہت مشکل راستوں سے گذر کر حویلی پہنچی ہوں...... حویلی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ دھن راج کو وشنو کمار نظر نہ آئے تو رکمنی کو اُن کے گھر جا کر ساتھ لانے کا حکم دیا...... وہ ہچکچائی کہ اس نام کے شخص کو جانتی نہ تھی۔ رکمنی نے وہاں دروازہ کھلا دیکھا تو آگے بڑھتی گئی۔ تمام کمرہ پھولوں سے سجا تھا۔ یہاں تک کہ فرش لال گلاب کی پتیوں سے ڈھکا تھا...... وہ حیران تھی...... قدم رُک گئے تھے...... ایک بھینی بھینی خوشبو رقص کر رہی تھی...... مکمل سناٹا تھا...... لگتا تھا وہاں کوئی نہیں ہے۔ انتہائی حیرت سے رکمنی نے چارسو دیکھا تھا...... اُس مہکی مہکی فضا میں رقص کرتی خاموشی جیسے اُس سے ہی کچھ کہہ رہی تھی...... اُسے آگے بڑھنے کی تاکید کر رہی تھی...... اور ایکدم اُس کی آنکھوں میں محبت کے نور سے چمکتا چہرا آ گیا...... جو کہہ رہا تھا...... آ تجھے تیری منزل تک پہنچاؤں...... وہ آگے بڑھی...... سامنے نظر اٹھی...... پھر ٹھٹک کر کھڑی ہی رہ گئی...... وہ اُس پینٹنگ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی...... یہ تو اُس کا ہی چہرہ تھا جو گلابی گھونگھٹ میں سے چمک رہا تھا...... وہ چونک کر پلٹی اور پلٹ کر بُری طرح چونکی تھی...... وہ جو اُس کی یادوں میں کھویا تھا اور اتنے لمبے انتظار کے بعد آج اُس چاند چہرے کو دیکھ رہا تھا کچھ دیر تک مبہوت سا کھڑا دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر رکمنی کی طرف جھک کر شگفتہ لہجے میں بولا...... زہے نصیب...... آج تو چاند آسمان سے زمین پر اُتر آیا ہے۔ ہمارے تاریک گھر

میں ہر سو چاندنی پھیل گئی ہے...... وہ ناراض تھی اور اُس کا ناراض ہونا جائز بھی تھا...... برہمی سے بولی ہمیں بھائی نے بھیجا ہے آپ کو اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہوگا...... وہ مسکرایا...... بھلا آپ کا حکم ٹالنے کی جرأت ہم میں کہاں۔ یقین کریں ہم آپ کی ہی راہ تک رہے تھے۔ ہمارا دل گواہی دے رہا تھا۔ آج آپ ضرور آئیں گی۔...... جانے سے پہلے ایک بار آپ سے ملنا نہایت ضروری تھا...... ہمارا یہ شاہکار دیکھنے کے بعد تو آپ کے اندیشے دُور ہو گئے ہونگے...... یقین آ گیا ہوگا کہ ہمارے خوابوں اور خیالوں پر آپ کی اجارہ داری ہے...... وہ اب بھی خاموش بت بنی کھڑی تھی...... تو وہ پھر بولا آپ کے اندر ایک جنگ چھڑی ہوئی ہے...... آپ اپنے آپ سے کب تک لڑتی رہیں گی...... کب تک جھوٹ بولیں گی...... خود سے اور ہم سے...... رکمنی کے دل میں بے یقینی مکین تھی...... فوراً ہی بولی...... ہمیں کسی پر اعتبار نہیں رہا...... وشنو نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ساری بات اعتماد کی ہے...... ایک بار اعتماد ٹوٹ جائے تو انسان بھی ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ آپ بھی غموں کے بوجھ تلے ٹوٹ گئی ہیں۔ بکھر گئی ہیں...... آپ اپنے کو سمیٹنے کی کوشش کریں...... رکمنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی ان حالات میں ہم کسی کا کیسے یقین کر لیں...... جبکہ آپ کو کچھ بھی خبر نہیں ہم پر کیا کیا بیتی...... خیر دھوپ میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے پھر آپ ہمیں کیوں یاد کرتے...... دل میں جو بات کھٹک رہی تھی زبان پر آ ہی گئی...... وشنو نے مسکرا کر کہا یاد تو اُسے کیا جاتا ہے جسے بھلایا جا سکے...... آپ کا گلہ بھی بجا ہے...... ''اب وہ اُسے کیسے یقین دلاتا کہ وہ ہر پل اُسے یاد آتی تھی...... اور یہ دوریوں کے کرب بھی اُس کی ہی خاطر ہیں...... وہ اُن گذرے لمحات کا حساب بھی دے سکتا ہے...... لیکن...... آپ کا جو اکھڑا اکھڑا سا رویہ ہمارے ساتھ ہے ہمیں اُس کا قطعی غم نہیں...... افسوس ہے تو یہ کہ آپ نے خوشیوں سے ناتا توڑ لیا ہے۔ آپ غموں میں ڈوب کر رہ گئی ہیں...... باہر نکلئے اس اداسی کی دنیا سے۔ وہ اُسے ہر طرح منانے کی کوشش کر رہا تھا...... اور وہ جو اپنے دل کا حال آج تک چھپائے آ رہی تھی اور نا چھپا سکی۔ محبت کا سیلاب ساری باڑیں توڑ کر باہر آ نکلا...... خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی مسرور سی آواز میں بولی...... اب چلیں بھی بھائی آپ کا انتظار کر رہے ہیں......

خوشیوں کا انوکھا سا احساس پہلی بار رکمنی کے دل میں بیدار ہوا تو چہرے پر افق کے رنگ بکھر گئے...... وشنو نے جب سے رکمنی کو پہلی بار دیکھا تھا وہ تو اُس کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا تھا کہ اُسے اپنے آپ پر اختیار ہی نہ رہا تھا۔ سب کچھ بھلا بیٹھا تھا...... آج جب دلی مراد بر آئی تھی...... وہ اُس کے پہلو میں

بیٹھی تھی......اور بہت خوش نظر آ رہی تھی......وہ بھی اُس کے بدن سے اُٹھتی خوشبو اپنے اردگرد محسوس کر رہا تھا تب ایکدم ایک خیال نے اُسے لرزا دیا......اُس کا ذہن گاڑی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے ماضی کی طرف دوڑنے لگا......بچپن سے لے کر آج تک کا سفر پلوں میں طے کر لیا۔ ایک ایک گذرا واقعہ یاد آ گیا۔ اپنی بے سروسامانی اور رکمنی کی حیثیت اور اُس کی امارتوں کا موازنہ کیا تو ارمانوں کا چاند ڈوب گیا......یہ میں کیا نادانی کر بیٹھا......بیقرار دل......البتہ بول ہی اُٹھا......محبت تو دلوں میں جنم لیتی ہے یہ دنیاوی دولت کے سہارے پھولتی پھلتی نہیں......وشنو کے خیالات مضطرب دائروں میں چکر لگاتے رہے۔
اُس نے پاس بیٹھی رکمنی پر ایک نظر ڈالی جو بہت پرسکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی......

حویلی میں چہل پہل ہونے کے باوجود بھی جیسے ہی وشنو اندر گئے ہر انسان اُن کی طرف متوجہ ہو گیا......شاید یہ اُن کے پولس یونیفارم کا کمال تھا رکمنی نے سوچا تھا۔ پھر سب نے بے تحاشا تالیاں پیٹیں......اُن کی آمد پر دھن راج نے بڑی شادمانی سے کہا آپ کی خاطر اس حویلی کی جو خوشیاں مٹ گئی تھیں لوٹی ہیں اور آپ ہی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے جبکہ اس موقع پر آپ کا یہاں ہونا نہایت ضروری ہے......

اس انداز پذیرائی پر رکمنی نے حیرت سے وشنو کو دیکھا جو دھن راج سے محو گفتگو تھے......دھن راج خوشی کا والہانہ اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے......''جب ہمیں ہسپتال میں ہوش آیا تو اپنے بے یار و مددگار ہونے کا احساس شدت سے ہوا تھا......ہم رکمنی کے لیے بہت زیادہ فکرمند تھے جو ہمارے لیے دنیا میں سب سے قیمتی ہے......آپ نے آ کر ہمارا ہاتھ تھام لیا......آپ نے ہم دونوں کو رانا جیسے دغا باز آدمی کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بچا لیا......آپ کا یہ احسان ہم زندگی بھر بھلا نہ سکیں گے......یقین کریں ہم ناامید ہو گئے تھے۔ یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہم رکمنی کا منہ دوبارہ دیکھ پائیں گے......''اُسی دم وہ جو اُس کو بے وفا اور خطاوار سمجھ رہی تھی چونکی......اُس کی شرمندہ نظریں کہہ رہی تھیں کہ ہمارے شکوے بجا نہ تھے۔ اور وشنو کے دل میں وہی خلش جاگی......کیوں میں نے اس چاند کو چھونے کی تمنا بھی کی......مجھ جیسے خاک نشین کا عرش میں ڈیرا......کبھی نہیں......دنیا میں امارت اور غربت کے معیار اٹل ہیں۔ وہ پھر گہرے سوچ میں ڈوب گئے تھے......ایک اچٹتی سی نگاہ رکمنی پر ڈالی جو اپنے بھائی کے مضبوط بازوؤں کے حلقے میں محفوظ بیٹھی تھی اور اُس کے چہرے سے حقیقی مسرت ٹپک رہی تھی......

جسے آپ احسان کہہ رہے ہیں وہ تو انسانی فرض ہے۔ وشنو کی گمبھیر آواز آئی۔ زندگی میں نشیب و

فراز آتے ہیں۔ چھوٹے بڑے واقعات کی ایک لمبی زنجیر کا نام زندگی ہے۔ کبھی کبھی ایسے حادثات پیش آتے ہیں کہ انسان کو فرار کی راہ نہیں دکھائی پڑتی...... گمراہ ہو جاتا ہے۔ زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ بہر حال زندگی تو ہر حال میں گذارنی ہوتی ہے۔ ہنس کر یا رو کر۔ بہتری اسی میں ہے کہ زندگی کا روشن پہلو دیکھا جائے...... دھن راج مسکرائے...... بولے آپ کی قابلیت نے تو ہمیں قائل کر ہی دیا ہے آپ کی ان ہی مخلصانہ اور مشفقانہ باتوں نے ہمیں آپ کا گرویدہ بنا دیا ہے...... ہمارے دل میں آپ کے لیے ایک خاص مقام ہے۔ اور ہم آپ کو اپنے گھر میں بھی ایک بلند مقام دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں دوسری زندگی ملی ہے۔ اب ہم جلد سے جلد اپنی بہن کو دلہن بنانے کے خواہشمند ہیں...... وشنو جو گہرے سوچ میں ڈوبے تھے اُن کے دل کی بات سمجھ کر چونکے تھے...... پھر لمحہ بھر کو سوچتی ہوئی نگاہوں سے رکمنی کو دیکھ کر کہا آپ کو یکا یک یہ خیال کیسے آ گیا...... یہ زندگیوں کے بڑے بڑے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں۔ جلد بازی اور جذباتیت سے نہیں...... میں اس بلند مقام کا اہل نہیں...... میں اور آپ دو فرق دنیاؤں کے لوگ ہیں...... کہاں میں اور کہاں آپ...... میں کیا ہوں...... کون ہوں مجھے خود خبر نہیں...... جب ہوش سنبھالا تو اپنے کو اس رشتوں سے بھری دنیا میں بالکل تنہا پایا...... یتیم خانے میں پروان چڑھا...... آنسو اُن کی آنکھوں میں آ کر ٹھہر گئے اور آواز بھاری ہو گئی۔ کچھ ٹھہر کر بولے اس خود غرض دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں جن کی وجہ سے دنیا چل رہی ہے...... یہ وہ خاص اور قیمتی لوگ ہیں جو اس دنیا میں صرف محبت، پیار اور ہمدردی بانٹنے آتے ہیں...... ایسے کام وہ ہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو اپنا سب کچھ قربان کر کے اپنی زندگیاں لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے ہیں...... بہر حال ہم نہیں جانتے ہم کون ہیں۔ ہمارے ماں باپ کون ہیں...... بس اتنا جانتے ہیں آپ کی ماں نے ہمیں سگی ماں کا پیار دے کر محبت کا سبق سکھایا...... اگر وہ نہ ہوتیں تو ہم زندگی بھر محبتوں کو ترستے رہتے۔ یہ اُن کی محنت اور محبت کا نتیجہ ہے کہ مجھ جیسا حقیر...... کمتر...... یتیم بچہ آج تک زندہ ہے...... اور آج اس مقام پر سر اٹھا کر بات کر سکتا ہے...... دھن راج اور رکمنی مارے حیرت کے اُسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ وشنو اب بہت پُرسکون نظر آ رہے تھے......

دھن راج نے اُن کو گلے لگا لیا۔ پھر کورنش بجا کر کہا...... ہمارا فیصلہ اٹل ہے یکا یک یہ فیصلہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے...... آپ کون ہیں...... آپ بھی خدا کے بنائے سب کی طرح انسان ہیں۔ اُس کی ہی مخلوق ہیں جس نے ساری دنیا بنائی ہے۔ میں پیار میں دنیا داری کا قائل نہیں ہوں...... ماں کا ذکر

سنتے ہی رکمنی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے تار بہہ نکلے تھے۔ دھن راج بھی اداس ہوگیا...... ارے رے رے یہ آپ دونوں کو کیا ہوگیا کبھی کبھی خوشیاں اچانک ہی آجاتی ہیں...... جو غیروں سے محبت کرتے ہیں وہ کبھی ٹوٹتے نہیں۔ بکھرتے نہیں...... وہ سخت سے سخت مشکلات کا سامنا کرتے ہیں...... آپ دونوں کو تو فخر ہونا چاہیے کہ آپ ایک بہادر ماں کے بچے ہیں...... جو اپنے اصولوں کی پکی تھیں...... ابھی کمبھ کا میلا چل رہا ہے ہزاروں بیواؤں کو اُن کے اپنے لوگ وہاں بالکل بے سہارا کھلے آسمان تلے چھوڑ گئے ہیں...... آخر قدرت نے ان سے وہی کام کروایا جس کے لیے وہ پیدا ہوئی تھیں...... میں تو صرف آپ کے درد بانٹنے آیا تھا...... ماں کا حکم بجالانا میرا فرض ہے۔......

وشنو نے اپنا موبائل فون نمبر لگا کر دھن راج کو تھما دیا...... ماں کی آواز سنتے ہی خوشیوں کا ایک سیلاب اندر سے اُمڈ آیا...... دونوں بھائی بہن خوشی سے سرشار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ بات ماں سے کر رہے تھے اور دونوں کی نظریں مستقل وشنو پر جمی تھیں...... رکمنی نے وشنو کے چہرے پر رقصاں فاتحانہ مسکراہٹ بھی بخوبی دیکھی تھی۔ دونوں نے اوپر دیکھا تھا۔ تاروں کا جمگھٹ تھا۔ پورا چاند چمک رہا تھا اور وشنو کی حیات جگمگا اٹھی تھی...... دھن راج کے دل کی گہرائیوں سے دونوں کے لیے دعائیں نکلی تھیں...... اور منہ سے بے ساختہ نکلا تھا کاش آج ماں یہاں ہوتیں......!!!

☆☆☆
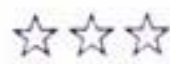
دکھیاروں کا پریوار

ٹپ۔ ٹپا۔ ٹپ...... پہلی بارش کی پہلی ننھی ننھی بوندیں پیاسی دھرتی پر پڑیں تو سب کے دل شاد ہو گئے۔ مگر گلا بو کا دل اندر ہی اندر کراہ اٹھا...... وہ بھیانک منظر آنکھوں میں اتر آیا جب ساری دھرتی پر پانی ہی پانی نظر آرہا تھا، اُس کا گاؤں پانی میں ڈوب کر تہس نہس ہو گیا تھا۔ اُس کی کٹیا کی کچی دیواریں ڈھنے سے کچھ دیر پہلے اُس کی ماں نے بولنا بند کر دیا تھا۔ وہ اماں کا سر ہلا ہلا کر اُسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی رو رو کر اپنے باپو کو پکارے جا رہی تھی۔ خوف کی شدت سے اُس کا چھوٹا سا دُربل شریر لرز رہا تھا۔ پھر اُسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی تھی......

جب...... جب چھت پر برکھا برستی گلابو اپنے گاؤں لوٹ جانے کے سپنے دیکھنے لگتی۔ اُسے پورا یقین تھا کہ اس کی ماں اور باپو دونوں گاؤں میں اس کی باٹ دیکھ رہے ہونگے......

رام بھروسے جب اپنے گھر سے نکلا تو گنگا رام نے اُسے راستے میں روک کر کہا...... چاچا ٹونا ٹوٹکا تو کام آیا نہیں۔ جلدی چاچی کو کسی وید یا حکیم کو دکھا...... کچھ تو کر...... کہیں چاچی بھی بنا دوا کے...... بولتے بولتے وہ رُک گیا...... رام بھروسے کے دل میں ایک ٹیس سی لگی...... ارے رُک کیوں گیا...... تو یہی کہنے جا رہا تھا کہ تیری چاچی مر نہ جائے...... میں جانتا ہوں وہ نہیں مرے گی اس کا نام لیلا۔ بیلا نہیں...... ساوتری ہے ساوتری، وہ یم دوت سے بھی لڑ جھگڑ کر میرے پاس لوٹ آئے گی...... بچپن سے ہی تو سنتے آئے ہیں...... ہم گاؤں کے غریب لوگ بھگوان کے بھروسے جیتے ہیں...... تیری چاچی یہ بھی جانے ہے میں اُس کے سوا جی نہیں سکونگا......

دیکھ میرے تن پر گت کے کپڑے نہیں۔ خون تھوکتے ہڈی ہڈی رہ گیا ہوں۔ میرے دُربل شریر کا پکا کچا خون بھوک نے چوس لیا ہے۔ چلا نہیں جاتا پھر بھی چل رہا ہوں۔ صرف تیری چاچی کی خاطر شہر جا رہا ہوں۔ گاؤں میں نہ کوئی دھندا نہ مزدوری۔ شہر میں کچھ ملے تو علاج کرواؤں۔ پٹواری سے ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگی۔ زمیندار کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکا...... دونوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ زمیندار نے لمبا چوڑا بھاشن دے ڈالا۔ بولا۔ اب زمینداری ختم ہوگئی۔ اب زمینداروں کا نہیں منتریوں کا راج ہے۔ تو

ووٹ منتریوں کو دیتا ہے اُن کے سامنے ہاتھ پھیلا۔ اب ہم نہیں وہ ہی سب کے مائی باپ ہیں......

یاد کر چاچا جب پچھلے سال ووٹ بٹورنے آئے تھے تو چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے......اب تمہارے دُکھ کے دن ختم ہو گئے۔ اب تمہارا سُکھ کا موسم آیا ہے۔......سب جھوٹ......میں نے تو آج تک سکھ کی ایک سانس بھی نہیں لی۔ ہم غریبوں کی نگری پر تو سال بھر ایک ہی موسم ٹکا رہے ہے۔ ''بھوک کا موسم'' ہمارے سروں پر ہر سمے دُکھوں کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔ دل ہر سمے ڈرتا ہی رہے ہے۔ نہ جانے کب برس پڑیں......

رام بھروسے بولا...... یہ منتری ووٹ تو بھولے بھالے ان پڑھ کسانوں کے بٹورتے ہیں اور دیکھ بھال شہر کے مالداروں کی کرتے ہیں...... مزدوروں، کسانوں، غریبوں کی انہیں ذرا سی بھی پروا نہیں۔ ہمارے گاؤں میں نہ اسکول ہے نہ ہسپتال......ہم غریب، غربا تو مر مر کے جی رہے ہیں......

اجنبی جگہ میں گلابو نے آنکھیں کھولیں تو بیحد ڈر گئی...... باپو تو کہاں ہے...... گاؤں جا کر جلدی میری ماں کو لے آ۔ اُس کے بنا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے......وہ رو پڑی......ڈر نہیں چھوری......اب نہ رو......نرم نرم آواز سنی تو گلابو نے آنکھیں کھولیں......شاردا ماں کا مسکراتا چہرہ دیکھ اُس کا دل ذرا سنبھلا......لے گرم گرم دودھ پی لے......گلابو نے گٹ گٹ دودھ پی کر کانپتے لہجے میں پھر سوال کیا......ماں جی یہ کونسی جگہ ہے؟......میں کہاں ہوں......میرے ماں باپ کہاں ہیں؟......شاردا مائی نے اُسے کپڑے تھماتے ہوئے کہا...... پہلے کپڑے بدل لے پھر بات کریں گے......

اس خود غرض اور بے رحم انسانوں سے بھری دنیا میں شاردا دیوی جیسے نیک لوگ بھی رہتے ہیں جو کہتے ہیں خدا کے بنائے سارے انسان برابر ہیں۔ خدا نے انسان بنائے مگر انسانوں نے بنائے ذات پات۔ اونچ نیچ کے بھید بھاؤ نے اس خوبصورت دنیا کو نرک بنا دیا ہے۔ انسانوں کے کام آنا ہی ان مہان لوگوں کا دین و دھرم ہے۔ اپنے غموں اور دکھوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ لوگ دکھیاروں اور مصیبتوں سے گھرے ہوئے لوگوں کے دُکھ دور کرنے میں جٹے رہتے ہیں۔ بیواؤں۔ یتیموں۔ مسکینوں اور گرتے ہوئے لوگوں کو تھام لیتے ہیں۔ انہیں جینے کا سہارا دیتے ہیں......

شاردا دیوی خود تو اونچی ذات کی تھیں مگر اُن کی یہ آزاد خیالی اُن کے سگے رشتے داروں کو پسند نہ تھی۔ سب نے اُن سے ناتا توڑ لیا تھا۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے اُن کا اپنی ذات برادری کا شخص اُن سے ملنے

آ بھی جاتا تو وہ کہنے سے نہیں چوکتی تھیں کہ تم انسان نہیں پتھر ہو......جس دل میں انسانوں کے لئے پیار نہیں وہ دل پتھر ہوتا ہے......تم سب نے مجھے چھوڑ دیا تو کیا ہوا۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرا اپنا الگ ایک پریوار ہے۔ دکھیاروں کا پریوار'' میں اپنی آخری سانس تک اپنے اس دُکھی پریوار کو سنبھالنے کی کوشش کرونگی......

گلابو کپڑے بدل کر آئی اور ماتاجی کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگی......جب خوب رولی اور دل تھوڑا ہلکا ہوا تو اپنا سوال دوہرایا......کھانے کی تھالی دیکھتے ہی بھوک سے بلبلاتی لڑکی سب کچھ بھول بھال کر کھانے کی طرف لپکی......تھکان اور غم سے چور بھی اور ڈری بچی کے پیٹ کی بھوک مٹی تو وہیں سو پڑی اور دیر تک سوتی رہی......

آنکھ کھلتے ہی اُس نے زور سے اپنے باپو کو پکارا......شاردا دیوی نے اُسے نیم کی داتون دیتے ہوئے کہا تیری قسمت بھلی تھی جو تو یہاں پہنچا دی گئی......جا منھ ہاتھ دھوکر روٹی کھالے۔ وہ لوٹی تو ماں جی نے اُس کا نام پوچھا۔ ہولے سے بولی......گلابو......بہت سندر نام ہے تیرا بالکل تیرے مکھڑے کی طرح......انہوں نے اُس کے چہرے پر پیار بھرا ہاتھ پھیرا اور بولیں تیرا باپو کہاں ہے میں نہیں جانتی......روٹی دیتے ہوئے بولیں......لے روٹی کھالے وہ روٹی ہاتھ میں پکڑے دیر تک روٹی کو دیکھتی رہی، اس کی آنکھیں برس پڑیں شاردا اماں کا دل بھر آیا۔ اسے تھام کر بولیں۔ اب زیادہ نہ سوچ......گلابو پُر درد لہجے میں بولی کل گاؤں میں جب سب اکٹھا تھے تو روٹی نہیں تھی آج روٹی ملی تو میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ نہ معلوم انہیں روٹی ملی یا نہیں......

گلابو کی درد بھری آواز نے ماں جی کا کلیجہ ہلادیا......تو نراش نہ ہو۔ مجھے اپنے باپ اور اپنے گاؤں کا نام بتادے۔ میں دونوں کو ڈھونڈ کر لے آؤنگی......گلابو کا ہاتھ منھ تک جاتے جاتے رُک گیا۔ پر امید نظروں سے ماں جی کی طرف دیکھ کر بولی......باپو کا نام تو......باپو ہی ہے۔ اماں اُسے گلابو کے باپو کہہ کر ہی پکارتی ہے......پھر تھم تھم کر بولی......گاؤں......کا......نام......مجھے نہیں معلوم......ماں جی نے اُسے دلاسا دیا۔ ابھی کھالے......بعد میں یاد کر کے نام بتادینا......

شاردا دیوی سوچنے لگیں کتنے احمق ہیں میرے دیس کے بچے۔ اپنے باپ اور گاؤں تک کا بھی نام نہیں جانتے......کب جہالت، غربت اور ناداری کے سیاہ بادل چھٹیں گے......کب علم کا سورج چمکے گا۔

کب سویرا ہوگا۔ کب اس دیس کا بچہ بچہ مسکرائے گا۔ کب گاندھی جی کے سپنے پورے ہونگے......

بوڑھی شاردا مائی جی اپنی ہمت اور طاقت سے زیادہ کام کرتی تھیں......ایک دن چکر کھا کر گر پڑیں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ جھاڑ پھونک والے فوراً ہی بھوت کا علاج کرنے آ پہنچے۔ ماں جی بھوت پریت میں بسواس نہیں کرتی تھیں۔ بہت چیخیں چلائیں مگر وہ لوگ نہ مانے۔ بولے بات آپ کے بسواس کی نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بھوت نے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔ اگر ہم اس بھوت کا علاج نہیں کرینگے تو یہ آپ کو بار بار اس طرح پٹکتا رہے گا۔ پھر آپ اپنے دکھیارے پریوار کو کیسے سنبھالوگی......کچھ ہفتوں بعد ہی ملیریا کے تیز بخار نے ماں جی کے کمزور بدن پر حملہ کر دیا۔ کمزوری اس حد تک بڑھی کہ انہیں اپنی زندگی کی آس ہی نہ رہی۔ وہ گلابو کو کسی اچھے ٹھکانے لگانا چاہتی تھی......

اپنے پنڈت سے بولیں۔ گلابو کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے......نندو اچھا لڑکا ہے......اگر پنڈت اُن کے من کی بات سمجھ کر بولا......کنیا کو بڑا تو ہونے دیں پھر بیاہ کی سوچنا......اتنی جلدی لڑکی کا بیاہ کرنا ٹھیک نہیں......وہ بولیں......"ارے ہوتی رہے گی بڑی"......اس کے بڑے ہونے تک میں انتظار نہیں کرسکتی......میری حالت دیکھ آج ہوں کل کا بھروسہ نہیں......اس یتیم لڑکی کو در در کی ٹھوکریں کھانے سے بچالے......تیرے دو منتر اس کی زندگی سنوار دیں گے......میں تجھے کچھ غلط کام کرنے کو تو نہیں کہہ رہی۔ کنیا دان تو ہماری پرانی پرتھا ہے۔ تو بھی بیٹی والا ہے۔ میرے بعد اکیلی لڑکی کو جنسی بھیڑیئے پھاڑ کھائیں گے......شبھ کام میں دیر نہ کر......

پنڈت نے دونوں کی ذات پوچھی تو بولیں......سڑک کے کنارے پڑے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھائے بچے کی۔ اور گلابو کی طرح حالات کے ہاتھوں مارے بے نام ونشان......بچوں کی ذات کون بتا سکتا ہے۔ دونوں یتیم ہیں......یتیم......ایسے بدنصیب بچوں کی ذات ایک ہی ہوتی ہے......"یتیمی" وہ نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان......نہ برہمن ہوتا ہے اور نا ہی ڈوم......وہ تو صرف ایک بے بس لاچار بچہ ہوتا ہے۔ چھوڑ ذات پات کا جھگڑا......شبھ کام میں دیری نہ کر۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے......نہ جانے رات کے کونسے پہر شاردا مائی کا دم رُک گیا......صبح ہوتے ہی اُن کے رشتے داروں سے گھر بھر گیا......ماں جی کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اور بڑی جائیداد کی مالکن تھیں......رشتے داروں نے آتے ہی گلابو اور نندو کو گھر سے باہر نکالا......انہیں دھمکایا کہ اگر حویلی کے آس پاس بھی دکھائی دیئے تو جیل کی ہوا کھاؤ گے......

گوتم دور سے یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ فوراً گیا اور اپنے دوست اور گلابو کو اپنے گھر لے آیا۔ بولا جب تک میں اپنے گاؤں سے لوٹ کر نہ آ جاؤں تم دونوں میری کوٹھری میں رہو۔...... میں نے تمہاری نوکری کا بھی بندوبست کر دیا ہے۔

شام کو نندو جب اپنے نئے ٹھکانے پہنچا تو گلابو کو دور کھڑا دیکھ کر بولا...... میرے پاس آ۔ مجھ سے اتنی دُور کیوں کھڑی ہے۔ پہلے کی بات اور تھی ...... اب تو میری پتنی ہے...... وہ بگڑ کر بولی...... پتنی...... تیری...... تجھ سے کس نے کہا۔ نندو ہنس کر بولا۔ پنڈت جی نے...... کیا تو نے کل منتر نہیں سنے تھے...... اگر نہیں...... تو اب جان لے...... تو میری پتنی ہے۔ میری گھر والی۔ وہ تالی بجا کر ہنس کر بولی...... یہ لو...... اب میں تیری گھر والی بھی ہو گئی...... ترے پاس نہ گھر نہ دار چلا مجھے گھر والی کہنے...... یہ کوٹھری بھی تری نہیں تیرے دوست کی ہے...... وہ گاؤں سے لوٹ کر آتے ہی ہمیں یہاں سے نکال دے گا۔ نندو نے اُسے اپنے قریب کر کے کہا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ کل ہمارا بیاہ ہوا تھا۔ وہ دور ہٹ کر بولی۔ بیاہ...... تیرا ہوا ہو گا میرا نہیں ہوا۔ میں کیا جانوں بیاہ ویاہ کب ہوا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے بولی...... دیکھ نہ میرے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے اور نا ہی لال اور ہری چوڑیاں ہیں۔ اور نا ہی سر پر چم چماتی لال چندری...... نندو نے اُسے اپنی باہوں میں سمیٹا تو وہ زور سے بولی...... چھوڑ مجھے...... ورنہ میں شور مچا دونگی...... دور جا کر بولی ماں جی تو کہہ رہی تھیں تو اچھا لڑکا ہے۔ کیا اچھے لڑکے تجھ جیسے ہوتے ہیں...... وہ مسکرا کر بولا...... چل میں برا ہی سہی یہ بتا اور کیا کیا کہا تیری ماں جی نے۔ وہ دھیرے سے بولی۔ کہا تھا کبھی کسی لڑکے کے قریب نہ جانا اور نا ہی کسی لڑکے کو اپنے پاس آنے دینا...... ورنہ...... نندو ہنسا...... ورنہ کیا ہو گا میں کیا جانوں کیا ہو گا...... نندو نے اسے اپنی باہوں میں دبوچ کر اُس کا ماتھا چوم کر کہا...... یہ ہو گا......

گلابو...... اُس کی باہوں میں کسما کر بولی...... ارے پرے ہٹ۔ تیری یہ بکواس میری سمجھ میں نہیں آتی...... وہ پھر مسکرا کر بولا۔ وقت آنے دے۔ تو بھی سب سمجھ جائے گی...... میں تجھے سب سمجھا دونگا مگر ہولے ہولے۔ آج تو یہ پہلا سبق ہے۔

گو کہ یہ نادان لڑکی نندو کی بات سمجھ نہیں پائی پھر بھی اُس کے دل میں ایک عجب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ نندو کے ساتھ کا احساس۔ تنہائی کا ڈراونا احساس دل سے مٹ گیا تھا...... دل کو تسکین ملی تھی کہ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔ نندو بولا...... چل کچھ کھا لے۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ پیٹ میں

چوہے کبڈّی کھیل رہے ہیں...... وہ ہنس دی...... لے میں تیرے لئے مٹھائی لایا ہوں...... مٹھائی...... میرے لئے مجھے مٹھائی۔نہیں وچن دے کہ تو مجھے اس کوٹھری سے باہر نہیں نکالے گا...... مجھے اکیلے بہت ڈر لگتا ہے...... نہیں نکالونگا...... کبھی نہیں نکالونگا...... سچ...... اُس نے نندو کا سیدھا ہاتھ اپنے سر پھر رکھ کر کہا...... کھا بھگوان کی قسم...... نندو نے گلابو کی ڈری ڈری سہمی سہمی سی آنکھوں میں دیکھ کر کہا...... تیری قسم اب ہم دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے...... اب تو کھالے مٹھائی، نہیں کھاتی...... پہلے بتا تو میرے لئے مٹھائی کیوں لایا ہے...... وہ پھر اُس کے بہت قریب جا کر بولا...... کیونکہ تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے...... مگر تیرا یہ نام ''گلابو'' مجھے اچھا نہیں لگتا...... تجھ جیسی پیاری سی شانت لڑکی کا نام...... شانتی...... ٹھیک ہوگا...... میری شانتی...... نرم نرم مسکراہٹ کے ساتھ وہ اُسے بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً بولی۔تو نے کہا میری شانتی...... تو کس کا ہے......؟ وہ بولا...... اتنی جلدی بھول گئی...... ابھی تو بتایا تھا کہ میں تیرا پتی ہوں...... بیاہ کے بعد پتی پتنی ایک دوسرے کے ہوجاتے ہیں۔تو میری ہے اور میں تیرا ہوں...... وہ پھر بپھر گئی...... نہ ہی میرا بیاہ ہوا ہے اور نا ہی میں تیری پتنی ہوں...... نندو اس کے بھولے پن پر ہنس کر بولا...... ''میری شانتی بڑی پگلی ہے کچھ بھی نہیں سمجھتی......؟''

وقت گذرتا گیا...... نندو نے اس نادان لڑکی کو لاکھ سمجھایا وہ اُس کی کوئی بات سمجھ ہی نہ پائی، موسم بدلتے رہے۔بیلا جب اپنی سسرال سے میکے لوٹی تو اُس کی چمکتی آنکھیں اور کھلا کھلا چہرہ دیکھ کر شانتی حیران رہ گئی۔شانتی نے بیلا سے سوال کیا...... سسرال میں ایسا کیا مل گیا جو تو ہمیں بھول کر وہاں مگن ہوگئی...... بیلا کی زبانی اُس کی خوشیوں کا راز سن کر یکا یک شانتی کے دل میں ایک نئے اور انوکھے احساس نے جنم لیا جس سے وہ قطعی ناآشنا تھی...... بھینی بھینی ٹھنڈی ہوا نے اُس کے دل کی دہلیز پر دستک دی۔ٹھنڈی ہوا کے پہلے جھونکے کے ساتھ ہی پل بھر میں دل کے گلشن پر بہار اُتر آئی...... نندو کے کہے مہکتے الفاظ یاد آئے ''تو میری پتنی ہے''۔

مہندی رچے ہاتھوں کی کلائیاں لال اور ہری چوڑیوں سے بھری۔پاؤں میں پائل اور لمبی چوٹی کو پھولوں سے سجائے۔چھم چھم کرتی لال چندری اوڑھے بڑی بیقراری سے وہ نندو کی منتظر تھی۔نندو کے پاؤں کی چاپ سنتے اُس کے دل میں ایک جھنکار سی اٹھی۔پاؤں خود بخود اُس کی طرف بڑھے۔کانچ کی چوڑیوں کی چھن چھن اور پائلوں کی چھم چھم نے ایک نئی سریلی دھن چھیڑی...... نندو نے اُسے دیکھا اور

دیکھتا ہی رہ گیا۔ عالم بے خودی میں دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے...... نندو نے اپنے بازو پھیلائے اور شانتی اُس کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ دودلوں میں محبت کے چراغ جل اٹھے...... نندو نے شانتی کا ہاتھ تھاما اور مندر کی طرف دوڑا...... بھگوان کے سامنے شانتی کی مانگ سیندور سے بھر دی۔ دونوں نے مندر میں ماتھے ٹیکے...... اس بھری دنیا میں کوئی نہ تھا جو انہیں آشیرواد دیتا۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ کر اپنے بھگوان سے جو مانگنا تھا مانگا اور اپنی کٹیا لوٹ آئے......

باہر گھور اندھیرا تھا۔ رات تھی۔ وہ دونوں چپ تھے۔ بس کوٹھری میں پیار کی دھن گونج رہی تھی۔ نندو کی سوالیہ نظریں شانتی کی شوخیاں برساتی نگاہوں پر ٹکیں تو دونوں کو یوں محسوس ہوا کہ آسمان کے سارے تارے اُن کی کوٹھری میں آ گرے ہیں۔ شانتی کے ہونٹوں پر پھیلی دلفریب مسکراہٹ دل کی زبان بن بیٹھی...... جیا نچ اٹھا۔ تو میرا بلما ہے۔ میں سدا تجھے چاہونگی اور نندو...... پلکیں جھپکائے بغیر اُسے تا کے جا رہا تھا۔

محبت بھی بڑی عجیب شے ہے۔ جب نہیں ہوتی تو کس سے نہیں ہوتی۔ انسان ہر بندھن سے آزاد رہتا ہے۔ جب ہوتی ہے تو اچانک ہی لمحہ بھر میں ہو جاتی ہے۔ پھر انسان اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور ہر پل اپنے محبوب کے لئے سوچتا رہتا ہے۔ شانتی کو ہر وقت نندو کی فکر لگی رہتی تھی۔ کہیں کبھی کسی آفت میں نہ پھنس جائے...... کہیں اپنی بستی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ شراب پینا نہ سیکھ جائے......

پیسہ ہونا اور نا ہونا دونوں صورتیں انسان کے لئے باعث مصیبت ہوتی ہیں۔ جب نندو کے پاس پیسہ نہ تھا کوئی اُسے پوچھتا نہ تھا۔ اب چار پیسے کمانے لگا تو دوستوں کی بھیڑ لگ گئی...... سیدھا سادھا نندو بستی کے آوارہ لڑکوں کے بچھائے دوستی کے جال میں پھنس گیا...... وہ جانتا نہ تھا کہ پیسے کمانے کے لیے انسان طرح طرح کے گھنونے دھندے بھی کرتا ہے۔ شاردا دیوی جیسی نیک عورت کے زیر نگرانی پرورش پانے کی وجہ سے وہ باہر کی خودغرض اور لالچی گندی دنیا سے واقف نہ تھا۔ وہ اپنے نئے دوستوں کی نیچ حرکتیں دیکھ کر حیران و پریشان تھا......

چوری کے مال کا بٹوارہ کرتے دیکھ وہ خاموش نہ رہ سکا...... ''یارو جو کچھ تم کر رہے ہو ٹھیک نہیں ہے۔ اگر پکڑے گئے تو جیل جاؤ گے اور تمہارے گھر والوں کو شرمندگی اٹھانی پڑے گی...... شیامو نے قہقہہ لگایا۔ ہم...... اور جیل۔ تو بے فکر رہ ہم جیل کبھی نہیں جائیں گے...... اگر ہم جیل گئے تو پولس والوں کے یہ

اُلٹے۔ پلٹے دھندے کون چلائے گا...... ہمارا جیل کے باہر رہنا ان لوگوں کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔ اور اس مال پر مالکوں سے زیادہ ہمارا حق ہے...... اُن کی فیکٹریوں۔ ملوں اور دکانوں میں ہمارے غریب بھائی بندھوہی کام کرتے ہیں اور مال مالک جمع کر کے اپنی تجوریوں میں رکھتے ہیں...... ہماری عورتوں کے تن پر کپڑے نہیں اور اُن کی عورتیں سونے اور جواہرات کے زیوروں سے ڈھکی ہوئی ہیں ہوٹلوں میں کھانا ہمارے بچے پکاتے ہیں اور کھاتے مالداروں کے بچے ہیں۔ ڈاکٹر۔ وکیل۔ یہاں تک کہ اسکولوں کے ٹیچر بھی دونوں ہاتھوں سے مال اکٹھا کر رہے ہیں...... دیس کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہی کونسے پارسا ہیں۔ دیس کو لوٹ رہے ہیں۔ چوری۔ رشوت اور بے ایمانی کا بول بالا ہے۔ وہ لوگ اپنے بینک بھر رہے ہیں۔ زمین خرید رہے ہیں۔ بڑے بڑے مکان بنا رہے ہیں۔ خود تو کھا ہی رہے ہیں اپنے خاندان کے ہر بشر کو بھی مالا مال کر رہے ہیں۔ ان کی نظریں ہم جیسے غریب بے روزگاروں پر نہیں پڑتیں...... یہ ہمیشہ یاد رکھنا سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ تو کیا سوچتا ہے ہمیں یہ سب کرنا اچھا لگتا ہے۔ نہیں...... یار...... ہم بھی انسان ہیں...... مجبوراً ہمیں یہ کرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنے گھر والوں اور بستی کے بوڑھے اور بچوں کو بھوکے مرتے تو نہیں دیکھ سکتے...... ہم ان پڑھ گنوار ساری جوانی رکشا چلاتے ہیں۔ ٹھیلا کھینچتے ہیں، مشکل سے مشکل کام ہم کرتے ہیں اور جب محنت کر کر کے ہڈی ہڈی رہ جاتے ہیں تو سرکار کے چلانے والے ہماری کوئی مدد نہیں کرتے...... ہمیں پارسائی نہ سکھا اور یہ بھی جان لے کہ منہ کھولنے والے کی زبان ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیتے ہیں۔ نندو اُن کی خوفزدہ باتیں سن کر سہم گیا...... وہ ان لوگوں سے دُور رہنا چاہتا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُسے شانتی کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ ایک بار انسان بری سنگت اور صحبت میں پڑ جاتے پھر اُن سے چھٹکارا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ تو بستی کے آوارہ لڑکوں سے دُور ہی رہنا......

اس رات نندو نے پہلی بار دارو پی اور اتنی پی کہ اپنے ہوش حواس کھو بیٹا...... شانتی کا دن کام کرتے کرتے ہی بیتا...... تھکی ہاری اپنی کوٹھری پہنچی تو نندو کو کوٹھری میں نا پا کر پریشاں ہوگئی اُسے ایک دم اڈے کا خیال آیا...... مگر شانتی نے اڈے جانے سے گریز کیا۔ غم کے اندھیروں میں ڈوبی سوچتی رہی۔ میں اور نندو دونوں ہی یتیم ہیں مگر دونوں کے حالات بالکل فرق فرق ہیں مجھے کچھ سال تو اپنوں کا ساتھ نصیب ہوا تھا...... اپنی ماں کی ممتا کی مٹھاس کا مزہ تو چکھا۔ باپ کے شفیق ہاتھوں کا سایہ میرے سر پر تھا...... آج بھی ان سے ملنے کی آرزو میں تڑپ رہی ہوں۔ ان دونوں کو بھی ہر پل میری یاد ستاتی ہوگی۔ انہیں بھی میرا انتظار

ہوگا۔ وہ بھی مجھ سے ملنے کے لئے تڑپ رہے ہوں گے۔ مگر نندو کے بھاری غم کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ جس کی ماں ہی اپنے لختِ جگر کو مرنے کے لئے کوڑے کے ڈھیر پر چھوڑ جائے اس سے زیادہ بدنصیب اور منحوس بچہ اور کون ہوسکتا ہے۔ جس بچے کو ماں کی ممتا اور باپ کا پیار نہ ملے اس کے دل کے سارے خانے خالی رہ جاتے ہیں۔ اس کے دل میں پیار کے نرم اور نازک جذبے کا جنم ہی نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں نہ ہی کسی سے پیار۔ نہ آرزو نہ امید اور نہ ہی کسی قسم کی تڑپ ہوتی ہے اور نا ہی اُس کی کوئی منزل ہوتی ہے۔ انہیں سوچوں میں غم سے بھری ادھورے سپنوں کی رات ڈھلتی چلی گئی......

نندو خود چل کر گھر نہیں لوٹا اُسے اٹھا کر لایا گیا تھا...... جب اُس کے ذرا ہوش سنبھلے تو شانتی اُسے سمجھانے بیٹھ گئی...... دیکھ نندو۔ ہم دونوں یتیم ہیں اور بہت غریب بھی۔ یقین کر اگر تجھے کچھ ہوگیا تو میری زندگی میں کچھ بھی نہ رہ جائے گا۔ اکیلی میں اس آنے والے بچے کی پرورش کیسے کرونگی...... ہم دونوں نوکری کریں گے تب ہی تو مل کر اس بچے کو اچھی تعلیم دے سکیں گے۔ وہ بھی ذرا ذرا جلا کٹا ہونے لگا......

وہ بولا...... ''یتیم ہیں'' ...... مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ تو آج بھی اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے تڑپتی ہے۔ انہیں یاد کرتی ہے۔ اس امید پر جی رہی ہے کہ ایک دن تو اُن سے ملے گی...... میں کس امید پر جیوں...... میں اُس سنگدل ماں کا بیٹا ہوں جس نے اپنے بیٹے کو کوڑے کے ڈھیر پر مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ کبھی سنا تھا ایسا۔ نہیں نا۔...... کون ماں اپنے آرام اور خوشیوں کے لئے اپنے بچے کو چھوڑ دیتی ہے...... تیرا یقین کرلوں...... عورت کا...... کبھی نہیں...... ہرگز نہیں۔ اگر ایک ماں اپنے بچے کو پھینک کر جی سکتی ہے تو تو بھی جی لے گی...... اور اگر جینا مشکل ہو جائے تو تو بھی اپنے بچے کو کوڑے پر پھینک دینا...... میری ماں کی طرح...... کسی کو رحم آئے گا تو اُسے اٹھا کر پال لے گا۔ جیسے میں پل گیا۔ دوسروں کے رحم و کرم پر۔ دوسروں کے ٹکڑوں پر۔......

نہیں ...... نندو ...... نہیں ...... ہم دونوں مل کر اپنا بچہ پالیں گے...... اُس کو پڑھائیں گے۔ انسان بنائیں گے...... تاکہ سماج میں عزت سے جی سکیں...... ہماری طرح بستی میں رہنے والے نالی کا کیڑا نہ کہلائیں۔ کسی کے ٹکڑوں پر نہ پلیں۔ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔ اور ہمارے جیسے نیچے سطح کے لوگوں کا سہارا بن سکیں...... شانتی بھی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی وہ بولے ہی گئی۔......

وہ بولا...... کون سا سماج...... کس کا سماج۔ کیا تو نے اس بستی میں مجھ جیسا دوسرا دیکھا ہے......

نہیں...... نا...... میں سب سے فرق ہوں۔ میرا اپنا الگ ایک سماج ہے۔ لاوارث۔ محتاج...... لاچار...... تو سب ہی یتیم بچے ہوتے ہیں مگر...... مجھ جیسا...... بس میں یہ ہوں۔ کاش میں پیدا ہی نہیں ہوا ہوتا۔ کاش وہ دونوں مجھے گلا گھونٹ کر مار ڈالتے تو مجھے یہ حقیر اور ذلیل زندگی تو نہ جینی پڑتی، خود اپنے آپ سے شرمندہ تو نہ ہونا پڑتا۔ جب بھی کوئی اپنی ماں کو پیار سے یاد کرتا ہے میرے دل کے زخموں کے منھ کھل جاتے ہیں۔ بڑا درد ہوتا ہے۔ دل سنبھالے نہیں سنبھلتا...... کوئی بھی میرے اس درد کی شدت کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ کوئی مجھ جیسا لعنتی اور بدقسمت نہیں۔ تو بھی غیروں کے سہارے پلی...... تو بھی میرا دکھ محسوس نہیں کر سکتی...... شانتی...... پینے دے مجھے...... مجھے نہ روک کیونکہ یہ شراب ہی میرے درد کی دوا ہے...... آج برسوں بعد مجھے کچھ دیر کے لئے چین ملا تھا...... انسان جب اپنے پورے ہوش وحواس میں نہیں ہوتا تب ہی وہ اپنی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھلا پاتا ہے...... کیونکہ بے ہوشی کے عالم میں وہ سچ اور جھوٹ میں فرق نہیں کر پاتا...... وہ بولتا گیا اور شانتی کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ سوچتی رہی اس کی ماں نے اس کے دل وجگر ہی نہیں اس کی روح تک مجروح کر دی ہے۔ آگے کیا ہوگا۔ کیسے کٹے گی زندگی۔ شانتی کی راہوں میں آگ برستی رہی اور زندگی آگے بڑھتی گئی۔ وہ نندو کے خودغرض رویے سے بے حد دلبرداشتہ تھی۔ دل شکایتوں سے بھرا تھا مگر زبان نہ کھول سکی۔ دماغ میں خوابوں کے گھروندے بنتے رہے بگڑتے رہے اور اُس کے ماں بننے کا وقت قریب آتا گیا......

سویرے بامشکل تمام اٹھی...... چلنا دشوار تھا مگر گرتی پڑتی کام کرنے پہنچ ہی گئی...... مالکن نے اُس کی حالت دیکھتے ہی کہا ''تو گھر جا کر آرام کر اس حالت میں تجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ شانتی کراہ کر بولی...... ماں جی بھگوان نے میرے نصیب میں دنیا بھر کے غم لکھے ہیں۔ آرام نہیں۔ جب تک ہمت ہے۔ اور یہ دونوں ہاتھ سلامت ہیں میں کام کرونگی...... اُس نے اپنی دکھتی کمر پر ہاتھ پھیرا...... مالکن نے اُسے روپے تھماتے ہوئے کہا لے رکھ لے۔ اور ضرورت ہو تو بغیر کسی جھجھک کے میرے پاس آجانا۔ تو برسوں سے بیٹی کی طرح ہماری سیوا کر رہی ہے اب مجھے بھی ماں کا حق ادا کرنا ہوگا۔ جب تک تو نہیں آئے گی میں سنبھال لونگی...... ''ماں'' لفظ سنتے ہی شانتی کے اندر خوشی کا سوتا پھوٹ پڑا...... بولی...... ماں جی سچ کہتی ہوں آج مجھے اپنی ماں کی بہت یاد آرہی تھی۔ آج آپ نے مجھے بیٹی کہا۔ میری طاقت اور ہمت اور بڑھ گئی۔ لگا میں گھنی چھاؤں تلے کھڑی ہوں...... ''ماں'' اس ایک پیارے لفظ نے میرے دکھ کم کر دیئے

ہیں۔......

شانتی ہولے ہولے نکل پڑی۔ پیڑ تلے جوان لڑکے ہنسی مذاق کررہے تھے۔ راہ چلتی لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ شانتی کو دیکھتے ہی ایک لڑکا اُس کی طرف لپکا۔ دوسرا چلایا...... اُسے ہاتھ نہ لگانا۔ وہ نندو کی گھروالی ہے۔ تیسرا بولا...... وہ نندو کی عورت ہے تیری تو نہیں...... سنتے ہی شانتی پلٹی اور اپنے گھر کی طرف دوڑی...... سوچنے لگی مرد جیسا بھی ہو۔ اچھا یا برا عورت کے سر پر شوہر کا سایہ ہی سب سے ضروری ہے۔ دوسرے دن جب نندو کو ہوش آیا تو جے رام نے اُسے سارا قصہ سنایا اور بولا۔ اتنی نہ پیا کرکہ ہوش ہی نہ رہے...... کل تو اپنی بیوی تک کو نہیں پہچان سکا تھا۔ نندو بولا۔ پیتا ہی ہوش کھونے کے لیے ہوں۔ اٹھا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف دوڑا...... یہ سوچتا ہوا آج تو وہ میری خوب خبر لے گی......

کوٹھری کے باہر سڑک پر بیٹھے راموچاچا اُسے دیکھتے ہی چلائے۔ تو باپ تو بن گیا اب باپ کی ذمے داریاں اٹھانا بھی سیکھ...... اتنی شراب پیئے گا تو اپنے دونوں بیٹوں کو کیسے پالے گا۔ دو بیٹے میرے...... نندو نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور کوٹھری میں گھس گیا......

دونوں چاند صورتوں کو دیکھ کر شانتی کے قریب اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا...... تو نے مجھے دو بیٹے دیئے اور میں نے تجھے دُکھوں کے سوائے کچھ بھی نہ دیا۔ تیرے سب سے کٹھن سمے پر بھی میں تیرا ساتھ نہ دے سکا...... اُس کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو دیکھ کر شانتی سمجھ نہ سکی کہ وہ خوشی کے آنسو تھے یا پچھتاوے کے۔ عورت کا پیار بھی عجیب ہوتا ہے پل میں اپنے شوہر کی ہر غلطی معاف کر دیتی ہے۔ بولی میں نے تجھے دو بیٹے دیئے تو مجھے دو وچن دے...... یہ کہ شراب اور سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور دوسرا تو ان برے لڑکوں کی سنگت چھوڑ دے گا ان دونوں بچوں کی خاطر۔ پھر سوچنے لگی اس نے پہلے ہی میری کب سنی ہے جواب سنے گا۔ شاید اپنے بچوں کی خاطر سنبھل جائے گا۔ بچہ رونے لگا اور بات ادھوری ہی رہ گئی...... سچ تو یہ تھا کہ شانتی اپنی اس نئی نرالی دنیا میں اتنی زیادہ خوش تھی کہ وہ پچھلے کے سارے دکھ سارے درد بھول گئی تھی۔

شانتی کی بات نندو کی عقل میں آگئی...... وہ اپنے ساتھیوں سے کترانے لگا اور اپنے پریوار میں مگن ہوگیا۔ ایک دن نل پر پانی بھر رہا تھا...... دوستوں نے اُسے دیکھا اور اُس کے پاس آکر بولے۔ جب سے دو بیٹوں کا باپ بنا ہے تیرے بھاؤ بڑھ گئے ہیں...... ہم سب کو بھول گیا۔ چل آج ہم سب مل کر تیرے

ڈبل باپ بننے کا جشن منائیں گے...... نندو نے انکار کیا۔نہیں یار...... وہ دو بچے کیسے سنبھالے گی۔چندو
ہنسا...... جیسے سب عورتیں سنبھالتی ہیں...... تیری مہارانی بھی سنبھال لے گی...... باپ بنتے ہی تو اپنی لگائی کا
غلام بن گیا...... یاد رکھ مرد حاکم ہوتا ہے حاکم چل...... اور سب اڈے کی طرف چل پڑے......

نشے میں جھومتا لڑکھڑا تا ہاتھ میں سلگتا سگریٹ لئے نندو کوٹھری میں داخل ہوا تو شانتی
چلائی۔کیوں اپنی چھاتی پھونک رہا ہے۔بچہ بچہ جانتا ہے کہ دارو اور سگریٹ دونوں بری بلائیں ہیں ایک تو
ہی کند ذہن ہے جو نہیں سمجھتا...... یہ دونوں تیرے بدن کو گھن کی طرح کھوکھلا کر دیں گی۔اُس بلا کا سامنا
کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے...... تو تو کہہ رہا تھا تجھے مجھسے اور اپنے بچوں سے بہت پیار ہے۔اپنے
بچوں کی خاطر۔چھوڑ دے...... اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھ...... اپنے اندر ہمت۔حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا
کر...... کب تک اپنے دل کو جلاتا رہے گا۔ہم دونوں نے محتاجی اور غریبی کی انتہا دیکھی ہے۔تو اچھی طرح
جانتا ہے محتاجی اور غریبی دونوں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔اگر تو نہ بدلا تو تیرے بچوں کا حال بھی وہی ہوگا جو
ہمارا تھا۔شانتی بولتی رہی اور نندو گہری نیند میں سو گیا اور شانتی کا افسردہ دل رو پڑا......

رام نرم مزاج اور فرمانبردار تھا اور شیام اس سے بالکل مختلف، بیحد ضدی اور کڑک مزاج......
بات بات پر ہنگامہ برپا کر دیتا...... بستی کے بچوں سے لڑتا جھگڑتا اور غصے میں بے قابو ہو کر مار دھاڑ شروع
کر دیتا...... جب اسکول سے بھی یہی رپورٹ آئی تو شانتی گھبرائی...... ہاتھ جوڑ کر ماسٹر جی سے بولی
میں نے اسے مارا پیٹا مگر کسی حال اسے سدھار نہ سکی...... پڑھی لکھی ہوتی تو شاید کچھ کر پاتی...... آپ تو گیانی
دھیانی ہو۔آپ ہی میرے ضدی بیٹے کو اچھی راہ پر لا سکتے ہو...... ماسٹر جی شانتی سے بولے...... تم پہلی ماں
ہو جو اپنے بیٹے کو سدھارنے کی بات کر رہی ہو...... میں ضرور کوشش کرونگا...... اگر بستی کے لڑکے پڑھ لکھ کر
سدھر جائیں۔تو یہ روز روز کے ہنگامے بند ہو جائیں...... بے روزگار نوجوان لڑکوں کو ہر انسان سے شکایت
ہے۔خود کچھ کر کے پیسے نہیں کمانا چاہتے۔پھر اداس ہو کر بولے...... لڑکے بھی کیا کریں روزگار ہی نہیں
ہے۔معلوم نہیں کس کو دوش دوں...... لڑکوں کو یا سرکار کو...... انہوں نے قدرے مایوس اور ناگواری سے
کہا......

اُن دنوں کے لوگوں کا خیال تھا کہ شریر بچوں کو ہنٹر ہی سدھار سکتا ہے مگر ماسٹر جی اس کے خلاف
تھے۔انہوں نے شیام کو پیار سے سمجھایا...... شیام میں تھوڑا سا بدلاؤ تو آیا مگر جب غصہ آجاتا وہ قابو سے باہر

ہی ہو جاتا اور مار پیٹ شروع کر دیتا تھا...... شراب کے نشے میں باپ کے ہاتھوں بیٹے کو پٹتے دیکھا تھا...... وہ اپنے زور کے بل پر جینا چاہتا تھا...... کسی سے دب کر بھی کوئی جینا ہوتا ہے۔ رام سارے امتحان پاس کرتا گیا اور شیام نے اپنی ضد نہ چھوڑی...... یہاں تک کہ ماسٹر جی کو ہنٹر بھی اٹھانا پڑا......

شام ہو چلی تھی...... نندو گھر لوٹ رہا تھا۔ راجو نے اُسے روکا۔ تب ہی اور دوست بھی آ گئے۔ راجو بولا کل کلب میں سیٹھ جی کی بیٹی کے جنم دن کا جشن منایا گیا تھا۔ رمیش بولا یہ دولتمند بڑا جشن کیسے مناتے ہیں...... راجو بولا...... ارے یاران دولتمندوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ہماری طرح دارو نہیں انگلش شراب پیتے ہیں۔ جیسے مداری کے اشاروں پر بندریا ناچتی ہے یہ لوگ بھی ایک دوسرے کے اشاروں پر گول گول ناچتے ہیں...... مل کر خوب جوا بھی کھیلتے ہیں...... عورتیں اتنا زیادہ پیتی ہیں کہ دیکھ کر مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگی تھی...... ہماری میڈم نے تو اتنی ہی پی کہ ہوش ہی کھو بیٹھیں...... انہیں اٹھا کر موٹر میں ڈالنا پڑا...... جانتے ہو کیوں زیادہ پی لی تھی...... کیونکہ وہ ایک بڑی رقم جوئے میں ہار گئی تھیں...... یہ لوگ تو اور بھی بہت کچھ کلب میں کرتے ہیں۔ وہ آج نہیں پھر بتاؤں گا......

مہیش نے سوال کیا یار یہ کلب کیا ہوتا ہے۔ راجو ہنس کر بولا...... انگریزی شراب خانہ۔ ہم دیسی ٹھرا پیتے ہیں۔ جہاں دارو پیتے ہیں وہ جگہ اڈا کہلاتی ہے مال والے لوگ جہاں ناچتے گاتے جوا کھیلتے اور شراب پیتے ہیں وہ جگہ کلب کہلاتی ہے...... عورتوں کے اشاروں پر مردوں کو یوں مستی سے جھومتے ناچتے دیکھ میں تو دنگ ہی رہ گیا تھا۔ سوچتا رہا اس قسم کے لوگ ہمارے اس وشال دیش کو کیا سنبھالیں گے...... یہ لوگ بھی وہی سب کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں پھر بھی یہ انسان اور ہم جانور سمجھے جاتے ہیں...... پولس والے شرابیوں...... جواریوں کی تلاش میں بستی میں دندناتے پھرتے ہیں ان لوگوں کو کیوں نہیں گرفتار کرتے...... دیس کے کلچر کا ستیاناس یہ کر رہے ہیں اور دیس کی بربادی کا الزام ہماری جہالت اور غربت کو دیتے ہیں۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں ہم ان پڑھ اور جاہل کیوں ہیں...... کیوں ہم بے روزگار ہیں۔ کیوں ہم کیڑوں کی طرح اس گندی بستی میں رہتے ہیں۔ کیوں ہمارے دیس کے 50 فیصد لوگ روزانہ بھوکے پیٹ سوتے ہیں۔ دیس کے رکھوالوں کی نظریں لاچار...... بے بس...... مزدوروں اور کسانوں پر کیوں نہیں پڑتیں......

چھوڑ یار کیوں ناحق اپنا دل جلا رہا ہے۔ تیرے اس ''کیوں'' کا جواب دینے والے سارے

لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مست ہیں۔ان کے پاس ہم جیسے غریبوں کے سوالوں کا جواب دینے کے لئے وقت ہے نہیں...... تیرے اس ''کیوں'' کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے۔ کیونکہ دیس میں گاندھی جی اور لال بہادر شاستری جیسے وطن پر قربان ہو جانے والے لوگ اب نہیں رہے...... آج کے وطن پرست لوگ وطن کا کم اپنا فائدہ زیادہ دیکھتے ہیں کیلاش بولا...... یارو عورتوں کے ساتھ ناچنے کا مزہ تو ہم لوٹ نہیں سکتے۔ کم سے کم پریوں کو ناچتے دیکھ کر خوش تو ہو سکتے ہیں...... ہیرا بائی ہیروں کی طرح چمکتی۔ دمکتی پریاں چھن چھن کرا کٹھا کرتی ہیں دکھ تو یہ ہے کہ ہم اُن پریوں کو چھو بھی نہیں سکتے بس دیکھ سکتے ہیں......بس مالدار ہی انہیں چھو سکتے ہیں۔ یار بھگوان نے بھی ساری خوشیاں اُن ہی کے کھاتے میں ڈال دی ہیں۔......

نندو جانا نہیں چاہتا تھا۔فوراً بہانہ ڈھونڈ ھا...... سنا ہے کل ہی ہیرا بائی کے کوٹھے پر پولس نے چھاپا مارا۔ کچھ شہر کی پڑھی لکھی لڑکیاں بھی پکڑی گئی ہیں۔ میں نہیں جاؤنگا...... کیلاش بولا۔ گرفتاری کل ہوئی ہے آج پولس کہیں اور چھاپا مارے گی...... انہیں بھی تو اپنی جیبیں بھرنی ہیں......

نندو بولا...... یارو آج مجھے معاف کرو...... آج میری جیب خالی ہے...... کیلاش نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اُٹھایا بولا...... جب تک تو سادھو بنا رہے گا تیری جیب خالی ہی رہے گی...... سیکھ...... جیب بھرنے کا گر...... اپنے دیس کے نگہبانوں۔ باغبانوں اور منتریوں سے سیکھ...... جنتا کا پیسہ مار کر اپنے اپنے خزانے بھر رہے ہیں۔انہیں نہ دیس کی فکر نا غریب جنتا کی۔ہم اُن کے نقب لگاتے ہیں تو کونسا گناہ کرتے ہیں۔اب چلو بھی پریوں کے دیس نہ سہی اپنے کلب ہی چلو...... دو چار گھونٹ پی لو تو دن بھر کی تھکن دور ہو۔سب نے اڈے کا رُخ کیا......

پو پھٹنے سے ذرا پہلے جھومتا لڑکھڑاتا نندو گھر پہنچا تو شانتی پھٹ پڑی...... نہ ترے آنے کا کوئی وقت ہے نا جانے کا...... جلدی لوٹ آیا کر...... میرا دل ہولتا رہے ہے۔ دیکھ ایک پل کو آنکھ نہیں جھپکی......

جا سو پڑ...... سو بار کہہ چکا ہوں میرا انتظار نہ کیا کر...... اور میں کہتی ہوں تو اپنے ان آوارہ لوگوں کا ساتھ چھوڑ دے...... اگر تجھ پر کوئی آفت آن پڑی تو تیرے یہ جگری دوست تجھے چھوڑ کر چل دیں گے...... کوئی تیرا ساتھ نہیں دے گا......

نندو بڑی دھیمی آواز میں بولا۔'' میرے ماں باپ کی طرح''...... بے حد درد بھری آواز میں......ان دونوں نے مجھے اس گھڑی چھوڑا جب مجھے ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی...... تو نے تو اپنی

ماں کا دودھ پیا ہے نا ماں کی چھاتی سے بہتے دودھ پر صرف اُس کے بچے کا حق ہوتا ہے۔ باپ کی محبت پر اُس کی اولاد کا حق ہوتا ہے۔ اُن دونوں ظالموں نے مل کر مجھ سے میرا قیمتی خزانہ چھین لیا جس پر صرف اور صرف میرا حق تھا...... پھر غیروں سے میں کیا امید رکھوں۔ جسے اپنے ٹھکرا دیتے ہیں وہ بدنصیب لوگ زندگی بھر دوسروں کی ٹھوکروں میں رولتے ہی رہتے ہیں...... جس پل یتیم خانے میں مجھے اپنی اس کڑوی حقیقت کا پتا چلا اُسی پل میری زندگی کے سارے دیئے بجھ گئے...... میرے اندر باہر گھور اندھیرا چھا گیا جو آج تک مجھے گھیرے ہوئے ہے اور ہمیشہ گھیرے رہے گا۔ خود میں اپنی اندھیری راہوں میں دیئے کیسے جلاؤں بنا تیل اور پانی کے...... میں تو یتیم خانے میں بھی سب سے حقیر اور نیچا سمجھا جاتا تھا۔ میں کسی سماج میں فٹ نہیں ہوسکتا...... سچ تو یہ ہے کہ میں اس دنیا میں رہنے کے لئے ان فٹ ہوں میں تو اُس کوڑے کے ڈھیر پر ہی مر جاتا تو بہتر ہوتا......

شانتی بولی...... کب تک یوں دُکھ اٹھاتا رہے گا...... وہ بولا...... اپنی آخری سانس تک......

نندو...... بھولنے کی کوشش کر...... میں اور تیرے دونوں بچے تجھے پیار کرتے ہیں...... ہماری خاطر......

پیار...... دنیا میں پیار جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا پیار کیا ہوتا ہے۔ سنا ہے ماں کا پیار سچا ہوتا ہے۔ ماں کے پیار میں کھوٹ نہیں ہوتا...... پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا...... میری ہی ماں نے مجھے زہر کیوں دیا۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا اپنے ہی کندھوں پر اپنی لاش کو ڈھونا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں تو اس دنیا کو چھوڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں کہ کسی طرح اس درد سے نجات تو ملے...... میرے زخموں کی ٹیس کوئی نہیں محسوس کرسکتا...... تو بھی نہیں...... کہ یہ زہر تو صرف میں نے پیا ہے۔ مت کرید میرے ان زخموں کو جو میں نے اپنے دل کے تہہ خانے میں دفن کر رکھے ہیں...... درد کی شدت سے اگر یہ آبلے پھوٹ پڑے تو دنیا والوں کی نظروں میں میرے بچے بھی لعنتی کہلائیں گے...... میری طرح۔ اپنے باپ کی طرح تو ہی بتا ان سب لفنگوں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں...... کم سے کم کوئی تو ہے جو مجھ سے ہنس کر بات تو کر لیتا ہے وہ مجھے حقیر اور نیچ نہیں سمجھتے...... شانتی آگے کچھ نہ کہہ سکی دھیرے سے بولی جلدی لوٹ آیا کر تیرے جانے اور آنے تک مجھے ایک صدی کا فاصلہ لگے ہے......

نندو سو گیا اور شانتی سوچتی رہی...... قد و قامت۔ رنگ روپ۔ چال ڈھال سے تو کسی بڑے گھر کا ہی لگتا ہے۔ اس جیسا سندر دوسرا نہیں...... کیا مجبوری تھی اس کی ماں کی جو اپنے نور نظر کو اپنے سے الگ

کردیا...... شاید کسی پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ شاید وہ غریب ہو میری طرح اور وہ غریب لڑکی حویلی کے کسی مرد کی ہوس کا شکار بن گئی ہو۔ کوٹھے پر لڑکوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ وہاں تو لڑکیاں پالی جاتی ہیں۔ شاید کسی مجبور ناچنے والی کا بیٹا ہو۔ اسے تو اپنی جڑوں کی بھی خبر نہیں...... شاید نندو بھی ان ہی سوالوں کا جواب مانگتا ہو......

وہ انہیں سوچوں میں الجھی ہوئی تھی...... کملا کی آواز پر چونکی تھی...... چل شانتی مالکن انتظار کر رہی ہونگی......

ماسٹر جی سے ملنے کے بعد شانتی بہت اُداس تھی۔ جیسے ہی شیام اسکول سے لوٹا۔ وہ اُسے سمجھانے بیٹھ گئی۔ تو ماسٹر جی کی بات کیوں نہیں سنتا۔ نافرمانی کرتا ہے۔ ماسٹر جی تجھے مارتے ہیں چوٹ میرے دل پر لگتی ہے۔ میرے لال تو غصہ کرنا چھوڑ دے۔ غصہ کرنے سے انسان کو جسمانی نقصان سے زیادہ ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔ میں دن رات محنت کرتی ہوں تا کہ میرے دونوں بیٹے پڑھ لکھ کر کسی سرکاری دفتر میں کام کریں...... مزدوری کریں...... کسی کی غلامی نہ کریں...... جب تم دونوں کمانے لگو گے میں اس بستی سے دور ایک چھوٹا سا پکا مکان تیرے اور رام کے لئے بناؤنگی تا کہ تمہارے بچے بستی کے کیڑے نہ کہلائیں۔ تو دل لگا کر پڑھے گا تب ہی تو تیری ماں کے سپنے پورے ہونگے...... آج اپنی ماں سے وعدہ کر کہ آئندہ تو غصہ نہیں کرے گا...... دل لگا کر پڑھے گا۔

ایک دن وہ گھر پہنچی تو شیام کو سوتا دیکھ بری طرح گھبرا گئی...... سوچا بخار ہوگا۔ اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو شیام زور سے چیخا...... ماسٹر سے تو میں نمٹ ہی لونگا مگر گنگو کو بھی دیکھ لونگا...... شانتی کی سانس اٹک کر رہ گئی...... تب ہی رام بھی آ گیا...... شانتی نے رام سے سوال کیا...... ایسا کیا ہوا آج جو یہ اتنا بگڑ رہا ہے...... ''رام غصہ بھری آواز میں بولا۔ آج اس نے گنگو کو مار مار کر لہولہان کر دیا...... اُس کا گلا دبوچ رہا تھا...... یہ تو خیر ہوئی ماسٹر جی نے دیکھ لیا۔ انہوں نے گنگو کو بچایا ماسٹر جی نہ ہوتے تو آج غضب ہو جاتا...... گنگو جان سے جاتا اور تمہارا بیٹا جیل جاتا...... ماسٹر جی نے اسے اسکول سے نکال دیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ شیام اور لڑکوں کے لئے برا نمونہ ہے...... غصہ میں آ کر یہ کسی کی جان بھی لے سکتا ہے۔

شیام نے فوراً اپنی صفائی دی...... ماسٹر جی نے مجھے مارا مرغا بنایا۔ کڑی سے کڑی سزائیں دیں۔ میرے کان کھینچے میں نے سب سہہ لیا مگر اُن کا یہ رویہ دیکھ کر سارے لڑکے میرا مذاق بنانے لگے۔ گنگو جیسے چور لڑکے نے مجھے بدمعاش کہا...... وہ چوری کرتے پکڑا گیا۔ ماسٹر جی نے اُسے نہیں مارا۔ گنگو نے مجھے بدمعاش کہا۔ مجھے دھکا دیا۔ اماں اُس نے مجھے پہلے مارا۔ کیا اپنے آپ کو بچانا اور اپنے

حق کے لئے لڑنا جرم ہے۔ کیوں۔ ماسٹر جی نے گنگو کو سزا نہیں دی لیکن مجھے مارا...... گنگو نے مجھے گالیاں دیں تو میرا دماغ گھوم گیا میں بے قصور ہوں...... آس کے سارے پنچھی پنکھ پھڑ پھڑا کر اڑے گئے اور ایک مجبور ماں کی سالوں کی آرزوؤں اور خواہشات کی موت ہوگئی...... شانتی کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی مگر دُکھ کی شدت کی وجہ سے زبان نہ ہلی...... پھٹی پھٹی آنکھوں سے پاس رکھی اپنے بھگوان کی تصویر کو دیکھے گئی......

بہت دیر بعد بولی۔ ''میں ہار گئی'' بھگوان کچھ تو میرے درد کی دوا کردے سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔

بادل گرجتے رہے۔ بجلی کڑکتی رہی...... دکھوں کی بارش ہوتی رہی۔ شانتی کی زندگی کا غذی کی نیا ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی گئی۔ ناکامی اور ناامیدی بُری بلائیں ہیں۔ شانتی اپنی ساری کوششوں کے باوجود نہ نندو کو بدل سکی اور نہیں اپنے بیٹے کو سیدھی راہ پر لا سکی...... وہ بے حد فکرمند تھی...... اُس کے سارے سپنے پاش پاش ہو چکے تھے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ سیاہ کالے بادلوں میں گھری کسی طرح بس جی رہی تھی...... اندھیرے میں ایک تارہ چمکا۔ رام کو سرکاری دفتر میں نوکری مل گئی۔ شانتی کے مردہ دل میں آس کا دیا جل اٹھا...... تب ہی رادھا نے اُسے اپنے مشورے سے نوازا۔ کیوں پریشان ہے تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔ دونوں کی شادی کردے۔ تیرا چھوٹا بیٹا نہیں پڑھا تو کیا ہوا۔ انسان کے پاس علم نہ بھی ہو اچھے دوست اور اچھی صحت ہو تو زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ پڑھتے تو دھن والوں کے بچے ہیں۔ ہم مزدور ہیں اور ہمیشہ مزدوری ہی کریں گے۔ ہمارے مقدر میں غلامی لکھی ہے۔ تو سپنے دیکھنا چھوڑ دے۔ سپنے کبھی سچے نہیں ہوتے۔ تیری قسمت بھلی ہے کم سے کم رام تو پڑھ لیا...... بہو آئے گی تو شیام بھی محنت مزدوری کرنے کی سوچے گا...... شانتی گہری سوچ میں پڑ گئی...... شادی۔ شیام کی...... ایک معصوم لڑکی کی بربادی...... نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتی......

آدھی رات بیت چکی تھی...... وہ روز کی طرح نندو اور شیام کا انتظار کر رہی تھی۔ شیام کے ساتھ لڑکی کو آتے دیکھ شانتی کے ہوش اڑ گئے۔ بولا۔ اماں میں نے سب سے بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ لڑکی تھی کہ چاند کا ٹکڑا۔ شانتی اُسے گھور کر بولی...... کون ہے یہ لڑکی...... کیا بکواس کر رہا ہے تو ہوش میں آ۔ لڑکی بھگانے کے جرم میں جیل جائے گا...... ارے کچھ تو بول...... وہ کچھ نہ بولا تو شانتی لڑکی سے بولی...... کہاں کی رہنے والی ہے۔ اٹھ میرے ساتھ چل۔ اس سے پہلے کہ تیرا باپ پولس والوں کے ساتھ تجھے ڈھونڈھنے یہاں آئے میں تجھے تیرے گھر چھوڑ آؤں۔ لڑکی بولی یہ مجھے بھگا کر نہیں لایا میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ بھاگ

کر آئی ہوں۔شیام سے سوال کیا اس کا باپ کہاں رہتا ہے۔اتہ پتہ بتا تا کہ اُجالا ہونے سے پہلے میں اسے واپس اس کے گھر چھوڑ آؤں۔ یہ لڑکی یہاں نہیں رہ سکتی...... تو جانتا ہے دن رات بستی میں پولس دندناتی رہتی ہے...... یہ لڑکی ہم سب کو جیل پہنچا دیگی...... لڑکی بولی...... اماں میں یتیم ہوں۔میرا کوئی گھر نہیں...... میں جس بستی سے آئی ہوں وہاں کسی لڑکی کا باپ نہیں ہوتا...... کسی عورت کا شوہر نہیں ہوتا۔اس بستی میں صرف بن بیاہی مائیں رہتی ہیں...... وہاں کے بچے باپ کے نہیں ماں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ تیسرے بیٹے نے مجھے گلابو بائی کے کوٹھے سے رہائی دلوائی ہے...... شانتی چیخی...... ارے بے شرم...... اب تیرے قدم رنڈیوں کے کوٹھے تک پہنچ گئے...... دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی...... لڑکی بولی...... تیرا بیٹا بھگوان ہے اسے نہ ڈانٹ، اس نے مجھے کوٹھے سے رہائی دلوا کر مجھ پر بہت بڑا کرم کیا ہے۔کوٹھے پر میرا سودا ہو رہا تھا...... قیمت لگائی جا رہی تھی میری...... جو بھی زیادہ رقم دیتا میں اُس کے ہاتھوں بیچ دی جاتی۔ اس نے میری زندگی بچا دی...... یہ میرا بھگوان ہے۔اپنا مرد بھگوان ہی تو ہوتا ہے...... ماں یہی تو کہتی تھی جب ہم سب گاؤں میں رہتے تھے۔گاؤں سے کئی لڑکیاں چوری ہوئی تھیں۔ان میں سے ایک میں تھی۔مجھ پر دیا کر مجھے گھر سے نہ نکال۔میں اکیلی کہاں جاؤنگی۔مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔میری مجبوری کو سمجھ......

گلابو...... ماں جی...... مجبوری...... ترس...... بے گھر...... یتیم...... شانتی کا ماضی اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔تب ہی شیام اپنے دونوں کان پکڑے ماں کے قدموں میں بیٹھ کر بولا...... اماں آج پہلی بار کوٹھے گیا تھا۔اب کبھی نہیں جاؤنگا۔ یہ تیری بہو ہے۔ میں نے آج ہی اس سے مندر میں بیاہ کر لیا ہے۔ہمیں آشیر وار دے۔گنگا سے بولا...... کھڑی کھڑی منہ کیا تک رہی ہے...... اماں کے چرن چھو......

اماں کے چرن چھونے کے فوراً بعد ہی گنگا نے ہاتھ جوڑ کر کہا...... جس دن سے ان ظالموں نے مجھے بے گھر کیا مجھ سے میرا بچپنا چھینا...... میری ماں اور ماں کی ممتا چھینی...... آج تک میں پیار کے لئے ترستی ہوں...... اماں مجھے تھوڑا سا پیار دے دے...... مجھ فقیرنی کو اپنی بیٹی بنا لے تا کہ میں چین سے جی سکوں...... شانتی کو اس پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے پیار کیا...... بولی۔ میں تیری ماں ہوں اور یہ تیرا گھر ہے...... بیٹی ہم بستی میں رہتے ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں اپنی من مانی نہیں کر سکتیں...... جب تک میں شیام کی اور تیری شادی کی رسم اپنے ہاتھوں پوری نہ کر دوں تو گھر کے باہر نہ جانا...... کسی سے

کوٹھے کا ذکر نہ کرنا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا تو میری بچپن کی سہیلی کی بیٹی ہے...... مکمل تحفظ کا یقین ہوا تو گنگا کے بے چین دل کو راحت ملی...... چہرہ گلنار ہو گیا۔ خوشی کے آنسو اُس کے گلابی گلابی رخساروں پر آ کر ٹھہر گئے...... شانتی نے اُس کے آنسو پونچھے اور کہا...... کل میں بازار سے تیرے لئے وہ سب لاؤنگی جو نئی دلہن چاہتی ہے۔ من میں سوچنے لگی...... میں اپنے ہاتھوں سے گنگا کو سجاؤنگی...... مہندی لگاؤنگی...... جا...... اور اب سوجا...... اور شیام سن تو...... تب ہی نشے میں چور نندو دھاڑ سے زمین پر گرا...... شانتی کے سارے الفاظ آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گئے اور وہ سسک پڑی...... ہے رام میں کیا کروں...... اُس کے انداز میں بے بسی اور بے چارگی تھی۔ صبح ہونے میں ایک پہر باقی تھی اور شانتی کا دل کانپ رہا تھا...... پل چھن میں سب کچھ بدل گیا تھا......

جب نندو کے جسم میں حرکت نہ ہوئی تو شیام نے اپنے باپو کو بلایا...... چادر سرکی۔ ایک نظر میں شیام کے ہوش اڑ گئے...... سرخ سرخ خون سے ساری چادر تر تھی۔ شانتی پھٹی پھٹی نظروں سے نندو کے ساکت وصامت وجود کو تاکتی رہی۔ ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ بستی میں پھیل گئی۔ پڑوسی دوڑے آئے۔ چاچا بولے پولس کیس ہے۔ جلدی پار لگاؤ ورنہ اگر پولس نے آ کر دھر لیا تو آفت آ جائے گی...... شانتی دھیرے سے بولی لیکن چاچا...... یہ کس نے اور کیوں کیا...... چاچا بولے...... یہ وقت تیرے کس اور کیوں کے جواب دینے کا نہیں ہے...... شمشان گھاٹ سے لوٹ کر سوچونگا۔ پل میں شانتی کے دل کی دنیا اُجڑ گئی......

اس بدبخت کا اپنی بد قسمتی پر آنسو بہانے کا بھی وقت نہیں ملا تھا...... کئی گھنٹے گذر گئے...... غم کی شدت سے وہ ہل نہ سکی تھی...... سورج نکل آیا تھا...... بستی میں زندگی رواں دواں تھی...... بس شانتی کے اندر سوگ اتر گیا تھا...... دماغ میں کس اور کیوں کی جنگ جاری تھی...... وہ چاچا کا انتظار کرتی رہی...... چاچا نہیں لوٹے۔ وہ بے جان سی ہو گئی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ زندگی آگے بڑھتی گئی۔ ہر موڑ پر نئی آس لئے ہی انسان جیئے جاتا ہے۔ ساتھی کا ساتھ چھوٹا تو شانتی کے دل میں ماں باپ سے ملنے کی آس بھی ٹوٹ گئی...... بستی سے دور پکا مکان بنانے کا خیال پھر کبھی نہ آیا۔ دل میں رام کی بہو دیکھنے کی آس...... دادی سننے کی آس نے جنم لے لیا تھا......

رام۔ بیٹا تو بھی بیاہ کر لے...... نہیں اماں...... ابھی نہیں...... ابھی میں اس لائق نہیں ہوا کہ ایک اور کا بھار اٹھا سکوں...... پہلے میں ٹھیک سے سیٹل ہو جاؤں۔ ابھی مجھے بہت آگے بڑھنا ہے...... آگے پڑھنا ہے۔ شانتی خوش ہو گئی......

شیام بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا...... چہرے پر اُداسی چھائی دیکھ ماں نے سوال کیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تیری...... ہاں اماں سب ٹھیک ہے...... پھر یہ چہرہ کیوں اُترا اُترا ہے...... اماں۔ ٹھیلا میں کھینچ نہیں سکتا۔ مزدوری کرنا میرے بس کی نہیں...... کوئی نوکری ملتی نہیں...... ماں بولی...... پڑھ لیتا تو تیرا مقدر بھی جاگ جاتا...... میں نے تو بہت کوشش کی پر تو نے نہ...... سنا...... خیر اماں...... وہ غصہ چھوڑ...... اب میں تو اسکول جاکر پڑھ نہیں سکتا...... اب تو ایسا کر...... کیسا...... ماں بولی...... اب میرے میں اور زیادہ کھٹنے کے لئے جان نہیں رہی...... شانتی نے ایک غصہ بھری نظر شیام پر ڈالی...... نہیں اماں میں تجھے کھٹنے کے لئے نہیں کہہ رہا...... تو گنگا کو...... کہیں...... واہ رے واہ...... شوہر گھر میں روٹیاں توڑے...... پیر پسارے سوتا رہے اور بیوی دردر کام کرتی پھرے...... شیام کا پارہ چڑھ گیا۔ تو مرنے دی بھوکی اُسے بھی...... میں خود کمانے کے لائق نہیں اُس کا پیٹ کیسے...... ارے چپ رہ...... جب تک میں زندہ ہوں میری بیٹی بھوکی نہیں رہے گی...... وہ میری بیٹی ہے...... اور میں۔ شیام جل کر خاک ہی ہوگیا دھم دھم کرتا باہر نکل گیا۔

بہت سا وقت گذر گیا۔ شانتی کام پر جارہی تھی...... اماں میں چلوں تیرے ساتھ...... شانتی کو وہ دن یاد آگئے جب وہ رام اور شیام کو لے کر کام کرنے جاتی تھی...... اگر اُس کی دیالو مالکن اُس کا ساتھ نہ دیتیں تو شاید ہم سب بھوکے ہی مرجاتے...... اماں مجھے بھی ساتھ لے چل...... تو اس عمر میں محنت کرتی ہے۔ اور میں گھر میں بیٹھی رہتی ہوں...... اور گھر کا کام کون کرے گا۔ شانتی نے سوال کیا...... اماں میں سب سنبھال لونگی...... ایک دم شانتی نے سوچا...... اسے ساتھ ہی لے جاؤں۔ کم سے کم شیام کی مار سے تو بچی رہے گی۔ شانتی نے کئی بار گنگا کو شیام کے ہاتھوں سے بچایا تھا...... دونوں چل پڑیں......

تیری کمائی پر صرف میرا حق ہے۔ وہ گنگا کے سینے پر پاؤں رکھے کھڑا چیخ رہا تھا۔ اگر یہ روپے مجھے نہیں دے گی تو ابھی اسی وقت تجھے ختم کردوں گا...... وہ خونخوار نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا...... شانتی یہ منظر دیکھ کانپ اُٹھی...... تیزی سے آگے بڑھی اور ساتھ ہی چلائی...... اور تیرا حق ہے کہ اس بے زبان کو ہر وقت کوسے۔ مارے پیٹے...... ارے مت ستا اس غریب کو...... بھگوان سے ڈر...... میں بھگوان سے کیوں ڈروں...... اُس نے مجھے کیا دیا ہے۔ سب سے کھوٹا نصیب ہے میرا۔ غریب گھر میں جنم دیا سب محلوں میں رہتے ہیں اور میں اس گندی بستی میں ایک اندھیری کوٹھری میں...... سب عیش کرتے ہیں اور ہم بھوکا مرتے ہیں۔ کہاں ہے تیرا بھگوان...... سب انسان اُس کے نام سے دھوکا ہی کھاتے ہیں۔ دکھائی تو دیتا نہیں تیرا

بھگوان......شانتی خاموش کھڑی تھی البتہ آنکھیں پھیلی کی پھیلی رہ گئی تھیں۔دل کہہ رہا تھا بھگوان تجھے ہر بلا سے محفوظ رکھے۔......

بہت سے دن گذر گئے اور آخر شانتی کی دادی بننے کی امید بر آئی۔لیکن یہ کیا ہو گیا تھا۔جو بھی بچی کو دیکھتا نرا سا منہ بنا کر ہائے ہائے کر کے لوٹ جاتا۔سب نے کہا تیرے گھر میں بھوت بس گیا ہے۔ماں کے پیٹ میں گھس کر بچی کے ہونٹ کے ٹکڑے کر گیا ہے......دوسرا بچہ ہونے سے پہلے اس کوٹھری کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جا۔کہیں دوسرا بچہ بھی......شیام سن کر بہت پریشان رہنے لگا تھا......دوسری کوٹھری......دوسرا بچہ کئی بار دل چاہا کہ گنگا اور گنگا کی بچی کو ختم کر ڈالے کیا کرے اُسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ اذیت اور بے بسی کی آگ میں جھلس رہا تھا......

شیام دوسرا بچہ قطعی نہیں چاہتا تھا مگر خدا کی رضا کے سامنے انسان کی کب چلی ہے۔وہ نشے میں گرتا پڑتا گھر کی طرف جارہا تھا......سامنے گنگا کو آتے دیکھا۔اُسے آواز دی۔گنگا ہنستی ہوئی اس کے قریب پہنچی......شیام نے اُسے مار کر زمین پر گرا دیا اور پاس ہی پڑے پتھر سے اُس کا سر کچل ڈالا......اُسے پتھر سے مارتا رہا چلاتا رہا نہیں چاہئے مجھے دوسرا لنگڑا۔لولا......اندھا۔بچہ......نہیں چاہیے۔نہیں چاہیے......

آسمان پر کالے بادلوں کے جھنڈ دیکھ کر شانتی کے بے چین دل میں ایک عجب سی بیقراری جارہی تھی......وہ اپنے دونوں بیٹوں کے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ٹپ۔ٹپا۔ٹپ۔پہلی بارش کی پہلی ننھی ننھی بوندیں چھت پر پڑیں تو اُس کا جی چاہا۔بھاگ جائے اپنے گاؤں۔اپنے بابو۔اپنی ماں کے پاس جو آج بھی اُس کی بات تک رہے ہونگے......اُس کالی رات کے ایک ایک کر کے تمام بیتے ہوئے مناظر یادداشت کے پردے پر اُبھر آئے۔انگ انگ چیخ پڑا۔بابو میں بہت اکیلی ہوں اور تو جانتا ہے مجھے اکیلے بہت ڈر لگتا ہے۔تو اماں کو لے کر جلدی آجا......

تب ہی رام کوٹھری میں داخل ہوا......اماں......اُس نے ماں کی محویت کو توڑا......ماں نے اپنے اونچے لمبے لائق فائق بیٹے کے مسکراتے چہرے کو بڑی پیار بھری نگاہوں سے دیکھ کر سوال کیا۔شیام اور گنگا کہاں ہیں؟......تب ہی ایک عجیب سا شور ہوا......ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے سپاہیوں کے ہمراہ شیام کو دیکھ کر ماں کا دل دہل گیا......وہ پورے ہوش وحواس میں کہہ رہا تھا......اماں......تو بے خوف ہو کر اپنی کوٹھری میں رہنا اب تمہیں کبھی کوئی بھوت نہیں ستائے گا۔تیری بیٹی کے پیٹ میں بھوت گھس گیا تھا۔میں نے تیری

بیٹی کو ختم کر کے بھوت کو بھگا دیا...... یہ ماجرا دیکھ شانتی کو لگا کہ زبردست بھونچال آ گیا ہے۔ زمین پھٹ گئی ہے اور وہ تنہا گہرے کھڈ میں جا گری ہے...... دھیمی سی آواز پھر آئی...... اماں...... سب میری صورت سے بیزار ہو جائیں گے۔ دنیا والے مجھے بھلا دیں گے...... مگر نا ہی تو مجھے بھلا پائے گی اور نا ہی مجھ سے زیادہ ناراض رہے گی۔ اماں میں ہر پل ہر گھڑی جیل میں تیرا انتظار کرونگا...... وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے بیٹے کو سپاہیوں کے ساتھ جاتے دیکھتی رہ گئی......

رام اپنی ماں کے تھرتھراتے ڈولتے شریر سے لپٹا ہوا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا اس کی ماں کا کمزور سراپا بھری بھری مٹی کی طرح اُس کی گود میں ڈھے رہا تھا...... فوراً ماں کی ہمت بڑھائی...... اماں تو کمزور نہیں ہے۔ اس آفت کا بھی بہادری سے مقابلہ کر...... میں ہوں نا تیرے ساتھ تو ڈرنا نہیں۔ تو نے تو ساری زندگی اکیلے طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ قدم قدم پر مصیبتیں جھیلتی رہی۔ خود حالات کی بھٹی میں سلگتی رہی مگر اپنے پریوار پر آنچ نہ آنے دی۔ وقت کا ہر وار سہہ سہہ کر خود زخمی ہوتی رہی۔ مگر اپنے پریوار کو اپنے آنچل میں چھپائے رکھا......

اماں۔ یہی جیون ہے۔ اور جیون کا دستور ہے کہ رکو نہیں بس، زندگی کا ساتھ نبھائے چلو۔ اماں جو تو کھو چکی ہے اُسے بھلا دے کیونکہ بربادیوں کا سوگ منانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا......

اماں آنکھیں کھول...... دیکھ میں نے تیرا ادھوا سپنا پورا کر دیا ہے...... بستی سے دور میں نے تیری آنے والی نسل کے لئے پکا مکان بنا دیا ہے۔ آئندہ کوئی تیرے بچوں کو نالی کا کیڑا نہیں کہے گا...... اور یہ سب تیری ہی محنت اور پیار کا نتیجہ ہے۔ تو نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں تیرے ادھورے سپنے پورے کر سکوں...... ایک انسان سارے جہاں کو نہیں سدھار سکتا وہ ایک شخص جو ایک وقت میں ایک انسان کی زندگی سنوار دے بڑا مہان ہوتا ہے۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں جس نے تیری جیسی ماں کی کوکھ سے جنم لیا۔ تجھ جیسی مہان عورت کبھی ہار نہیں سکتی......

ماں کے مردہ دل میں ایکبار پھر امید کی نئی جوتی جاگی۔ اُس نے آنکھیں کولیں۔ نئی صبح تھی نیا پکا مکان تھا...... جس کے در و دیوار سورج کی سنہری کرنوں سے جگمگا رہے تھے......

☆☆☆

آس

بڑے انتظار کے بعد گھنگھور گھٹائیں گھر گھر کر آئی تھیں۔ ہلکی ہلکی بونداباندی بھی ہوئی تھی۔ گرمی کی شدت سے بیزار خدا کی خلقت کے دلوں کو راحت اور تسکین ملی تھی۔ مگر کچھ دیر بعد ہی ان پر انتہا کا غضب آ گیا...... زور کی ہوا چلنے لگی۔ گاؤں والے فریاد بھری نظروں سے آسمان کو تکتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر چھائے سرمئی بادلوں کے غول ہوا کے دوش پر اڑتے چلے گئے...... کسی اور نگری پر برسنے کے لیے۔......

پھر آگ برسنے لگی...... سورج کی تپش نے ساری ہریالی جلا ڈالی۔ ندی نالے سوکھ گئے۔ دھرتی ماتا کا سارا کا سارا رس چوس کر بھی چھوٹے پیڑ پودھے جھلس گئے۔ گھنے درختوں کے پتے سوکھ سوکھ کر گرنے لگے۔ مینھ نہیں برسا...... پیاسی دھرتی ترخ اٹھی......

گاؤں کے چھوٹے بڑے ہر فرد کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ سب نے مل کر اپنے خالق کو پکارا...... اَن داتا میگھ دے...... میرے مولا...... میگھ دے۔ ہمارے تال تلیا بھر دے۔ ہماری سوکھی۔ پیاسی، دھرتی ماں کی پیاس بجھا دے، ہوا کے دوش پر سوار بادل آتے اور بن برسے اُڑ جاتے۔ گاؤں والوں کے دل دہل جاتے......

پہلے بھوک اور پیاس سے تڑپتے بچوں نے دم توڑا۔ پھر بوڑھے۔ کمزور اور بیمار بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر چیخنے لگے...... آہیں بھرنے لگے۔ مگر اُن کی چیخ و پکار سرکاری افسروں کے کانوں تک نہ پہنچی۔ ان غریب، مجبوروں کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا......

اداسی، ناامیدی اور بھکمری نے گاؤں کے ہر فرد کو دبوچ لیا۔ آہستہ آہستہ چیخ پکار کی صدائیں بند ہونے لگیں۔ لوگ مرنے لگے۔ چتائیں جلنے لگیں۔ قبریں کھدنے لگیں۔ غریبی کی ماری بھوکی پیاسی خلقت دانے پانی کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔ گاؤں خالی ہونے لگا......

رام لال بھی اپنی بیمار پتنی اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ گاؤں سے نکل پڑا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس سمت جائے۔ نا ٹھکانا کوئی منزل۔ بس پُر خطر ڈگر پر چل پڑا تھا۔ مڑ مڑ کر شانتی

کو دلا سا دیتا۔ ارے بھگوان پر بھروسہ رکھ۔ بڑا دیالو ہے وہ آج خراب ہے تو کیا ہوا۔ کل ضرور اچھا ہوگا۔ بس چلتی جانا۔ رکنا نہیں......

کچھ آگے بڑھا۔ ایک پل کے لئے رُکا۔ اپنی ماں کی چتا سے دُھواں اٹھتا دیکھ کر بولا۔ اماں کتنا بدنصیب ہے تیرا بیٹا۔ تیری چتا میں صرف آگ ہی لگا پایا...... تیرے پھول نہ چن سکا...... کون تیرے پھول چنے گا۔ کون انہیں ندی میں بہائے گا۔ اماں ندی نالے۔ تالاب سب سوکھ گئے۔ وہ سسکتا رہا اور آگے بڑھتا گیا......

شانتی چل...... بچوں کا ساتھ ہے اور جنگلی جانوروں کا ڈر ہے۔ آس رکھ۔ آج کالا ہے تو کل صبح ضرور ہوگی۔ آس نہ توڑنا...... آس ٹوٹی تو سانسوں کی ڈور بھی ٹوٹ جائے گی۔ وہ شانتی کو پکارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا...... جب شانتی کی آواز نہ آتی تو خوفزدہ ہو کر پلٹا۔ شانتی کو نہ دیکھ کر وہ الٹے پاؤں بھاگا۔ چار قدم کی دوری پر شانتی کو دھرتی پر پڑا دیکھ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ دودھ کی جگہ چھاتی سے خون بہتا دیکھ وہ انتہائی یاس انگیز لرزتی آواز میں چلایا...... بھگوان...... دیکھ...... تیری زمین پر تیرے بندوں کا کیا حال ہو رہا ہے۔ بھوک سے بلبلاتے بچے نے اپنی ماں کی چھاتی کا کیا حال کر دیا...... نا ماں رہی نا بچہ...... ماں اور بیٹے دونوں کی لاشوں کو سوکھے پتوں اور گھاس سے ڈھانک کر چتا میں آگ لگا کر آگے بڑھا۔ اُس کے پاس آنسو بہانے اور سوگ منانے کا وقت ہی کہاں تھا...... اُسے تو ہر حال میں اپنے دوسرے بیٹے کی جان بچانی تھی...... اپنے بیٹے کو اپنے بازوؤں میں مضبوطی سے تھامے وہ چلتا گیا......

دل میں درد کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ دماغ سن ہو گیا تھا۔ قدم اٹھتے ہی نہ تھے دل کا بھاری غم آنسو بن کر بہہ نکلا...... خود ہی اپنے دل کو تسلی دی...... دن بھر بیل کی طرح کھٹتی تھی پھر بھی پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ آج موت نے تجھے سب دُکھوں سے رہائی دلوا دی۔......

بھوک اور پیاس کی شدت سے اُس کا جسم دُربل ہو گیا تھا۔ نگاہ سرکاری نل پر پڑی۔ وہ نل کی طرف لپکا...... پیاس کی شدت سے اُس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ پہلے اپنے بیٹے کو پانی پلایا۔ پھر اپنی پیاس بجھائی۔ سوکھی زبان پر پانی پڑا تو جان ذرا سنبھلی۔ وہ شہر کی طرف بڑھ گیا

سورج کی پہلی کرن...... دیکھتے ہی سورج دیوتا کو پرنام کیا...... نئے سفر کی نئی صبح...... دل میں نئی آس لئے وہ سڑک پر بیٹھ گیا...... سڑک پر بھاگتے کتے کے منہ میں روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر من ہی من میں کہا......

ان داتا...... ایک روٹی کا ٹکڑا میرے بچے کو بھی دے دے۔ آخر انسان ہی تو تھا...... وہ بلک بلک کر رو پڑا......

بہت سے آنسو بہانے کے بعد نظر اٹھائی تو سامنے ایک عورت کو کھڑا دیکھا...... ہاتھ جوڑ کر بولا...... بہنا...... عورت نے انجانی صورت دیکھ کر فوراً کہا۔ تو کون ہے رے۔ تجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا...... اپنی خیرت چاہتا ہے تو فوراً یہاں سے بھاگ جا۔ یہاں کے غنڈوں کو تو نہیں جانتا...... تجھ پر جھوٹے الزام لگا کر تجھے جیل پہنچا دیں گے...... جیل کا سن کر وہ ڈر گیا...... اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا......

کملا نے پھر سوال کیا۔ اتنا تو بتا کہاں کا رہنے والا ہے اور کہاں جائے گا۔۔ وہ روہانسی آواز میں منمنایا...... پاس والے گاؤں کا ہوں۔ مینھ نہیں برسا۔ گاؤں میں بھکمری پھیل گئی...... کل ہی ماں۔ بیوی اور چھوٹے بیٹے کو بھوک نگل گئی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جھل جھل بہنے لگے...... اُسے لگا جیسے اُس کا دم نکل رہا ہو۔ سانس گھٹنے لگی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا...... عورت کے پاؤں پکڑ کر بولا...... میں بھی مر رہا ہوں بہنا...... میرے بیٹے کو روٹی کا ایک ٹکڑا دے دے...... اُسے مرنے سے بچا لے......

ایک مجبور اور بے سہارا باپ کو یوں روتا دیکھ کملا کا دل ہل گیا...... بولی...... بھیا...... رونے سے مقدر نہیں سنبھلتے...... چل...... اٹھ...... میرے ساتھ چل...... رام لال نے اُس کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ وہ پھر بولی...... تو نے مجھے بہن کہا ہے۔ ایک بہن اپنے بھائی کو مرنے کے لئے چھوڑ کر نہیں جا سکتی...... ہمت کر کے اٹھ جو بھی ہو گا بانٹ کر کھائیں گے...... عورت کی باتوں نے رام لال کے اندر ایک نئی طاقت بخشی۔ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش تو کی مگر اٹھ نہ سکا...... کملا نے ہاتھ بڑھا کر سہارا دیا۔ بولی...... اب تیرا بُرا وقت گذر چکا ہے، سوتے ہوئے شیام لال کو گود میں اٹھایا اور اپنی کوٹھری کی طرف چل دی......

گرم گرم چائے اور روٹی رام کے پیٹ میں پڑی...... تو اس کا دم ذرا سنبھلا کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی بہت ہوتا ہے۔ رام لال کو اتنا بڑا سہارا ملا تو کمزور بدن میں توانائی کی لہر دوڑ گئی...... دل میں آشاؤں کے دیپ جل اٹھے...... دھیمی آواز میں رُک رُک کر بولا کوئی کام مل جائے تو روٹی کا سہارا ہو جائے، میں بیٹھ کر تیری کمائی کھاؤں یہ مجھ سے نہ ہوگا......

یہ نہ سوچ کہ یہاں روٹی آرام سے مل جائے گی...... جان ہے تو جہان ہے، دو چار دن آرام کر لے پھر نوکری بھی مل جائے گی...... مگر...... وہ خاموش ہو گئی اور رام لال پریشان ہو کر بولا...... مگر کیا...... یہ شہری ہم غریبوں سے محنت بہت کرواتے ہیں۔ بوند بوند کر کے غریب کے بدن کا سارا خون چوس لیتے

ہیں...... غریب کیا کرے۔ کہاں جائے۔ جسے نوکری کرنا منظور نہیں وہ کھانا بھی نہیں پاتا، سوشہر میں ہی پڑے پڑے زندگی گذار دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ اِن کا ہمارے بناء کام چلے ہے اور نا ہی غریبوں کی زندگیوں کی گاڑی اُن کے بناء آگے بڑھے ہے۔

امید کی ایک کرن پھوٹی تو رام لال بولا۔ میں پوری ایمانداری اور وفاداری سے کام کرونگا۔ محنت کرنے سے میں نہیں ڈرتا۔ خود بھوکا رہ لونگا مگر اس چھوٹے سے بچے کو بھوک سے تڑپتا نہیں دیکھ سکتا۔ کچھ سوچ کر کملا بولی۔ اور جو تو نے دھوکا دھڑی اور جعل سازی کی تو میں بے موت ماری جاؤنگی میں جیل میں پڑی پڑی ایڑیاں رگڑونگی اور تو عیش کرے گا۔ رام لال نے فوراً اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کہا۔ تو نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ سہارا دیکر ہم دونوں کو نئی زندگی دی ہے۔ مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ تیرے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ پھر کچھ سوچ کر بولا...... میں نیچی ذات کا ہوں...... وہ بولی...... ارے زمانہ بدل رہا ہے۔ شہری محنتی نوکر چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ذات پات کی فکر نہیں کرتے۔ ذات پات میں کیا رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان ہی کی ذات سب سے بڑی ہے۔ انسان ہی انسان کو کھائے جا رہا ہے۔ انسان نے ہی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ جدھر دیکھو ظلم وستم کی بارش۔ طاقتور کمزور کو ستا رہا ہے۔ تو نے مجھے بہن کہا ہے۔ اپنی بہن کی لاج رکھیو...... کبھی کسی ایرے غیرے کے کہنے میں مت آجیو، شہر آتے ہی گاؤں کے اناڑیوں کے پر نکل آتے ہیں......

رام لال نے دوبارہ قسم کھائی اور کملا کو یقین دلایا کہ وہ اپنی آخری سانس تک بھائی کا رشتہ نبھائے گا۔ بولا۔ بھگوان نے بیوی۔ ماں اور بیٹا لے کر تجھ جیسی بہن دی ہے۔ میں مزدور آدمی ہوں بچہ پالنا نہیں جانتا۔ اس بچے کو بھی تیرے پیار اور نگرانی کی ضرورت ہے۔

کملا ہنس دی۔ بولی آج آرام کر۔ کل کام کی بات کریں گے۔ رام لال کے دل سے سارے شک وشبہات مٹ گئے تو اُس نے سکھ کی پہلی سانس لی اور من ہی من میں کملا کو ہزاروں دعائیں دے ڈالیں...... رام لال کو کملا کے ساتھ دیکھ کر مالک بولے...... آ گیا تمہارا بھائی۔ کملا کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ گئے...... دو قدم جا کر مڑے...... بولے۔ اس بچے کو آج ہی اسکول میں بھرتی کردو۔

جیسے ہی مالک باہر گئے۔ رام لال نے کہا...... مالک سخت مزاج کے معلوم ہوتے ہیں...... کملا بولی...... باہر سے پتھر نظر آنے والے اندر سے موم ہوتے ہیں۔ مالک تو زمین پر انسان کے روپ میں بھگوان

ہیں۔ بہت نیک اور دیالو ہیں......سب کا بھلا کرتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی دُکھ سے خالی نہیں۔ مالک بھی نہیں۔ ایک دکھی باپ ہیں......اکلوتا بیٹا لندن پڑھنے گیا تھا میم سے شادی کر کے وہیں بس گیا۔ سنا ہے وہاں بچے اپنے ماں باپ کی فکر اور سیوا نہیں کرتے۔ پھر میم سے ساس سسر کیا امید کرتے۔ بیٹا ماں باپ کا دل توڑ گیا۔ مالکن کو بیٹے کے غم میں ہی موت آئی تھی۔ رشتے دار اور دوست احباب کی بھیڑ ہے لیکن وقت پڑنے پر سب کو اپنی اپنی مجبوریاں یاد آجاتی ہیں۔ کوئی مدد کے لئے آگے نہیں آتا۔ اس دنیا کے لوگ بہت خود غرض اور سخت دل ہوتے جارہے ہیں۔ نفرتیں بڑھتی جارہی ہیں، محبت سمٹتی جارہی ہے۔ میں تھوڑا بہت کردیتی ہوں۔ میں عورت ذات کر بھی کیا سکتی ہوں اب تو آ گیا ہے۔ تو ہی ان کی سیوا کرنا۔

رام لال بولا تو جو کہے گی میں ضرور کرونگا......تو یہاں پر کب سے ہے۔ کملا بولی میرے دُکھ کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ میرے اولاد نہیں ہوئی۔ بڑا ظلم ڈھایا میرے آدمی نے اور ساس نے۔ بہت مارا۔ بھوکا رکھا۔ بڑی سخت جان تھی میری۔ وہ مجھے مارنا چاہتے تھے۔ ایک دن مجھے مار مار کر ادھ مری کر دیا اور رات میں مجھے اُسی نل کے پاس چھوڑ گئے جہاں تو بیٹھا تھا۔ میں بھی دُکھ بھوگتے بھوگتے ہار گئی تھی۔ زندگی سے عاجز آگئی تھی۔ بہت ڈری ہوئی بھی تھی......چیختی چلاتی سڑک پر دوڑے جارہی تھی۔ سچ میں مرنا چاہتی تھی۔ مجھے اپنا ہوش ہی نہ تھا۔ مالک کی گاڑی کے سامنے گر گئی......ڈرائیور نے بریک لگا دی اور میں پھر بچ گئی۔......

انسان اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا......نہ جی سکتا ہے اور نا ہی مر سکتا ہے۔ مالکن نے میری درد بھری کہانی سنی تو بولیں چل تجھے تیرے مائیکے چھوڑ دیں۔ بھیا مائیکہ تو ماں سے ہوتا ہے نا۔ میں تو جنم کی بدنصیب ہوں۔ ہوش سنبھالا تو سوتیلی ماں کی چیخ پکار ہی سنی۔ سوچا تھا بیاہ ہوگا تو سوتیلی ماں کے ظلم وستم سے نجات مل جائے گی۔ سوتیلی ساس تو سوتیلی ماں سے بھی زیادہ خونخوار نکلی۔ ماں کے مرتے ہی باپ بھی سوتیلا ہو جاوے ہے۔ سوتیلی ماں نے وداع کرتے وقت ہی کہہ دیا اب اپنی صورت مجھے نہ دکھانا۔ باپ کھڑا سن رہا تھا۔ کچھ بھی نہ بولا۔ پھر میں کہاں جاتی۔ میرے حال پر مالکن کو ترس آگیا۔ بس دس سال سے یہ ہی میرا گھر ہے۔......

مالکن میرا دوسرا بیاہ کرنا چاہتی تھیں۔ مجھے مرد ذات پر بھروسہ نہیں رہا۔ میں راضی نہیں ہوئی۔ انہوں نے مجھے اسکول بھیجا مگر میرے سر میں تو بھس بھرا ہے۔ کچھ پلے ہی نہیں پڑتا تھا۔ مالکن کو وچن دیا ہے کہ اس گھر سے میں نہیں میری ارتھی جائے گی۔ تو بھی یہاں ہی ٹک جا۔ دیانتداری اور محنت سے کام

کر کے مالک کا دل جیت لے وہ سب کا بھلا کرتے ہیں۔ تیرے اور تیرے بیٹے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کر ہی دیں گے......

رام لال نے کملا کا ہر حکم مانا۔ اُس کا دل بہت بیقرار تھا۔ وہ گاؤں جانا چاہتا تھا۔ اُس کی ذمے داریاں اُسے پکار رہی تھیں۔

دوسرے دن جلدی جلدی اُس نے سارے کام نمٹائے۔ ایک پھاوڑا اور بوری لے کر گھر سے نکل پڑا۔ گیٹ پر کملا مل گئی۔ وہ اُسے جاتا دیکھ کر سٹپٹائی۔ چلائی۔ رُک...... کہاں جارہا ہے۔ وہ بولا...... لوٹ کر آؤنگا تب بتاؤنگا۔ وہ پھر چلائی...... تیرا بیٹا شیامو کہاں ہے۔ وہ ایک پل کو رُکا...... مسکرا کر بولا...... تیرے ہوتے ہوئے مجھے اُس کی فکر نہیں رہی...... تو نے اُس کی جان بچائی ہے تو اُس کی جان کی نگرانی بھی کریگی تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا......

رات کو لوٹا شیامو کو آرام سے سوتا دیکھ کر اُس کے اندر ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ پہلی بار زندگی میں آسودگی اور مکمل تحفظ کے احساس نے سارے ملال مٹا ڈالے...... نہا دھو کر کملا کو بتایا...... میرا گاؤں خالی ہوگیا ہے...... چتائیں جل جل کر ٹھنڈی پڑ گئیں...... میں نے ساری ہڈیاں اور راکھ (پھول) جمع کر کے گڈھے میں گاڑ دیے ہیں۔ جب مینھ برسے گا۔ ندی نالے اور تالاب پھر سے پانی سے بھر جائیں گے۔ تب گاؤں والے لوٹیں گے۔ ہم سب مل کر اپنے پیاروں کے (پھول) گڈھے سے نکال کر پانی میں بہادیں گے...... پوجا پاٹھ کریں گے تب سب کی آتماؤں کو شانتی ملے گی......

دن گذرتے گئے۔ شیامو اسکول جانے لگا...... ایک دن کملا ہندی کی ''پہلی کتاب رام لال کو دیتے ہوئے بولی...... لے...... پڑھ...... آج کل پڑھائی کا زمانہ ہے۔ نہ پڑھ کر میں آج تک پچھتا رہی ہوں۔ مالک نے کتنے ہی پڑھے لکھے قابل جوانوں کو سرکاری نوکری پر لگا دیا ہے۔ ہر ہنر سیکھنے کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے...... علم کبھی رائیگاں نہیں جاتا...... روز شام کو پاس میں تجھ جیسے اَن پڑھ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے اسکول کھول دیا ہے۔ کتابیں مفت میں دیتے ہیں۔ میں نے سوچا اگر تو پڑھ لکھ گیا تو تجھے بھی اچھی سرکاری نوکری مل جائے گی۔ تو روپیہ کمائیگا تب ہی تو اپنے بیٹے کو کسی قابل بنا سکے گا۔ اس دنیا میں اَن پڑھ کی کوئی قدر نہیں۔ تیرا بیٹا اچھی تعلیم پائیگا تب ہی تو کسی اچھے عہدے پر پہنچے گا۔ ہر شخص اپنے سے کم عہدے والے کو اپنا زرخرید غلام سمجھتا ہے اور جب چاہتا ہے اُسے پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔ اُس نے جی جان سے

پڑھائی شروع کر دی اور اس کی محنت رنگ لائی......

مہینے بیتے۔ سال گذر گئے۔ ایک دن مالک نے رام لال کو اپنے آفس میں بلا کر کہا۔ ذہانت وراثت میں نہیں ملتی۔ یہ نعمت تو خدا جسے چاہے اسے دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے ذہن تو سب کو ملتا ہے مگر اُس کا استعمال ٹھیک طریقے سے کرنا چاہیے۔ خدا نے تمہارے بیٹے کو اچھا ذہن بخشا اور تمہاری تربیت کا نتیجہ ہے کہ وہ اسکول کے سارے بچوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس کی آگے کی پڑھائی کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوگی جو تمہارے پاس نہیں ہیں۔ آج ہی میرا آفس پیون ریٹائرڈ ہو کر اپنے گاؤں واپس چلا گیا ہے۔ تم جیسا سعادت مند اور محنتی انسان ہی اُس کی جگہ بھر سکتا ہے۔ سوکل سے تم یہاں کام کرو گے کل جب تمہارا بیٹا اچھے عہدے پر پہنچے گا تو سر جھکا کر یہ نہیں کہے گا کہ میں غیروں کے رحم وکرم پر پلا بڑھا ہوں بلکہ سر اٹھا کر بڑے فخر سے کہے گا کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں اپنے باپ کی وجہ سے ہوں۔

سنتے ہی باپ کا دل اندر ہی اندر اچھل گیا...... آنسو بہت روکے مگر خوشی سے آنکھیں چھلک اٹھیں بولا...... مالک سب بھگوان کی اور آپ کی کرپا ہے...... مالک بولے بھگوان بھی انہیں پر کرپا کرتا ہے جو پوری لگن اور محنت سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بنا محنت کئے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا......

کچھ سال اور بیتے...... رام لال کے سپنے پورے ہو گئے...... شیام لال کو جج صاحب سے ملنا تھا شیام لال جج صاحب کے دروازے پر پیون کو کھڑا اور اُس کو سلام کرتا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کچھ دیر تو دونوں پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کے گھورتے رہے پھر شیام لال وکیل سر جھکائے نیچی نظریں کیے جج صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ پیون نے بند دروازے کی طرف پرسکون نظروں سے دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھگوان تو بڑا دیالو ہے...... تو مجھ پر بڑا رحم وکرم کیا ہے۔

شام جب گھر پہنچے تو دونوں باپ بیٹے چپ چپ تھے۔ باپ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور بیٹا اپنی سوچ میں غرق تھا۔ خاموشی کچھ زیادہ طویل ہوئی تو بالآخر بیٹے نے ہی توڑنے کی ہمت کی۔ نہایت ملتجی لہجے میں بولا۔ باپو...... جب سے میں نے ہوش سنبھالا تمہیں محنت کرتے ہی پایا۔ اب تمہارے آرام کرنے کا وقت آ گیا ہے......

باپ نے ایک گہری نظر بیٹے پر ڈالی...... بیٹے کے چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا دیکھ کر بولا...... آج تیرے چہرے کی پھیکی رنگت دیکھ کر میرے دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ملال بھی ہوا ہے۔ کس قدر خوبصورت موڑ پر زندگی مجھے لے آئی ہے آج کا دن ہمارے لئے انتہائی خوشیاں لے کر آیا ہے اور تیرے چہرے

پر...... اداسی چھائی ہوئی ہے۔آج تو اپنے پیروں پر کھڑا ہوکر مجھے صلاح دے رہا ہے کہ میں اپنے پیروں کو آرام دوں......ان کا استعمال کرنا بند کردوں......کیوں......کیا تجھے میری اس نوکری پر اعتراض ہے...... یہ نہ بھول اس نوکری کی وجہ سے ہی تو وکیل بنا اور آج مالک کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے قابل ہوا۔ کتنے لڑکوں کو ایسے موقع ملتے ہیں......

قدرے بے چینی سے بیٹے نے باپ کی طرف دیکھا وہ تو بے یقینی سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ میں ہٹا کٹا جوان نہ سہی......ابھی اتنا لاغر اور کمزور بھی نہیں ہوا ہوں جو اپنا بوجھ نہ سہار سکوں اور سارا تیرے کندھوں پر ڈال دوں۔ابھی تیری عمر ہی کیا ہے......آج ہی تو نوکری کا پہلا دن ہے۔کچھ سال نوکری کرلے پھر دیکھا جائیگا۔

ہچکچاتے ہوئے لڑکے نے کہا بابو تم ہی تو کہتے تھے کہ میں تمہارے بڑھاپے کی لاٹھی ہوں۔ تمہاری تیار کردہ لاٹھی کمزور نہیں جو تمہارا بوجھ نہ اٹھا سکے گی......

ارے میں کیا دنیا...... جوان بیٹے کو بڑھاپے کی لاٹھی ہی کہتی ہے......مگر مجھے بوڑھا تو ہونے دے۔ابھی تو مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں......پہلے میں اپنی ساری ذمے داریوں سے سبک دوش ہوجاؤں پھر آرام ہی آرام کرونگا......

بیٹے نے سوچ وچار کے بعد کہا......بابو آج تمہاری ساری ذمے داریاں ختم ہوگئیں آج سے میری ذمے داریوں کا دور شروع ہوا ہے۔تمہاری دیکھ بھال کرنا تمہاری خدمت کرنا اب میرا فرض ہے......تو کہنا تو ٹھیک ہی ہے لیکن ابھی میری ہڈیوں میں دم ہے۔کام نہیں کرونگا تو کھٹیا پکڑ لونگا اور میں کسی کا محتاج ہوکر جینا نہیں چاہتا......میری ایک بات ذہن میں ڈال لے کہ بھگوان نے انسان کو دنیا میں عیش وآرام کرنے کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کا بھلا کرنے کے لئے بھیجا ہے......ہم سنبھل گئے ہیں......ابھی تک گاؤں کے کئی لوگ لاپتا ہیں......نہ معلوم وہ کن مصیبتوں میں جکڑے ہوئے ہونگے......میرے گاؤں والوں کو میری ضرورت ہے۔چار پیسے نہیں کماؤ نگا تو اُن ضرورت مندوں کی حاجتیں رفع دفع کیسے کرونگا......

تیرے شنکر چاچا کہاں ہیں......سب گاؤں والے تتر بتر ہوگئے......ساتھی بچھڑیں تو بڑی مشکل سے ملتے ہیں رے......بیٹے نے سوال کیا......کون شنکر چاچا......

باپ نے کہا آج کل کی نئی نسل رشتے نبھانا نہیں جانتی......خون کا رشتہ ہو یا نہ ہو، گاؤں والے

سب اپنے ہی ہوتے ہیں...... کوئی غیر نہیں ہوتا...... شہر میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا بس گاؤں اور شہر میں یہی فرق ہے...... ہم گاؤں والے اپنوں کو نہیں بھولتے اور شہر والے بھولے سے بھی اپنوں کو یاد نہیں کرتے...... سوچتا ہوں اپنے گاؤں میں ایک اسکول بنوا دوں۔ تو کوشش کر۔ اب سرکاری ملازم ہے تو......

باپ کی کی باتیں سن کر بیٹا اپنے خیالات پر نادم ہو رہا تھا...... ندامت اُس کے چہرے پر عیاں تھی اسکول کی بات سن تو بولا...... ہمیں اپنے گاؤں کو سنوارنا چاہے۔ اس نسل کو سنبھالیں گے تب ہی تو آنے والی نسل کامیاب ہوگی۔ اُس کے لہجے میں بڑی مضبوطی تھی......

باپ بولا...... کوشش کر کے نہر کھدوادے...... جب بارش نہیں ہوتی قحط پڑ جاتا ہے۔ ذرا بارش زیادہ ہوئی تو سیلاب آجاتا ہے۔ بیچارہ کسان ہر طرف سے مارا جاتا ہے۔ منتری وعدے کر کے بھول جاتے ہیں۔ کھیتوں کی سینچائی کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہوگا......

بیٹا دھیمی آواز میں بولا...... میں تو ایک چھوٹا سا وکیل ہوں۔ میری حیثیت ہی کیا ہے...... باپ نے مسکرا کر کہا...... آج چھوٹا ہے کل بڑا بھی ہو جائے گا...... ہمیشہ وہی کرنا جس میں وطن اور وطن والوں کا بھلا ہو...... بے فائدہ چلنے والوں سے کنارہ کرنا۔ بڑے آدمیوں سے دور رہنا۔ میں نے آج تک کسی کی روٹی مفت نہیں کھائی...... بہت محنت مشقت سے رات دن کام کیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں جسے محنت کرنا منظور نہ ہو وہ کھانا بھی نہ پائے۔ تو بھی سب کو یہی سمجھانا......

بیٹے نے باپ کا خوشگوار موڈ دیکھ کر کہا۔ باپو مجھے سرکاری فلیٹ ملے گا۔ ہم وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔ باپ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ کراری آواز میں بولا...... جب ملے گا تب سوچیں گے۔ فلیٹ تجھے ملے گا۔ شفٹ تو ہوگا میں نہیں۔ میرے پاؤں میں ذمے داریوں کی زنجیریں پڑی ہیں۔ اپنی بیمار بہن اور بوڑھے مالک کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ دوبارہ یہ بات منہ پر بھی نہ لانا...... اور سن تیرے وکیل بن جانے سے تو ان زنجیروں میں اضافہ ہو گیا ہے...... چھوٹے چھوٹے پنچھی پر نکلتے ہی اڑ جاتے ہیں۔ اپنے نئے گھونسلے بناتے ہیں...... تو جوان ہو گیا۔ برسر روزگار ہے۔ جا اپنا گھر بسا۔ اگر شہر کی کوئی لڑکی پسند آگئی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں گاؤں کی لڑکی...... وہ بولتے بولتے رُک گیا...... یادوں کے پنچھی ذہن میں پرواز کرنے لگے۔ جگری دوست کی ننھی سی بیٹی کا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ گھڑی یاد آئی جب دونوں دوستوں نے مل کر عہد باندھا تھا کہ اپنی اس بچپن کی دوستی کو رشتے داری میں بدل دیں گے۔ مگر...... پھر ایسے بچھڑے

۔مل ہی نہ سکے...... بچھڑے کب ملتے ہیں۔ دوموٹے موٹے آنسو باپ کی آنکھوں سے گرے......

پہلی بار باپ کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھ کر بیٹے کا دل ہل گیا...... بولا...... تو حکم کر باپو...... میں وہ سب کرونگا جو تو کہے گا۔ باپو میں یہ بھولا نہیں ہوں کہ میں گاؤں کے ایک غریب باپ کا بیٹا ہوں۔ چھوٹی ذات کا بھی ہوں۔ ہم مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے کس طرح زندگی کے سفر سے گذرے ہیں۔ پھر بھی شہر کے اونچے گھرانے کی امیر اور اونچی ذات کی ماڈرن لڑکی سے شادی کر کے اپنی تباہی کیوں بلاؤں...... وہ میری زندگی کو برا موڑ دے سکتی ہے۔ بڑی مشکل سے ہموار راستہ ملا ہے۔ بے جوڑ شادی کر کے میں دوبارہ پتھریلے اور بنجر راستے پر کیوں جاؤں۔ میں اپنے گاؤں کی اپنی ہی اپنی جیسی غریب گھرانے کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ باپ بولا۔ میں پڑھا لکھا تو نہیں مگر یہ جانتا ہوں کہ...... زندگی کی پرپیچ راہیں بہت بڑی تجربہ گاہ ہوتی ہیں...... تو نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ شہر کی چمک دمک میں تو اپنا ماضی نہیں بھولا...... جو ماضی بھول جاتے ہیں وہ اپنی جڑوں کو بھول جاتے ہیں اور جڑوں سے کٹ کر کوئی جی نہیں پاسکتا......

دودن سے متواتر موسلا دھار بارش ہونے کی وجہ سے سڑکیں پانی میں ڈوب گئی تھیں۔ ٹریفک بند سا ہو چلا تھا۔ سڑک پر ٹیکسی۔ موٹر۔ بس کھسکتی نظر نہیں آرہی تھی۔ مسافروں پر ناگہاں قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ جوان لڑکے بوڑھوں اور بچوں کو سہارا دے رہے تھے۔ گاڑیوں سے اُتر اُتر کر مسافر پیدل چل کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بڑھ رہے تھے......

شیام لام کی نظر بس سے اُترتے مسافروں پر پڑی۔ وہ اُن کی مدد کرنے کے لئے آگے بڑھا...... نظر لڑکی پر ٹھہر گئی۔ لڑکی بس سے اتر تو گئی تھی مگر اُس کا وجود ڈگمگا رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بیحد خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ شیام لال نے اُس کے ڈگمگاتے وجود کو تھام لیا۔ سہارا ملا تو لڑکی کے ہوش سنبھلے۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر اپنے مسیحا کو دیکھا...... شیام لال نے اُن جگر جگر کرتی نگاہوں میں جھانکا اور وہ نظر سے جان میں اُترتی چلی گئی۔ دونوں مسکرا اٹھے شیام لال کے دل نے کہا تم صرف میری ہو۔ مس...... آپ کو کہاں جانا ہے...... مسکراتے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ چمکتی آنکھوں میں خوف کی لہر لہرائی۔...... یہ کونسی جگہ ہے میں نہیں جانتی...... دیار غیر میں بے سہارا ہوں۔ لڑکی کی ذات بڑی بے بس ہوتی ہے۔ یتیم خانے میں رہتی تھی۔ اُن لوگوں کے رویوں سے گھبرا کر اپنے گاؤں کی تلاش میں نکل پڑی تھی۔ کیا معلوم تھا مجھ پر اتنی بڑی مصیبت آن پڑے گی...... سب مسافر اُتر گئے تو مجھے بھی اترنا پڑا۔ آپ میری اتنی مدد تو

کر سکتے ہیں۔ مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دیں...... پلیز رات ہونے سے پہلے۔......

بھیڑیوں کے جنگل میں محفوظ جگہ...... حالانکہ شیام لال نے بہت آہستگی سے کہا تھا مگر لڑکی نے سن لیا...... بولی...... یہاں جنگل بھی ہے...... اور زور سے اُس کا ہاتھ پکڑا...... بھیڑیئے بھی...... مس بڑی نادان ہیں آپ...... جوان لڑکی کے لئے انجانے شہر میں کوئی جگہ محفوظ نہیں ہوتی۔ آج کل شہر میں بھیڑیوں کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے...... پولس پریشان ہے۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے...... وہ بے حد خوفزدہ تھی......

وہ ازحد نروس اور بدحواس لگ رہی تھی...... آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر دل چاہا کہ وہ اُس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ ڈالے۔ مگر دل کو سنبھالا...... اور بولا...... آنسو پونچھ لیں...... اب آپ ناہی یتیم خانے میں ہیں اور ناہی بے سہارا ہیں...... میں ہوں نا آپ کے ساتھ...... یقین کریئے میں اتنا غیر ذمے دار بھی نہیں جو آپ کو بھیڑیوں کے اس جنگل میں اکیلا چھوڑ کر چل دوں...... لہجہ صداقت اور اپنائیت سے بھرا تھا......

وہ مسکرا اٹھی...... زندگی میں پہلی بار اتنا مضبوط سہارا ملا تو دل کے آنگن میں بہاروں کی آہٹ محسوس ہوئی...... اُس نے آنسو پونچھے اور نظریں اٹھائیں۔ دل کا دروازہ آنکھوں سے عیاں ہوا دو دل مسکرائے...... دو دلوں میں کنول کھل اٹھے......

شیام لال اُسے باپو کے پاس لے آیا...... گھمبیرتا سے بولا...... آپ یہاں سو فیصد محفوظ ہیں۔ آپ میرے باپو سے باتیں کریں...... آپ کون ہیں...... میں نہیں جانتا۔ آپ خود ہی اپنے بارے میں بتائیں......

شیام لال کملا کے کمرے سے کپڑے لے آیا۔ لڑکی کو دیتے ہوئے بولا...... پہلے آپ جلدی سے کپڑے بدل لیں...... باتیں بعد میں ہونگی...... زکام ہو گیا تو ڈاکٹر بلانا پڑے گا...... ڈاکٹر...... وہ من ہی من مسکائی...... میرا تی پرد۔ وا...... یتیم خانے میں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ مرو یا جیوء...... بس کام کرے جاؤ......

انجانی لڑکی کو بیٹے کے ساتھ دیکھ کر باپ گھبرایا...... بولا...... اس لڑکی کا نام پتا تو معلوم کر۔ کسی غیر لڑکی کو گھر میں لانا ٹھیک نہیں...... وہ فوراً بولا...... باپو ایک بے سہارا یتیم لڑکی کو سڑک پر اکیلا چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں...... موسم ٹھیک ہوتے ہی وہ چلی جائے گی......

باپو بولا...... ارے یتیم ہے۔ کہاں جائے گی۔ بیچاری۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ بہت ڈری اور سہمی سی ہے۔ بچی گھر آئی تو گھر دمک اُٹھا...... کچھ دن رہنے دے...... تیری ماں ہوتی...... تو کیا

ہوتا...... بیٹے نے مسکرا کر باپ سے سوال کیا......

وہ وہی کرتی جو ہر ماں کرتی ہے...... وہ ضرور اس پیاری سی لڑکی کو اپنی بہو بنا لیتی...... بیٹے کا دل چہکا...... ہولے سے باپو سے سوال کر بیٹھا...... اور تم کیا چاہتے ہو باپو...... باپ بیٹے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ لڑکی کو آتے دیکھ دونوں نے چپ سادھ لی......

کافی کا مگ بڑھاتے ہوئے بولا...... آپ گرم گرم کافی پئیں اور میرے باپو سے باتیں کریں...... کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا...... آپ کھڑی کیوں ہیں...... بیٹھ جائیں...... میں ابھی آیا......

لوٹا تو لڑکی کے بیٹھنے کا انداز دیکھ کر حیرت سے تاکتا ہی رہ گیا...... کرسی خالی تھی۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور وہ سمٹی سمٹائی باپو کے چرنوں میں بیٹھی اُن کے چرن دبا رہی تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر باپ کے ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ پھیل گئی...... چہرے پر لالی بکھر گئی...... کھنکتی آواز میں بولے...... بڑا بوجھ تھا دل پر...... یہ بچی آئی...... دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ کل اپنے جگری دوست کو دیا وچن پورا کرونگا...... شنکر تو نہ رہا...... اُس کی بیٹی تو ہے۔ میں اُس کی بیٹی کا بیاہ کرواؤنگا...... وہ اس گھر کی مالکن ہوگی...... وہ تیری دُلہن ہوگی...... کل ہی تم دونوں کی شادی ہوگی......

کمرے میں میں جیسے شہنائی گونج اٹھی تھی...... شیام لال نے جھک کر باپو کے چرنوں کو ہاتھ لگایا۔ دونوں کی نظریں ملیں...... آنکھوں میں ستارے جھلملائے...... باپو بولے شادی۔ کل ہی...... شبھ کام میں دیری نہیں کرنا چاہیے...... شیام لال دروازے کی طرف بڑھا...... باپو نے روکا۔ اکیلے کہاں جا رہا ہے۔ رادھا کو بھی کافی دے اور دونوں کھانا کھا لو...... وہ اٹھی...... دونوں مسکراتے ہوئے کمرے سے نکلے۔ باپو نے سکھ کی سانس لی...... شنکر تیری بیٹی میرے گھر میں راج کرے گی۔ وہ اس گھر میں اتنی سکھی رہے گی کہ پچھلے سارے دُکھ بھول جائے گی۔ تیری بیٹی کہاں جائے گی...... ٹیچر بنے گی...... تیری اور اپنی زمین پر میں اسکول بناؤنگا اور تیری بیٹی ہمارے گاؤں کے پہلے اسکول کی پہلی ٹیچر ہوگی۔ اور یہی سوچتے سوچتے وہ سو گیا......!!!

☆☆☆

ناگن

امریکہ سے دہلی تک کا لمبا سفر تو کسی طرح جاگتے سوتے جاگتے ختم ہو چکا تھا...... وہ بھوکا تھا۔ پرتھوی نے یہ سوچ کر کھانا نہیں کھایا تھا کہ کچھ گھنٹوں ہی کی بات ہے گھر میں اپنے بابو جی اور اماں کے ساتھ بیٹھ کر آج اپنی پسند کی دال چاول کھاؤنگا۔ یوں تو اماں نے روزانہ کی طرح کئی ڈشیز بنائی ہونگی۔ مگر ان کے ہاتھوں کی بنائی دال...... واہ...... مزہ آجائے گا......

جہاز اب رن وے پر دوڑ رہا تھا اور پرتھوی کا دل اندر ہی اندر تیزی سے اُچھل رہا تھا بابو جی میری کامیابیوں کا ذکر سنتے ہی مجھے گلے سے لگا کر میرا ماتھا چوم کر کہیں گے...... شاباش بیٹا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم نے خاندان کا نام روشن کر دیا ہے۔ اب ہم دونوں مل کر گاؤں میں ہسپتال بنائیں گے اور سب غریبوں کا علاج مفت کریں گے......

لیکن آج یہ کیسی انہونی ہوگئی تھی۔ دلاور سنگھ جو اپنے قول کے پکے اور سچے تھے آج اپنے اکلوتے بیٹے کو دیا قول نہ نبھا سکے تھے۔ باپ کو ائیر پورٹ پر نہ دیکھ کر بیٹے کا دل حیرتوں میں ڈوب گیا تھا...... بابو جی کی جگہ باوردی ڈرائیور کو دیکھ وہ سٹپٹا گیا تھا۔ فوراً ہی خیال آیا یہ کہیں جہیز وہیز کا معاملہ تو نہیں...... باہر فورن کار دیکھ کر تو بوکھلا ہی گیا...... ضرور کوئی مغرور۔ امیر کبیر کی سر پھری بیٹی میرے ساتھ باندھ دی جائے گی،......

ڈرائیور سے بابو جی کے نہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ بجائے جواب دینے کے ڈرائیوں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ کئی بار پوچھنے کے بعد جب ڈرائیور کچھ نہ بولا تو پرتھوی نے اونچی آواز میں کہا...... یار تم کیا کم سنتے ہو...... ڈرائیور نے اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔ آپ کے بابو جی آج آپ کو گھر پر نہیں ملیں گے...... پرتھوی نے ہنس کر کہا...... ڈاکٹروں کے پاس اپنے اور اپنے فیملی کے لئے وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔ اُن کا سارا وقت مریضوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے ہی گذر جاتا ہے......

گاڑی ایک نہایت شاندار بنگلے کے سامنے رُکی...... ڈرائیور نے دروازہ کھول کر ایک عجب سے لہجے میں کہا...... آپ کا گھر آ گیا ہے...... لہجے کی گونج اور سامنے عالیشان مکان...... پرتھوی کا دل دہل اٹھا...... ''یہ میرا گھر'' دل ماننے کو راضی نہ ہوا...... اُسے یقین تھا اُس کے ایماندار بابو جی سرکاری ہسپتال

میں ڈاکٹر تھے اتنے تھوڑے سے عرصے میں اتنا قیمتی گھر بنا ہی نہیں سکتے...... وہ گہری کش مکش میں گرفتار تھا۔ راجن کی آواز پر چونکا۔ دونوں دوست بڑے تپاک سے گلے ملے اور آگے بڑھے...... اماں کہاں ہیں...... ڈرائنگ روم میں پھیلے سناٹے سے گھبرا کر پرتھوی نے سوال کیا...... جواب ندارد تھا...... ارجن نے قیمتی پردہ کھسکایا...... اندر قیامت کا سماں تھا۔ ماں کے چہرے پر وحشتوں کے سایے لہرا رہے تھے...... سوجی سرخ۔ انگارہ آنکھیں اُسے تاک رہی تھیں...... ماں کا لٹا پٹا گم سم وجود دیکھ کر پرتھوی کی آنکھوں میں زمین اور آسماں گھوم گئے...... دل و دماغ سن پڑ گئے۔ پیر جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔ بیحد گھبرائی ہوئی آواز میں ارجن سے سوال کیا...... میرے بابوجی کہاں ہیں'' ...... ارجن کی خاموشی پر چیخ پڑا۔ کس سے پوچھوں'' ...... ان دیواروں سے...... اُس کا کندھا زور سے ہلا کر پھر سوال کیا۔ '' کہاں ہیں میرے باپو جی'' کیا آئی۔سی۔یو۔ میں ہیں'' ...... آؤ میرے ساتھ'' ارجن نے بیحد افسردہ لہجے میں کہا اور پرتھوی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھا۔ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ گئے...... سامنے والے کمرے کا پردہ کھسکا کر ارجن بولا یہ تمہارا کمرہ ہے۔ یہاں تمہیں تمہارے سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ وہ رُکا نہیں۔ دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گیا......

میز پر رکھے اخبار پر جو نظر پڑی پرتھوی کی آنکھیں پھیلی کی پھیلی رہ گئیں...... سانسیں رکتی محسوس ہوئیں...... اپنے باپو کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور بڑے بڑے حروف میں لکھا JAIL-NOBAIL دیکھ کر اُس کی سوچیں تھرا گئیں...... اُس کا پورا بدن کانپ اٹھا اور رواں رواں چیخ اٹھا...... نہیں...... نہیں...... پیر اس بری طرح کانپتا وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ وہیں فرش پر ڈھے گیا۔ ایک بھیانک سناٹے نے اسے گھیر لیا...... چیختا ہوا سناٹا...... اندر گھاؤ کرتا ہوا سناٹا...... بلک بلک کر اپنے بابوجی سے شکوہ کیا...... باپو یہ سب آپ نے میرے لیے کیوں کیا؟...... مجھے ان چیزوں سے کب سروکار رہا تھا جو آئندہ ہوگا۔ میرے آرام و آسائشوں کی خاطر آپ نے اپنی خودی کو مٹا ڈالا...... سب کچھ بھسم کر ڈالا۔ آپ کی لگائی اس آگ میں میں اپنے آپ کو انگاروں کی طرح جلتا محسوس کر رہا ہوں...... کمرے کی ہر خوبصورت شے اُس کی آنکھوں کو جھلسا رہی تھی۔ جی چاہا ہر چیز توڑ پھوڑ ڈالے۔ سب کچھ تہس نہس کر دے......

دوسرے ہی پل میں وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھے ایک چھوٹے بالک کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا...... دونوں کے دلوں اور روحوں میں دُکھ کا سناٹا ہی سناٹا تھا...... نہ کوئی سوال نہ کوئی جواب

۔ایک الاؤ تھا جس میں دونوں سلگ رہے تھے۔ بیٹے نے سوالی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا۔ آپ نے انہیں کیوں نہیں روکا۔ کیا دولت کی چمک سے آپ کا ایمان بھی ہل گیا جبکہ آپ تو سب سے فرق ہیں۔ سب سے جدا......

احساسِ توہین سے ماں کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ آنکھیں برس پڑیں اور بے بسی کے عالم میں دونوں ہاتھ رگڑتی ہی رہ گئیں۔...... پھر ماں اور بیٹے دونوں کی آنکھیں جھک گئیں...... دونوں کے سر اس انداز میں جھکتے چلے گئے کہ آئندہ کسی کے سامنے کبھی اُٹھ ہی نہ سکیں گے۔ پرتھوی کی سمجھ میں نہ آیا ماں سے کیا کہے...... کیسے تسلی دے کہ یہ دُکھ تو موت کے دُکھ سے بھی زیادہ بھاری تھا جسے جھیلنا دونوں کے لئے ناممکن تھا......

پرتھوی بوجھل دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا...... اخبار کو غور سے دیکھتا رہا...... ضرور کسی دشمن کی سازش ہے۔ اس کا جی چاہا دوڑ کر جائے اور اپنے بابو جی کے ہاتھ اُن بھیانک ہتھکڑیوں سے آزاد کر دے...... ان پر لگے ایک ایک داغ کو اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالے...... ہر الزام کو جھوٹا ثابت کر دے۔ ساری دنیا کو یقین دلا دے کہ میرے بابو جی جیسا شریف۔ ایماندار۔ دیانت دار اور رحم دل انسان کوئی نیچ حرکت کر ہی نہیں سکتا......

یکا یک یادوں کے بند کواڑ کھلے...... دادا جی کے منہ سے نکلے وہ سارے قصے ذہن میں تازہ ہو گئے جو بابو جی بھول گئے تھے...... اگر اپنے بزرگوں کی کہی باتیں یاد رکھتے تو آج یہ بُرا دن دیکھنا نہ پڑتا...... اُن کے زمانے میں سادگی سے زندگیاں گذارنے کی روایت تھی...... وہ لوگ ہر ضرورت مند کی مدد کرنا اپنا دین و دھرم سمجھتے تھے۔ اُن دنوں گاؤں میں بینک نہیں تھا...... اُن کے کھیت ان کے بینک تھے۔ کل بیج ڈالو...... آج فصل کاٹو...... خود کھاؤ اور سب کو کھلاؤ...... اگلے سال دھرتی ماتا پھر سونا اُگلے گی...... نہ بچانے کی ضرورت اور نہ جمع کرنے کی فکر...... بابو جی آپ اپنے بزرگوں کی روایت کیسے بھول گئے...... آپ کو کس چیز کی کمی محسوس ہوئی، جس کی چاہت میں آپ نے اپنا ضمیر بیچ ڈالا...... اپنا دین وایمان بیچ ڈالا اور مجھے اور اماں کو اپنی بے جا کمائی دولت کے بوجھ تلے دفن کر ڈالا۔ آپ اپنی وہ پرانی حویلی کیسے بھول گئے...... جہاں بادِ صبا راگنی گاتی تھی۔ پھول مہکتے تھے...... چڑیاں چہکتی تھیں اور زندگی مسکراتی تھی...... دل سلگتا رہا اور وہ اپنے بابو جی کو پکارے چلا گیا......

بابو جی آپ تو کہتے تھے کہ میں آپ کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔ آپ کی تمام راحتوں اور اُمنگوں کا

مرکز تھا۔ پھر کب اور کیسے آپ کی سوچیں بدل گئیں...... میرا خیال چھوڑ کر دنیاوی دولت کی تلاش میں دھول سی اٹی اس راہ پر نکل پڑے جو صرف ندامت اور شرم کے گھنے جنگل تک لے جاتی ہے...... تنہا انسان اس بھیانک جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے فنا ہو جاتا ہے۔ آپ نے دولت بٹوری اور اپنے بیٹے کو فقیر بنا ڈالا۔ دنیا والوں کی نظروں میں بے دم اور بے وقعت کر ڈالا...... میں اس قابل نہ رہا کہ دنیا والوں کا سامنا کر سکوں...... سینہ تان کر اُن کے سوالوں کا جواب دے سکوں...... کل تک سب آپ کی عزت کرتے تھے اگر کسی نے آپ کے بارے میں کوئی ذلیل بات کہی تو میں کیسے سن سکونگا...... وہ اس بری طرح رو رہا تھا کہ ارجن کا دل چاہا دروازہ کھول کر اندر چلا جائے...... اپنے اس دوست کو تسلی دے۔ اُسے سمجھائیں کہ تیرے فادر انسان ہیں فرشتہ نہیں...... انسان غلطیاں کرتا ہے فرشتے نہیں...... مگر اُس کی ہمت نہ ہوئی...... وہ اُس کے بچپن کا دوست تھا مگر تھا تو اس گھر کا نوکر ہی......

آپ میرے محافظ تھے اور آپ ہی نے میرے سر سے وہ گھنی چھاؤں چھین لی جس کے تلے میرا بسیرا تھا...... میں چین کی نیند سوتا تھا...... بچپن سے لے کر آج تک آپ میرے رہبر تھے...... میری منزل کا پتا دینے والے۔ میں تو آج تک آپ کے نقش قدم پر چلتا آیا ہوں...... میں آپ کے ان قدموں کو ڈھونڈھ رہا ہوں جو ہمیشہ راستی کی اور بڑھتے تھے مگر آج مجھے ان مبارک قدموں کے نشان نہیں مل رہے ہیں۔ میں بھی کتنا نادان ہوں ان ہی قدموں کو چومنے کے لئے ترس رہا ہوں جو لالچ کی گرد میں کھو گئے ہیں...... آپ ہی بتائیں اب میں کس اور جاؤں۔ اچانک راستہ بدلنا آسان تو نہیں ہوتا...... میں جب سے آپ کی بنائی اس عالیشان کوٹھی میں داخل ہوا ہوں ہر پل یہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہی میری قتل گاہ ہے۔ میں یہاں سے زندہ باہر نہیں نکل سکتا......

آپ آ کر مجھے بتائیں میں کس طرح زندہ رہوں۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو دادا جی سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں...... جاننا چاہتے ہیں کہ ان کی مضبوط قدیمی حویلی کی نیو کیسے اور کیوں ہل گئی...... زمین پر آنے والے اس بھیانک زلزلے کی گونج نے میری روح کو زخمی کر دیا ہے۔ آپ ہی بتائیں میں اُنہیں کیا بتاؤں...... اگر سچ بتاؤں گا تو اُن کی زخمی روح کہے گی مٹا ڈال اُسے اور اُس کی آنے والی نسل کا نام و نشان کیونکہ جس انسان پر۔ اعتبار ہی نہ کیا جائے وہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذرا سے مفاد کی خاطر کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے یہاں تک کہ اپنے وطن سے بھی غداری کر سکتا ہے......

آنکھیں کھولتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظریں میرے آر پار اُتر رہی ہیں۔ سب ہاتھوں میں سنگ لئے کھڑے ہیں اور مجھے ہی سنگ سار کرنے کو آگے بڑھ رہے ہیں...... آج میں بیحد اکیلا ہوں۔ ایکدم تنہا...... آپ اپنی بیحد مصروفیت کے باوجود بھی اپنے وقت کے خزانے سے کچھ وقت تو روز ہی مجھے دیتے تھے۔ میری ہر مشکل آسان کر دیتے تھے۔ آج جب میں دکھوں کے گہرے ساگر میں ڈوبتا جا رہا ہوں کنارے پر کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ کہاں ہیں آپ...... آ کر مجھے تھام لیجئے کہیں ایسا نہ ہو اس ساگر میں بہتا بہتا میں آپ سے بہت دور نہ نکل جاؤں۔ میرے بعد...... ذرا دیر کو سوچنا اگر آدمی ساری دنیا حاصل کر لے اور اپنی جان کا نقصان اٹھائے تو اُسے کیا فائدہ ہوگا...... پھر وہ اپنی جان کے بدلے کیا دیگا...... شرم و ندامت...... ناامیدی اور دکھوں نے مل کر پرتھوی کے دل پر بڑا زبردست حملہ کیا تھا......

پہلا ڈگمگاتا قدم۔ پہلی غم سے بھری اداس شام۔ سیاہ تاریک رات۔ دل دہلا دینے والی غمگین خاموش صبح...... پھر تاریک سرنگ میں زندگی کا تنہا لمبا سفر طے کرنا آسان تو نہیں ہوتا مگر انسان نہ دیکھ کر سمجھتا ہے اور نہ سمجھ کر سیکھتا ہے...... سب کچھ لٹا کر جب ہوش میں آتا ہے اپنے کو گندگی کے دلدل میں پھنسا پاتا ہے جہاں سے رہائی کبھی نہیں ملتی، اُسی میں غرق ہو جاتا ہے...... دلاور سنگھ بھی ایک ہوش مند اور تعلیم یافتہ انسان تھے...... آغاز سے پہلے انجام سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاتھوں اپنے نصیب پر سیاہی پھیر دی تھی۔ جیل میں ذرا کھٹکا ہوا۔ دلاور سنگھ کے جسم میں ذرا سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ سپاہی نے زوردار آواز میں پکارا۔ قیدی نمبر 420۔ پاس آ کر کہا۔ کیا خوب نمبر دیا ہے تجھے...... تجھ جیسے بے دین بے ایمان۔ بددیانت دھوکے باز۔ فریبی انسان کے لئے یہ نمبر بالکل فٹ ہے...... میری نظر میں تو خونی بھی ہے۔ حالانکہ تو نے گلا دبوچ کر یا خنجر بھونک کر کسی کو قتل نہیں کیا مگر انسانوں کے اعضاء کی تجارت کر کے کتنے ہی لوگوں کو موت کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا......

میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں...... جس طرح پل پل میرے پتاجی تڑپ رہے ہیں اور ہولے ہولے موت کی طرف بڑھ رہے ہیں...... میرے پتاجی کی ایک کڈنی چرا کر اُن کی عمر کم کر دی اور سیٹھ کے پیٹ میں فٹ کر کے اُس کی عمر بڑھا دی...... ڈاکٹر کے روپ میں جلاد بن کر تو انسانوں کی زندگیوں سے کھیلتا رہا اور اپنے خزانے بھرتا رہا۔ دو چادریں ڈاکٹر کے سامنے پھینک کے سپاہی چلا گیا......

ڈاکٹر دلاور سنگھ کو رشوت لیتے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ وہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ اُن کا جگری

دوست رانا آ کر اُن کی بیل کروائے گا...... باہر نکل کر وہ رشوت دیکر سب کا منہ بند کر دیں گے...... وہ بھول گئے تھے فصل غربت میں سب دوست ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی کہانی سپاہی کی زبانی سن کر وہ اندر ہی اندر سہم گئے تھے۔ میں نے تو ہر قدم پر بے حد راز داری برتی تھی پھر سب کو کیسے خبر لگ گئی۔ بیٹے کا خیال آتے ہی اُن کے جسم میں جھرجھری سی پھیل گئی پھر فوراً ہی اپنے دل کو تسلی دی۔ نئی عالیشان کوٹھی میں دولت مندوں جیسے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ خوش ہو جائے گا اور فوراً مجھ سے ملنے دوڑا آ جائے گا۔ بیوی کا خیال آیا تو سوچا وہ تو سیدھی سادھی ہے۔ مجھے چھوڑ کر جائے گی بھی کہاں۔ ہمیشہ کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر اُس کا منہ بند کر دونگا...... اپنے گناہوں کو چھپانے کے لئے وہ اپنے سارے عزیزوں اور دوستوں میں عیب ڈھونڈ ھتے رہے۔ چور تو سب ہی ہیں۔ کئی ایم۔ پی۔ وکیل۔ بزنس مین پکڑے گئے۔ بیل پر چھوٹ کر عیش کر رہے ہیں...... میں بھی چھوٹ جاؤنگا...... دنیا والے سب بھول جائیں گے اور میرا بیٹا عیش و آرام سے زندگی گذارے گا...... پہلی اداس شام انتظار میں گذر گئی...... ناجگری دوست آیا نا بیٹا...... تو وہ گھبرائے......

شدت کی گرمی کے ساتھ مچھروں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ کھانے کی تھالی پر نظر گئی...... چوہا روٹی کُتر کُتر کر کھا رہا تھا۔ وہ سوچتے سوچتے نڈھال ہو گئے تھے۔ ٹھنڈے کمرے میں آرام دہ بستر پر سونے والے نے چادر تان کر سر فرش پر ٹکایا...... اور فوراً ہی اٹھ بیٹھا...... یکا یک مردہ ضمیر سسک اٹھا...... کیا سوچا تھا۔ کیا ہو گیا۔ کیا کیا سپنے دیکھے تھے...... سسکتا ضمیر بیدار ہوا تھا...... دھیرے سے گنگنایا...... تیرے سپنے جھوٹے تھے۔ تو نے غلط سوچا تھا۔ جو ہو رہا ہے وہ تو ہونا ہی تھا انہوں نے اپنے ناداں اور ضدی دل کو ڈانٹا۔ اے دل آئندہ میں تیری بات کبھی نہ سنونگا......

آنکھوں میں سیٹھ جی کا دیا وہ لفافہ آ سمایا جسے دیکھتے ہی اُن کا پہلا قدم ڈگمگایا تھا...... وہ پہلا منحوس پل یاد آیا جب اُن کے لرزتے ہاتھوں سے اُس ناگن کو چھوا تھا جو اُن کا غرور و فخر اُن کے دل کا چین ڈس گئی...... اے میرے نادان دل۔ میرے انوکھے لاڈلے تو کھیلنے کو چاند مانگتا رہا اور میں چاند پانے کی چاہت میں تیری کہی مانتا گیا...... اگر ذرا دھیان سے کام لیتا تو آج میرا یہ حشر نشر نہ ہوتا۔ دولت مندوں جیسے رنگ ڈھنگ میں رچ جانے کی خواہش بڑھتی گئی۔ لفافے آتے رہے اور میں ہواؤں میں اڑتا چلا گیا۔ پھر میرے قدم زمین پر پڑنا ہی بھول گئے۔ پہلے اسکوٹر۔ پھر فورن کار۔ عالیشان کوٹھی...... دولت کی ہوس بڑھتی ہی گئی اور وہی ہوس آج مجھے یہاں کھینچ لائی۔ میں کیا کرتا میں دولت کے پیچھے نہیں بھاگا دولت خود

چل کر میرے دروازے آتی رہی اور میرے ہوش اُڑاتی رہی......

اگر وہ پہلا منحوس پل نہ آتا۔ اگر میرے پاؤں نہ ڈگمگاتے۔ اگر میں اپنے لرزتے ہاتھوں کو روک لیتا۔ اگر میں آنکھیں موند کر اُس پہلے لفافے کو نہ اٹھاتا اگر میں دولت کی چاہت کو دل سے مٹا ڈالتا......

اندر سے دھیمی سی آواز آئی...... اگر تو اپنے دل سے نہیں اپنے دماغ سے کام لیتا۔ اُس کی سنتا تو آج اپنی پرانی حویلی کے آنگن میں بیٹھا اپنے بیٹے کے ساتھ حلوا پوری کھاتا ہوتا...... دلاور سنگھ کی پہلی سیاہ رات سوچتے سوچتے گذر گئی...... صبح ہوگئی تھی مگر اُن کے اندر باہر گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا...... بیٹے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس رہی تھیں...... وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہے تھے......

رام بھرو سے سپاہی پھر آدھمکا...... قیدی نمبر 420...... تجھے ایک خبر سنانے آیا ہوں...... تجھ سے سنگدل انسان کا مقدمہ تو صرف خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے...... وہی تجھ جیسے سنگین مجرموں کو سزا دیتا ہے۔ سن سکے تو سن...... خون کا بدلا پھانسی...... یہی انصاف کہتا ہے...... تجھ جیسے درندے کے لئے جو انسانوں کے عضو کا بیوپار کرے پھانسی کی سزا بھی کم ہے۔ تو نے تو انگنت غریبوں اور لاچاروں کی زندگیاں تباہ کر ڈالیں...... اُن کے عضو نکال کر انہیں جیتے جی مار ڈالا...... بھگوان نے تجھے سزا دی ہے کہ تو پل پل مر مر کے جیئے جائے گا...... گنہگار تو ہے۔ تیرے گناہوں کے کفارہ کے لئے رات تیرے بیٹے نے اپنی جان دے دی...... موت نے تیرا بیٹا تجھ سے چھین لیا...... وہی موت جس کے دہانے پر تو میرے پتاجی کو لے آیا ہے......

دلاور سنگھ جیسے دلیر انسان کا رواں رواں کانپ اٹھا...... اس کا بھاری بھرکم وجود جو ندامت کے بھاری بوجھ تلے پہلے ہی جھک چکا تھا اب غم کی شدت سے زمین بوس ہوگیا۔ سپاہی بولا...... کاش تو اپنی آنکھوں سے اپنی بربادی کا تماشہ دیکھ پاتا۔ اپنی وہ عالیشان کوٹھی دیکھ سکتا جسے حاصل کرنے کے لیے تو نے اپنا وجود تار تار کر دیا۔ دیکھ سکتا کس طرح تیرے بیٹے نے اسی کے فرش پر سر ٹیک کر اپنی جان دے دی...... اب تیرا وہ محل غم خانہ بن گیا ہے...... اور یہ بھی سن تیری پتنی کا حکم ہے کہ نا ہی تو اپنے بیٹے کا منہ دیکھے گا اور نا ہی اُس کی چتا کے قریب جائے گا کیونکہ تو اس کا قاتل ہے تو نے اپنے ہاتھوں اپنے بیٹے کی قبر کھودی اور اُسے خود ہی اس قبر میں دھکیل دیا ہے۔ سپاہی نے ایک حقارت بھری نگاہ قیدی پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا...... پھر رُکا اور مڑ کر بولا...... اس دنیا میں سبھی چہروں پر نقاب اوڑھے پھرتے ہیں دیکھنے میں تو بہت

نیک اور شریف لگتا تھا مگر۔ تو نکلا شیطان...... دھم دھم کرتا وہ چلا گیا......

بڑی سنسنی خیز خبر تھی۔ شہر کا مشہور ڈاکٹر جیل میں ۔ اکلوتا بیٹا شمسان گھاٹ میں اور ماتا جی لاپتا......

کئی مہینے بیت گئے...... پولس ہار کر بیٹھ گئی...... ماتا جی کا سراغ نہیں ملا...... ندی کے کنارے مچھواروں کی بستی کے پاس نیا مندر دیکھ کر ارجن رک گیا۔ راموکو پہچان کر بولا...... اس مندر کی ماتا جی کا نام تو بتا...... وہ ہولے سے بولا...... جگت ماں جی...... باپو اپنی ماتا جی کا نام کون لیتا ہے آپ اپنی اور میری ماتا جی کو کیسے بھول گئے ۔ ان کی وجہ سے ہی آج ہمارا گاؤں آباد ہے......

ارجن سن کر حیران رہ گیا...... سوال کیا...... ماتا جی یہاں کب اور کیسے پہنچیں......

راموبولا...... تاریخ اور مہینہ تو میں بھول گیا...... جس روز بہت بھیانک زلزلہ آیا تھا۔ دھرتی اس بری طرح کانپی تھی جیسے پھٹ جائے گی اور ہم سب کو نگل جائے گی۔ کسی مچھوارے نے ماتا جی کو دریا میں اترتے دیکھا تو چلایا بھی تھا۔ لوگ انہیں دریا سے نکال تو لائے مگر بچانہ سکے۔ سب کی ایک ہی رائے تھی کہ اپنی دیوی جیسی ماتا جی کا بوڈی پولس والوں کو نہیں دیں گے۔ پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دیں گے...... ماتا جی جیسی دیالو کے نام سے اپنی بستی میں مندر بنائیں گے...... اگراُن کا ہاتھ ہمارے سروں پر نہ ہوتا تو ہماری بستی دوبارہ نہ بستی...... کسی کے پاس کشتیاں اور جال نہ ہوتے...... روزگار نہ ہوتا۔ ہم سب بھوکے مرجاتے، رامونے پرانی حویلی کا حال پوچھا...... تو ارجن دُکھ سے ماتھا پکڑ کر بولا...... اکثر سونے سے پہلے ان بیتے دنوں کی یاد آجاتی ہے تو دل پھٹ جاتا ہے۔ کتنے بے فکرے تھے ہم...... لگتا تھا اپنے سگے ماں باپ کے ساتھ رہ رہے ہوں۔ بہار ہی بہار تھی ۔ مگر موسم بہار میں چمن لٹ گیا...... چمن میں بسنے والے سب چل بسے...... رہ گئے تو ٹوٹے کواڑ اور کھڑکیاں...... اب کوئی ایک دیا جلانے والا بھی نہیں رہ گیا...... اندھکار چھا گیا ہے۔ کبھی کبھی میں ہی جھانک لیتا ہوں اور اپنے مالکوں کے مقدر پر رو پڑتا ہوں......

مکمل خاموشی چھاگئی...... راموا ور ارجن کے آنسو بہتے رہے...... اور دریا کی شوریدہ لہریں مندر کی سیڑھیوں سے ٹکراتی رہیں......

☆☆☆

ناسمجھ

میں رو رہی تھی اور میرے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا...... حیرانی تو یہ تھی کہ میرے والدین جو میرا اُداس چہرہ دیکھ کر ہی پریشان ہو جاتے تھے آج خاموشی سے بیٹھے میرا چہرہ تاک رہے تھے...... آج اچانک سب کچھ بدل گیا تھا...... مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ آناً فاناً میرا رشتہ کیسے طے ہو گیا تھا......

ممی نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا شادی تو ایک دن ہر لڑکی کی ہونی ہی ہوتی ہے...... اشونی پڑھا لکھا شریف لڑکا ہے...... دنیا میں اس کا اور کوئی نہیں ہے...... دولت بے انتہا ہے...... راج کرو گی...... وہ خود ہمارے دروازے آیا تھا...... میں سن کر غصے میں تلملا اٹھی...... ممی ابھی تو میری عمر پڑھنے لکھنے اور آگے بڑھنے کی ہے...... کل تک تو آپ کا کہنا تھا کہ اس ترقی یافتہ دور میں ہر لڑکی کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری ہے۔ یہ اچانک آپ کے خیالات کیسے بدل گئے...... میں نے ٹاپ کیا ہے۔ مجھے آگے پڑھنا ہے...... پہلے مجھے کسی قابل تو ہونے دیں۔ آج کل چودہ سال کی لڑکی کی شادی کرنا تو جرم ہے۔ ماں سنتی رہیں۔ بولی کچھ نہیں...... پاپا بیمار تھے۔ بولے ہم اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے اچھا ہی سوچیں گے...... اُن کی آواز میں دُکھ گھلا تھا۔ ان کے سامنے میں چاہ کر بھی احتجاج نہ کر سکی......

اس کاروباری دنیا میں آج کل شادی بھی ایک بڑا کاروباری معاملہ بن گیا ہے...... اشونی کو بس میری طلب تھی...... جہیز لینے سے انکار کر کے اس نے اپنی شرافت کا مزید مظاہرہ کر ڈالا...... دلہن بن کر جب اشونی کے گھر پہنچی تو وہاں کے پُرمسرت ماحول میں ایک میں ہی اشک بار تھی...... میری سہیلیاں زور زور سے قہقہے لگا رہی تھیں...... تمہارا دمکتا ہوا روپ دیکھ کر اشونی کے ہوش اڑ جائیں گے۔ قدم چومے گا تمہارے...... میری تو جان پر بنی تھی۔ ان کے شوخ فقرے اور جان جلا گئے......

کافی دیر کے بعد کسی نے آ کر سہیلیوں کو کمرے سے باہر نکال دیا تو میں نے سکون کی سانس لی...... میرا جسم تھکن سے چور تھا اور بہت ڈری ہوئی تھی کہ اب نہ جانے کیا ہوگا...... میں نے اپنا سر تکیہ پر رکھ کر پلکیں موند لیں...... نہ جانے کب آنکھ لگ گئی...... آنکھ کھلی تو اشونی کو عین سامنے بیٹھا دیکھ کر دہشت سے میرا دل زور زور سے دھڑدھڑانے لگا...... میں ڈر سے اچھل ہی پڑی۔ وہ کچھ کچھ بولے جا رہے تھے اور میرا

حیا اور گھبراہٹ سے برا حال ہو رہا تھا...... بھلا مجھے ایسی باتیں کرنی کہاں آتی تھیں...... پاس رکھا پانی کا گلاس اٹھایا اور گٹا گٹ پورا گلاس خالی کر دیا...... آنسو رخساروں پر بہہ نکلے...... وہ اور قریب آئے۔ میرے آنسو پونچھتے ہوئے بولے...... آپ جانتی ہیں آج ہماری سہاگ رات ہے۔ ہمارے جاگنے کی رات...... میں بے تحاشہ گھبرا گئی...... آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ ڈالیں...... مجھے نیند آ رہی ہے...... میں سونا چاہتی ہوں۔......

مجھے اپنا گھر شدت سے یاد آ رہا تھا...... جہاں میری حکمرانی تھی...... یہاں اس کمرے میں قید کر کے یہ انجانا شخص مجھ پر حکمرانی جتا رہا ہے...... وہ میرے بالکل قریب آ گئے...... میرے کانپتے ہاتھوں کو تھام کر اپنے لبوں تک لے گئے...... میں نے آپ کی ممی سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی ناز پروردہ بیٹی کو بڑا سنبھال کر رکھوں گا...... آپ میرا ارمان...... میری محبت ہیں...... سن کر میرے رہے سہے حواس بھی گم ہو گئے...... چھم چھم آنسو برس ہی رہے تھے۔ میں نے معصومیت بھری آواز میں کہا میں تو آپ کو جانتی بھی نہیں...... آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کہیے۔ وہ ہنسے...... اب تو زندگی بھر کا ساتھ ہے ناراض نہ ہوں...... ہم آپ کے دوست بھی ہیں...... یہ سن کر مجھے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ میں نے کہا میرے ساتھ سراسر زیادتی ہوئی ہے۔ زبردستی میری شادی کی گئی ہے۔ کاش آپ انکار کر دیتے تو میرا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہو جاتا...... مجھے ان کی طرف سے تھوڑی سی ہمدردی کی امید ہو چلی تھی...... اس کے بجائے وہ بڑی خوش دلی سے ہنسے مجھے ان کی ہنسی زہر لگ رہی تھی......

میرے لرزتے بدن کو انہوں نے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا...... میں سسک کر رہ گئی...... بولی...... مجھے میری ممی کے پاس جانا ہے...... ابھی...... اسی وقت...... میرا دل بہت پریشان ہے...... انہوں نے میری پیشانی چوم کر کہا...... آج تو اپنے اس نادان دل کو سنبھالیے...... خوشیوں کے موسم میں گھبرانے سے کام نہیں چلے گا...... نہ جانے وہ اور کیا کیا کہتے رہے میرے پلے کچھ بھی نہ پڑا...... میں نے کہا میری عمر تو کھیل کود اور پڑھائی کی ہے۔ مجھے آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی...... بولے ہم آپ کو الفت کے سارے سبق پڑھا دیں گے...... وہ سارے لحاظ بھولتے جا رہے تھے...... اچانک حقیقتیں سامنے آئیں۔...... آہستہ آہستہ سارے پردے اٹھتے گئے...... میں خوف و ہراس سے تھر تھر کانپتی رہی...... لب بستہ حیران حیران سب سہتی رہتی...... میری ایک نہ سنی...... ان کا کٹھور پن اسی رات پر ختم نہیں ہوا...... بہت

سی راتیں اور دن ایسے ہی بیتے...... مجھے انکا ساتھ...... ان کے انداز اور اطوار بہت ہی نا گوار گذرے...... میں چھپ چھپ کر گھٹ گھٹ کر روتی...... ایک عجب سی دہشت اور تاریکی میرے اندر چھا گئی تھی...... شاید اچانک سارے سپنے ٹوٹ جائیں تو انسان اسی طرح بے جان سا ہو جاتا ہے......

ایک رات میں سو رہی تھی...... میرا بازو پکڑ کر بٹھا دیا...... ان کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا میں تو سانس ہی لینا بھول گئی...... ڈر کر سمٹ کر بیٹھ گئی...... زور سے بولے آپ کی بے حسی اور بے اعتنائیوں سے میں دل برداشتہ ہو گیا ہوں...... آپ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی کھوئی اور گم سم سی رہتی ہیں...... میں ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ تاکتی رہی...... بولی آپ پھر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں...... آپ نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے...... یہ سنگ دلی ٹھیک نہیں...... مجھے میرے گھر جانے دیں...... وہ پاس ہی کھڑے تھے۔ایک زنائے کا تھپڑ میرے گال پر جما دیا...... آئندہ یاد رکھئے...... آپ میری بیوی ہیں...... یہ قید خانہ نہیں آپ کا گھر ہے...... میں گھنٹوں تکیہ میں منہ چھپائے روتی رہی...... میری سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے اور کیوں بات بات پر چراغ پا ہو جاتے تھے...... اکثر وہ مجھے مارنے بھی لگے تھے۔میں انہیں دیکھتے ہی لرزنے لگتی...... ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت مجھ میں نہ رہی تھی......

ان گذرے سالوں میں میری زندگی میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ایک دن میں ریل سے سفر کر رہی تھی...... اور بیتی زندگی کو سوچ رہی تھی...... کتنا طویل تھا یہ عرصہ...... کب میرے غموں کی مدت ختم ہوگی کھٹا کھٹ...... کھٹا کھٹ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی...... میرا دل بہت ہی زیادہ بے چین اور افسردہ تھا اچانک دروازہ کھلا...... میری نظر ان پر پڑی تو میں بری طرح چونکی...... آج اتنی بے قراریوں اور وحشت بھرے لمبے انتظار کے بعد اُس دشمن جان کو اپنے قریب دیکھ کر میرے حواس گم ہونے لگے تھے۔ برسوں کے بعد ہمارا یوں اچانک ملنا بڑی حیرت کی بات تو تھی ہی...... میں نے سر پر آنچل ڈال کر رخ موڑ کر کتاب کھول لی......

میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔سوچا جا کر باہر دوسری سیٹ پر بیٹھ جاؤں...... انہوں نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ ہی بند کر دیا...... اب میرا فرار ہونے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔آج مدتوں کے بعد وہ تھے...... میں تھی۔ اور ایک شور مچاتا سناٹا...... اب کیا ہوگا...... میں گھبرا گئی......

شاید میرے اندرونی دکھوں کے نشان میرے چہرے پر ابھر آئے تھے...... نرمی سے

بولے...... ''مجھے اچانک دیکھ کر آپ پریشان ہوگئی ہیں...... یقین کریں...... آپ سے ملنے کا صرف سوچا ہی نہیں تھا دل سے چاہا تھا کہ زندگی میں ایک بار آپ کو دل بھر کے دیکھ لوں...... آج قسمت مہربان ہوگئی اور مجھے سید ھا جنت میں لے آئی'' ان کے لہجے میں محبت کی خوشبو تھی جو میرے اندر تک پھیلتی چلی گئی...... کچھ دیر خاموشی چھائی رہی......

''آپ کیسی ہیں؟...... میرا دل تھم سا گیا...... اس سوال کی بھلا کیا ضرورت تھی...... میرے کہے بنا کیا مجھ بدنصیب کا حال یہ سمجھ نہیں سکتے تھے...... میں ڈرتی تھی گر ناراض ہو گئے تو بات بننے کے بجائے اور بگڑ جائے گی۔ ساحل کے قریب تھی...... کنارہ نہ ملا تو ڈوب جاؤنگی...... سو کہہ دیا...... ''زندہ ہوں''......

سوچتی رہی یہ وہی خود غرض انسان ہے جس نے بنا کسی جرم کے مجھے زندگی بھر کی تنہائی کی سزا دی ہے ہمیشہ مجھے ہی خطاوار سمجھتا تھا...... میرے درد سمجھنے سے قاصر تھا......

قدرے توقف کے بعد بولے...... ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جہاں ہم دونوں رکے تھے اور جس موڑ پر جدا ہو گئے تھے...... اسے کچھ دیر کے لئے بھول جائیں'' میں برداشت نہ کر سکی...... بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ شاید آپ نے سب کچھ بھلا دیا ہے...... ایک بدنصیب ماں سے اگر خوابوں اور یادوں کی دنیا بھی چھن جائے تو پھر اس کے لئے زندہ رہنے کو باقی ہی کیا رہ جائے گا...... رُکے تو آپ تھے...... جس موڑ پر آپ نے مجھے تنہا چھوڑا اس موڑ سے میری بدنصیبی کے سفر کا آغاز ہوا...... بے گھر بے سائبان صحرا صحرا بھٹک رہی ہوں...... نہ کوئی گھنے پیڑ کی چھاؤں ہے نہ کوئی دیوار ہے کہ دو پل رک کر آرام کی سانس بھی لے سکوں......''

کاش انہوں نے یہ سب پہلے سوچا ہوتا...... میرے بابو جی کے مشوروں پر دھیان دیا ہوتا تو آج ہمارے راستے جدا جدا نہ ہوتے...... شاید ولایت میں رہائش کا اثر تھا......

''اُترا''...... ان کے ہونٹوں پر میرا نام جو آیا تو میرے جسم میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی...... اُن کی آواز میں اتنی اپنائیت تھی...... اتنا پیار تھا کہ میرے اندر کا ابلتا الاؤ سرد پڑ گیا...... ''اُترا''...... انہوں نے دوبار پکارا...... میں بے خودی ہوگئی...... تمہیں یاد تو ہوگا ہمارے درمیان بھی پیار کا رشتہ تھا حالانکہ وہ یک طرفہ ہی تھا۔ آپ کو تو مجھ سے کراہیت تھی...... نفرت تھی...... سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں دلوں کے رشتے ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ اس طرح اتفاقاً ہمارے ملنے میں بھی ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ تب میں نے

پہلی باران کی طرف نگاہیں اُٹھا کر دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئی...... ان کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں...... وہی پیغام دے رہی تھیں جسے میں اٹھارہ سال پہلے سمجھ نہ پائی تھی۔ ان کے چہرے پر اب وہ رونق نہ تھی...... اجڑے اجڑے...... اداس سے نظر آرہے تھے...... آنکھوں کی وہ چمک کہاں چلی گئی تھی...... مجھے ان کے سوال کا جواب تو دینا ہی تھا......

''آپ اپنے اس جارحانہ رویہ کو پیار کا نام دے کر محبت کی توہین کر رہے ہیں...... محبت کرنے والے دل تو بڑے مہربان ہوتے ہیں...... اگر وہ آپ کا پیار تھا تو آپ کی نفرت کتنی وحشت ناک ہوتی'' میری پلکیں خود بخود جھک گئی تھیں...... میرا لہجہ تلخ تھا......

شاید وہ کڑوا سچ برداشت نہ کر سکے۔ کافی دیر خاموش ہی بیٹھے رہے۔ پھر نرمی سے مخاطب ہوئے''میں نے اپنے سے بڑھ کر آپ کو چاہا تھا...... اترا آج مجھ پر بس اتنا احسان کردو کہ اپنے دل سے خفگی...... غصہ اور نفرت نکال دو...... ہمارا ساتھ کچھ گھنٹوں ہی کا ہے...... مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں...... ایسا نہ ہو یہ انمول وقت ہاتھوں سے نکل جائے اور ہم آگے بھی پچھتاتے ہی رہ جائیں۔ان کی عاجزی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ضرور میری بیٹی ہی کے بارے میں کچھ کہیں گے۔ مجھے اپنی بیٹی کی بہت یاد آرہی تھی اور وہ اس کا ذکر ہی نہیں کر رہے تھے...... میں نے ڈرتے ڈرتے کہا...... ''عورت کی سب سے بڑی مجبوری یہی ہے...... شوہر کے ظلم سہتی ہے اور آخر میں مجرم بھی وہی گردانی جاتی ہے...... مرد اپنی غلطی کبھی نہیں مانتا...... واپسی کے سب راستے بند کر کے آپ لاپتہ ہوگئے......''

وہ سیٹ پر پرے ہٹ کر بیٹھ گئے...... مبہوت سے مجھے ہی تاکے جا رہے تھے۔میرا سوالوں سے گھبرا ذہن پریشان تھا...... میں اپنی بیٹی کا حال جاننے کے لئے حد درجہ بے قرار تھی...... مجھے اس کی تلاش ہی بار بار ہندوستان کھینچ لاتی تھی۔ میں وہ بدنصیب ماں تھی جس کو اپنی اکلوتی بیٹی کا نام تک معلوم نہ تھا۔میرے ہونٹ کانپ رہے تھے۔آخر میں نے ہی ان سے سوال کیا......

''وہ کیسی ہے''

انہوں نے ایک گہری سانس لی...... کچھ رُک کر سخت طنزیہ لہجے میں بولے...... ''آپ میری بیٹی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں'' ...... اس ظالم شخص نے ہزاروں سیخیں ایک ساتھ میرے دل میں ٹھوک دیں...... درد اتنی شدت کا تھا کہ میں چیخ اٹھی...... ''اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے...... وہ

میری بھی بیٹی ہے''...... اف میرے خدا یہ تو بات بات پر مجھے آزمارہے تھے...... محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں...... پھر میری بے قراری بھی نہیں سمجھتے...... مجھے اپنی ناؤ ڈوبتی سی نظر آنے لگی تھی...... اتنے ہی میں چائے آ گئی...... انہوں نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی...... میں ان کے ہاتھ غور سے دیکھتی رہی...... بہت کوشش کے باوجود میرا ہاتھ آگے نہ بڑھ سکا......

میں نے کہا''سوچ رہی ہوں یہ ہاتھ مجھے...... کچھ دے بھی سکتے ہیں...... آپ بھول گئے یہی وہ زور آور ہاتھ ہیں جنہوں نے میری دس دن کی دودھ پیتی بچی میری چھاتی سے جدا کر دی تھی...... وہ بھوک سے تڑپ رہی تھی...... بس اسی لمحے سے میرے دل میں ایک انگارہ سا سلگ رہا ہے...... کسی طرح چین نہیں آتا......

وہ نظریں اٹھا کر بولے''جو بیت چکا سو بیت چکا......اور بیتے کو بھلا دینا ہی بہتر ہے کیونکہ اب اس کا مداوا میرے پاس نہیں۔ پیالی پھر آگے بڑھا دی...... ''آپ کی بیٹی اچھی ہے...... اس کا نام آشا ہے...... ''میرے بے سکون دل کو تھوڑا سا سکون ملا''اب تو چائے پی لیں''...... آپ کی بیٹی اچھی ہے...... اس انداز میں کہا جیسے کسی روٹھے بچے کو منا رہے ہوں...... ''آپ میری معمولی سی تند مزاجی سے گھبرا گئی تھیں...... مانا آپ کو مجھ سے نفرت تھی...... ناراضگی مجھ سے تھی...... مگر بچی تو آپ کی تھی...... میرے لئے نہ سہی اپنی بیٹی کے خاطر آپ کو اپنے گھر واپس آنا ضروری تھا...... میں تو آج تک آپ کا انتظار ہی کرتا آرہا ہوں خیر جس شخص نے نہ کبھی کسی سے پیار کیا ہو اور نہ ہی کسی کا انتظار کیا ہو وہ کیا جانے ہجر کا ہر پل عذاب ہوتا ہے۔......

ان سے بحث کرنا فضول تھا...... وہ تو مجھے ہی مجرم ٹھہرا رہے تھے۔اپنی غلطی ماننے کو تیار ہی نہ تھے...... میں نے پھر سوال کیا...... ''میری بیٹی اپنی ماں کو یاد تو کرتی ہوگی''...... ان کا چہرہ سرخ ہو گیا...... ماتھے پر بل پڑ گئے...... میرا دم حلق میں ہی اٹک گیا...... بولے...... جس بچی نے اپنی ماں کو کبھی دیکھا ہی نہ ہو وہ کیا جانے ماں کیا ہوتی ہے...... میں نے آپ کا ذکر اس کے سامنے کبھی نہیں کیا...... میرے لئے اس کو بتانا مشکل تھا کہ اس کی ماں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔وہ''ماں''جیسے خوبصورت لفظ سے نا آشنا ہے......

ان کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا...... اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ گئے تھے...... میرے اندر برسوں کا لاوا ابل پڑا...... کتنے کٹھور انسان ہیں آپ...... آپ کو اندازہ نہیں آپ نے ایک معصوم بچی پر کتنا

ظلم ڈھایا ہے...... مجھے تباہ کر کے آپ کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا...... آپ نے میری بچی کی خوشیاں بھی چھین لیں......''

جن آنسوؤں کو میں دیر سے پلکوں میں چھپائے بیٹھی تھی بادل کی طرح برس پڑے...... نہیں...... اُترا نہیں...... ایسا نہ کہو...... میں نے تم سے کبھی نفرت نہیں کی...... یہ سچ ہے اس وقت تم نا سمجھ تھیں اب تو سمجھ گئی ہوگی کہ ریشمی دھاگوں سے بندھے دل کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے...... کیا ابھی تک آپ کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا......

میں سرتاپا لرز گئی...... نہ جانے اب اور کون سا نیا الزام میرے سر دھریں گے...... میری آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بولے...... کاش اس وقت تم نے اسی طرح سب کچھ کہا ہوتا...... شکوے اور شکایتیں کی ہوتیں...... اسی انداز میں لڑتیں...... جھگڑتیں...... بگڑتیں اور میں تمہیں مناتا......'' ان کا ایک ایک لفظ میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ ابھی میں سنبھلی بھی نہ تھی وہ بولے......'' آپ کی بیٹی بھی ہو بہو آپ جیسی ہی ہے۔ ایسا ہی پھول جیسا چہرہ...... یہی رنگ روپ...... میں نے سوچا ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا...... لیکن یہ وہ شخص تھا جس نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت بھی کی تھی...... یہ اور بات تھی کہ اس وقت میں الہڑ تھی...... میرے دل کے در نہیں کھلے تھے...... نہ دل میں کوئی امنگ تھی نہ کوئی حسین جذبہ تھا...... لیکن اب...... ان کی ایک ایک ادا مجھے مسحور کر رہی تھی۔ ایک ایک لفظ میرے اندر خوشیاں برسا گیا تھا......

'' آپ کی بیٹی کو بھی ڈاکٹر بننے کا جنون ہے''...... ''اور آپ کو اعتراض ہے'' میں نے کہا...... وہ بنا توقف بولے......'' ہاں...... خوبصورت لڑکیوں کو جلد ہی ان کے ٹھکانے لگانا بہتر ہوتا ہے......

میرے اندر باہر دھواں ہی دھواں پھیل گیا...... میں نے کہا......'' آپ دیکھ چکے ہیں جب آنکھوں میں سمائے سپنے بکھرتے ہیں تو ساتھ کتنے ہی دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں...... کئی زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں...... آپ اس کے خوابوں کو مسمار نہ کر دینا...... ڈاکٹر نے میرے پاپا کو ان کی مہلک بیماری کی خبر دی تھی۔ سو میری شادی انہیں مجبوراً کرنی پڑی تھی...... میری طرف دیکھ کر جواب دیں...... جس مقام پر آج میں ہوں کیا وہ میرا اصلی ٹھکانہ ہے...... بولئے...... چپ کیوں ہیں...... بتایئے کہاں ہے میرا ٹھکانا...... کہاں ہے میرا گھر؟......

وہ خاموش تھے...... میں بتاتی ہوں آپ کو......'' عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا...... اس کا کوئی

ٹھکانہ نہیں ہوتا وہ تو صرف مردوں کے رحم وکرم پر جیتی ہے...... آپ کو میری بیٹی کی زندگی کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کرنا ہوگا...... اگر میں اس وقت سمجھدار ہوتی...... کسی قابل ہوتی تو میرا یہ حشر نہ ہوتا...... کچی کلی شاخ سے الگ ہوکر چٹکتی نہیں...... مرجھا کر سوکھ جاتی ہے...... پھول بن کر مہکتی نہیں...... کچی عمر کی لڑکی بھی کلی کی مانند نازک بدن ہوتی ہے...... وہ توڑ پھوڑ سہہ نہیں سکتی'' میں پاگل سی ہوئی جارہی تھی...... پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... بے اختیاری میں ان کا ہاتھ میرے چہرے تک بڑھا اور رک گیا...... سر ندامت سے جھک گیا...... وہ چپ بیٹھے رہ گئے......

کچھ دیر بعد جیسے کسی گہری سوچ سے جاگے ہوں...... اُترا پلیز رونا بند کردو...... اب نہ روٹھ جانا...... ایک بار اس طرح روٹھی تھیں کہ لوٹ کر ہی نہیں آئیں...... میں نے حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا...... اس دنیا میں عورت کی حیثیت اور مقام ہی کیا ہے...... وہ اپنی زندگی کا فیصلہ کب کرسکتی ہے...... میری رائے کی کسی نے پرواہ نہیں کی...... آپ نے طلاق کا نوٹس بھیج دیا...... میں تو مردہ سی ہوگئی تھی......

جب مجھے معلوم ہوا میں ماں بننے والی ہوں میں بہت ڈر گئی...... میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگیا تھا ڈاکٹر اور ماں نے مجھے بہت سمجھایا...... میرے اور آپ کے رشتے کی اہمیت بتائی...... میں کچھ زیادہ سمجھ نہ پائی تھی...... پاپا آپ کو صرف سمجھانا چاہتے تھے...... وہ جانتے تھے ان کی زندگی کے دن کم ہی رہ گئے تھے...... آپ کی ظالمانہ حرکتوں نے ان کے اعتماد کو پارہ پارہ کردیا تھا...... ہر وقت ڈرتے تھے کہ مجھ پر کوئی اور بڑی آفت نہ آجائے انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ حالات اتنے سنگین ہوجائیں گے کہ میری واپسی کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند جائے گا'' ...... شدت جذبات سے میری آواز بھاری ہوگئی تھی......

جوں جوں بچہ میرے اندر بڑھتا گیا میری کچھ سمجھ میں آتا گیا کہ میرا اور آپ کا بڑا مضبوط رشتہ ہے...... کبھی نہ ٹوٹنے والا...... جیسے میری ممی اور ڈیڈی کا ہے...... میں بھی آپ کی راہ تکنے لگی تھی...... سوچتی تھی شاید آپ کا کوئی پیغام ہی آئے...... پاپا بستر مرگ پر تھے...... اس مشکل کے وقت بھی آپ نے ہماری خبر نہ لی تو سب پریشان ہوگئے...... لیکن وقت کسی کے لئے نہیں رکتا...... وہ دن بھی کسی نہ کسی طرح بیت گئے...... جب بچی پیدا ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ اب طوفان ٹھہر جائے گا...... آپ کے آنے کی خبر سنی تو میرا دل خوشی سے بھر گیا...... لیکن افسوس آپ تو خود طوفان بن کر آئے اور بیٹی کو ساتھ لے گئے...... میں بھی تو آپ کی تھی...... میرے بارے میں ایک بار بھی نہ سوچا کہ میں کیسے زندہ رہوں گی میں پکارتی ہی رہ گئی......

آپ نے مڑ کر بھی نہ دیکھا......اسی رات پاپا کا ہارٹ فیل ہو گیا......

سب کا خیال تھا یک طرفہ فیصلہ کر کے آپ عدالت سے طلاق حاصل کر لیں گے......اس عمر میں حق وصول کرنا تو دور کی بات تھی مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ میرا حق کیا ہے......یوں بھی دنیا کے سارے قوانین اور آئین مردوں کے حق میں بنائے گئے ہیں......اگر لڑتی بھی تو کیا پاتی پاپا کہہ گئے تھے کہ ماضی کو پلٹ کر دیکھنے سے زندگی نہیں گزرے گی ہمیشہ آگے دیکھنا چاہیے پھر ماں مجھے آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لے آئیں......میں نے پڑھائی شروع کر دی کسی طرح جینے کے قابل ہو گئی ہوں...... اگر ماں نہ ہوتیں تو میں غموں میں ڈوب کر فنا ہو جاتی''......

میں نے انہیں کٹھن اٹھارہ سالوں کا قصہ سنا ڈالا......وہ تھوڑے دھیمے لیکن سخت لہجے میں بولے......''آپ کی بے مہری نے میری ساری امنگوں کو مردہ کر ڈالا تھا......پھر غصہ تو بھڑکنا ہی تھا...... دراصل ہماری عمروں میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آپ کو کس انداز میں سمجھاؤں......اب تو آپ سب کچھ سمجھتی ہیں......میرا مطلب ہے یہ تو سمجھ ہی گئی ہوں گی کہ مرد عادتاً اپنی محبت اور جذبوں کے معاملوں میں بڑے بے صبر ہوتے ہیں......اور محبت میں شکست کا غم انسان کو پاگل کر دیتا ہے......وہ دیوانگی کے عالم میں کچھ بھی کر بیٹھتا ہے اب سوچتا ہوں غلطی میری ہی تھی......آپ ناسمجھ تھیں......اگر میں ہی کچھ صبر اور تحمل سے پیش آتا تو آہستہ آہستہ آپ بھی سمجھ جاتیں اور حالات خوشگوار ہوتے......''

وہ پشیمان نظر آرہے تھے......شاید ان کا ضمیر انہیں جھنجھوڑ رہا تھا......اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ وقفہ کے بعد بولے......''انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے......اُترا......وقت انسان کو بدل دیتا ہے......تم سے الگ ہو کر مجھے بھی ایک پل چین نصیب نہ ہوا......میری زندگی بھی ایک کٹھن رہگذر تھی...... ہم تو تباہ ہی ہو گئے......اب آشا کے مستقبل کے لئے سوچنا ضروری ہے......میں نے آشا کو دنیا کی ہر نعمت دی وہ نہ دے سکا جو ایک ماں اپنی بیٹی کو دے سکتی ہے......میں اس کی شخصیت میں کچھ کمی محسوس کرتا ہوں......اُترا......کیا......آپ......اس کی خاطر''......

میں تو پتھر بنی بیٹھی ان کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی......کیا جواب دیتی......یہ تو میرے لئے اب غیر تھے......کچھ دیر کے بعد بولے......''اب فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے......میں'' اب دل کا مریض

ہوں۔ نہ جانے میری زندگی میں کب اندھیرا اُتر آئے......‘‘

میرا دل دھک سے ہو گیا...... وہ پھر بولے...... ’’اُترا...... آپ سے ایک التجا ہے...... میرے لئے کیا یہ سزا کم ہے کہ آپ سے دور رہ کر آپ سے محبت کرتا رہا‘‘...... ان کے لہجے میں درد تھا...... میں تاکتی ہی رہ گئی...... یہ کیا کہہ گئے تھے وہ...... اب تو مجھے بس ان کی بیماری کی فکر پریشان کر رہی تھی...... میں نے دھیرے سے کہا ’’اگر وہ مجھے ماں کہنے سے انکار کر دے...... وہ تو صرف یہ جانتی ہے کہ اس کی کوئی ماں نہیں...... اگر اس نے مجھے قبول نہ کیا تو......؟ ان کی نظر میں ایک گہری سوچ کا عکس اتر آیا...... بولے...... آشا کی ماں! آپ پریشان نہ ہوں میں سب سنبھال لوں گا! چہرے پر آسودہ تبسم لئے ہوئے ’’آپ بمبئی کس کام سے جا رہی ہیں‘‘...... ایک میڈیکل کانفرنس ہے...... میں نے دھیرے سے کہا...... وہ مسکرائے ’’مجھے خوشی ہے آپ کا خواب پورا ہو گیا‘‘...... اور حیرانی سے ساکت مجھے دیکھتے ہی رہ گئے......

میرے دل میں جلترنگ بج اٹھی تھی...... آشا کی ماں کہہ کر انہوں نے میری روح تک کو سرشار کر دیا تھا...... میں سوچ رہی تھی...... اب تک ان سے دور رہ کر کسی طرح جیتی رہی؟ اب ساتھ رہ کر مر ہی جاؤں گی...... اب طلاق کے بعد میں بے بس ہوں۔ عورت کتنی بھی عالم فاضل ہو جائے...... آخر ہتی تو عورت ہی ہے نہ جانے کب کوئی اُنگلی اُٹھائے......

کیوں ہوتی ہیں ایسی بے جوڑ بے تکی شادیاں...... ہمارے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی نہ تھی اور دونوں کی عمروں میں بھی کتنا لمبا فرق تھا...... وہ لندن سے پڑھ کر آئے تھے اور میں محض میٹرک پاس...... مجھے وہ بات یاد آ گئی...... ’’یہ تو سراپا نور ہیں‘‘...... اشونی آپ تو صرف میری خوبصورتی پر مرمٹے تھے۔ شادی نبھانے کے لئے صورت شکل سے زیادہ ایک دوسرے کے لئے عزت اور احترام ہونا ضروری ہوتا ہے...... اشونی میں تو باؤلی تھی...... مجھے آپ کی طرح دل موہ لینے والی باتیں کرنی کہاں آتی تھیں...... آپ مجھے وہ بولی سکھاتے...... مجھے محبت کے انداز سکھاتے...... مجھے نئی زندگی بخشتے...... آپ کی انا اور بدگمانی نے ہمارا آشیانہ پھونک ڈالا...... پر آپ کو تو مجھے چھونے کا بھی حق نہیں رہا‘‘......

سفر تمام ہوا...... ہم دونوں ہی عجیب سی بے قراری کے عالم میں تھے۔ ہمارا ساتھ کچھ منٹوں کا ہی اور تھا...... وہ گھڑی بھی آ پہنچی جس کا مجھے ڈر تھا...... وہ تو بالکل میرے قریب آ گئے...... اتنے قریب کہ میں سٹپٹا گئی...... دل میں ایک خواہش ہوئی کاش مجھے چھو کر کہہ دیں کہ ’’اترا تم میری ہو‘‘...... یا میرے خدا......

اب کیا ہوگا...... انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ اوپر اٹھایا...... میرے پورے وجود میں خوشیاں پھیل گئیں...... میری آنکھوں میں غور سے دیکھ کر بولے ''اُترا...... مجھے تو دوریاں بھی آپ سے دور نہ کرسکیں...... آپ کے تصور نے ہی تو آج تک زندہ رکھا ہے...... تنہائیوں میں۔ بزنس اور زندگی کے ہزاروں ہنگاموں میں آپ ہر وقت میرے ساتھ رہیں جو تن من میں بسا ہو اس سے رشتہ کیسے توڑا جا سکتا ہے...... صرف دھمکانے اور انتقام لینے کی غرض سے نوٹس بھیجا تھا...... بخدا آپ کو چھوڑنے کا مقصد ہرگز نہ تھا...... طلاق نامہ تو کبھی تھا ہی نہیں...... آپ ہماری تھیں ہماری ہیں...... اور ہم آپ کے ہیں''...... میں تو اپنا آپا ہی بھول گئی...... جو کچھ کہنا چاہتی تھی دل کا دل ہی میں رہ گیا...... میں تیزی سے باہر نکلی...... وہ میری حیات کا مقصد بتا کر شکستہ قدموں سے آگے بڑھ گئے تھے...... دل شدت سے چاہ رہا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے دوڑ جاؤں......

کسی کی پکار پر رکی...... میں مڑی...... کچھ ڈاکٹر مجھے ریسیو کرنے آئے تھے...... مجبوراً مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔ ہوٹل کے کمرے میں دیر تک بیٹھی سوچتی ہی رہی...... انہوں نے مجھ سے جینے کی ساری امنگیں چھین لی تھیں اور آج اپنی محبت کا اعتماد دے کر ایک نئی زندگی بخشی تھی...... آشا سے ملنے کو دل ترس رہا تھا۔ نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی...... میں ماضی کو بھول جانا چاہی تھی۔ آج اٹھارہ برسوں کے بعد بس یہ سوچنا چاہتی تھی کہ قصوروار وہ بھی نہ تھے...... بس بات اتنی سی تھی کہ وہ سمجھ نہ سکے کہ میں واقعی نادان اور الھڑ سی لڑکی تھی......

دوسرے دن میں نے کانفرنس میں پیپر پڑھا۔ جو بہت سراہا گیا...... ٹی وی پر انٹرویو بھی اچھا ہوا تھا میں کمرے میں سوئی...... اسی وقت فون کی گھنٹی بجی...... اجنبی آواز سن کر میں ہڑبڑا گئی...... ڈاکٹر اُترا آپ کے لئے باہر گاڑی کھڑی ہے...... جلد سے جلد اسپتال پہنچیں...... ایمرجنسی ہے...... مسٹر اشونی کمار کے ہارٹ کا آپریشن ابھی کرنا ہوگا...... میرے سر پر تو آسمان آگرا...... جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی...... میں اپنی ساری ہمتیں اکٹھا کر کے تیزی سے باہر نکل گئی......

میں بہت فکر مند تھی...... دل کی گہرائیوں سے ان کی درازئ عمر کی دعائیں مانگ رہی تھی...... میرے ڈرے ہوئے زرد چہرے پر نظر ڈال کر پاس والے ڈاکٹر نے سوال کیا...... ''کیا آپ مسٹر اشونی کمار کو جانتی ہیں'' اس کی آواز پر میں نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا اور صرف اثبات میں سر ہلا دیا...... گاڑی

پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی...... ڈاکٹروں میں گھری تیز تیز قدم اٹھاتی آپریشن روم میں پہنچی...... میرا پورا دھیان آپریشن میں تھا...... اشونی کو زندہ رہنا ہی ہوگا...... میرے لئے...... ہماری بیٹی کے لئے......

آپریشن کر کے جب باہر آئی تو میری آنکھیں آشا کو ڈھونڈ رہی تھیں...... وہ سامنے ہی کھڑی تھی...... بالکل میرے جیسی تھی...... وہ...... اسے دیکھتے ہی میری روح سیراب ہوگئی...... وہ میری جانب دوڑ کر آئی اور مجھ سے لپٹ گئی...... ''ماں''...... اس ایک لفظ کو سننے کے لئے میں سترہ سال سے تڑپ رہی تھی...... کتنی شیرینی تھی اس لفظ میں اور میری بیٹی کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ یہ ایک لفظ ایک ماں کے اندر سلگتے انگاروں پر شبنم کی بوندوں کی طرح برسا اور برسوں کی دہکتی آگ بجھ گئی...... جو موتی میں نے برسوں سے اپنے دل میں اکٹھا کئے تھے آنسو بن کر میری بچی کے چہرے پر بکھر گئے...... میں نے کہا...... بیٹا تمہارے پاپا بالکل ٹھیک ہیں...... شکر ہے اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جگنو چمک اٹھے...... وہ سسک کر بولی...... ''ماں'' اب آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتیں...... ہم اکٹھے رہیں گے...... ساتھ ساتھ...... پاپا بہت کمزور انسان ہیں...... حالات سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں...... انہوں نے کبھی میرے سامنے آپ کا ذکر نہیں کیا...... میں نے بھی ان سے کبھی سوال نہیں کیا...... مگر میں نے پاپا کو اکثر آپ کی تصویر کے سامنے راتوں کو آنسو بہاتے دیکھا ہے...... انہوں نے آپ سے جدا ہو کر بہت غم جھیلے ہیں...... آپ کے بغیر ہماری دنیا بالکل اندھیری تھی...... ماں آپ پاپا کو معاف کر دیں......

میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے خوب چوما...... میں سوچ رہی تھی میرا خواب تو پورا ہو گیا...... اب کیا مجھے اشونی کے ادھورے خواب پورے کرنے ہیں......

☆☆☆

تاریک راستے

مانوی کتنے ہی رشتے ٹھکرا چکی تھی۔ ماں کے سمجھانے پر بولی...... تم نے شادی کر کے کیا پایا...... بس زندگی بھر کی قید اور غلامی...... تم چاہتی ہو کہ میرا حال بھی تمہارے جیسا ہی ہو......؟ ماں نے باپ کو ہی قصوروار ٹھہرایا...... بولیں...... یہ سب تمہاری آزاد خیالی کا ہی نتیجہ ہے...... میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ لڑکی کو اتنی آزادی نہ دو...... تم ہمیشہ ساری بندشوں کو ہیچ سمجھتے آئے ہو...... اب سنبھالو اپنی بیٹی کو...... میں کہتی ہوں اس کی جلدی سے شادی کر دو...... ورنہ......

دروازے پر اچانک بیل بج اٹھی...... اور بات ادھوری ہی رہ گئی...... سامنے آئی۔ آئی۔ ٹی دہلی کالج کے حسین اور ذہین نوجوان شری ناتھ کو دیکھ کر ماں کے دل میں اُس کو داماد بنانے کی آرزو اُمڈ آئی۔ پروفیسر کمار بھی یہی چاہتے تھے۔ خوب جانتے تھے کہ شری ناتھ کا مستقبل درخشاں ہے۔ بیٹی خوش رہے گی۔ انہوں نے کئی بار مانوی اور شری ناتھ کو باتیں کرتے بھی دیکھا تھا......

ماں نے شادی کا ذکر کیا تو مانوی نے پھر انکار کر دیا...... وہ تو کسی سے بھی شادی کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ پھر سے بولی...... اماں...... وہ چندر ہے نا...... ماں نے ایک بار پھر سمجھایا...... اُس کا نام بھی مت لینا...... میں نے تیرے پتا جی سے اُس کے بارے میں بات کی تھی۔ لیکن وہ کسی بھی حال میں راضی نہیں ہوئے......

کالج میں اس کی سہیلیاں کہتیں...... تیرے دل کا شہزادہ ضرور کسی دور دراز ملک سے آئے گا۔ تو اُس کا چہرہ اداس ہو جاتا...... اُسے بے پناہ تشنگی کا احساس ہونے لگتا...... اور وہ سوچنے لگتی...... کیا وہ بھی میرے لئے اسی طرح بے چین و بے قرار ہے۔؟...... یا وہ مجھے بھول گیا......؟...... وہ آتا کیوں نہیں۔ نہ کوئی خط...... نہ کوئی پیغام اپنے اُمڈتے آنسوؤں کو پلکوں کے جھروکوں میں چھپا کر کہتی...... میرے خوابوں کا شہزادہ تو میرے چھوٹے سے گاؤں میں سمندر کے کنارے میرا انتظار کر رہا ہے...... اور تمام سہیلیاں اُس کی باتیں سن کر بے ساختہ ہنس پڑتیں...... برسوں کے بعد پروفیسر کمار اور اُن کی پتنی کو اپنے گھر میں دیکھ کر شری ناتھ کی ماں کچھ گھبرا سی گئیں...... جب انہوں نے رشتے کی بات کی تو بجائے خوش ہونے کے بوکھلا سی

گئیں...... اور کافی دیر سوچنے کے بعد بولیں...... آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل کے بچے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ شادی کے معاملہ میں شری ناتھ کی مرضی معلوم کرنا بہت ضروری ہے......

وہ دونوں تو چلے گئے۔ لیکن شری ناتھ کی ماں کو الجھنوں میں ڈال گئے۔ وہ اس رشتے سے بالکل خوش نہیں تھیں۔ کئی دن سوچتے سوچتے گذر گئے...... جب سارا قصہ شری ناتھ کو سنایا تو وہ ماں کے قریب آ کر بولا...... اماں...... جوان لڑکیوں کے والدین زیادہ دن تک انتظار نہیں کرتے۔ تم سوچتی ہی رہ جاؤ گی...... اور وہ اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں اور طے کریں گے...... ایسے رشتے بار بار نہیں ملتے...... پروفیسر کے زیر سایہ میرا آنے والا کل نہایت روشن اور تابناک ہو جائے گا...... ماں ذرا سوچ کر بولیں...... پروفیسر نے بہت سوچ سمجھ کر ہمارے سامنے ہاتھ بڑھایا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اپنی عقل اور فہم پر شک ہے...... اور اگر تمہیں اپنے اندر کچھ کمی محسوس ہوتی ہے تو محنت کرو اور بھگوان سے مانگو...... جو سب کا داتا ہے۔ مانا کہ پروفیسر ذہین تھے...... لیکن ہمارے گاؤں سے یونیورسٹی کا یہ لمبا تعلیمی سفر اُن کے سسر کی مالی امداد کے بغیر ناممکن تھا۔ پڑھ لکھ گیا گئے...... اب بیوی کو جاہل سمجھتے ہیں...... بچے بھی ماں کی عزت نہیں کرتے۔ گھر میں بیچاری کی حیثیت ایک نوکرانی جیسی ہے۔ مانوی اپنی ماں کی طرح سادہ مزاج نہیں ہے۔ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ بھی نہیں ہے جو لوگ اپنے ہی لوگوں کی قدر نہیں کرتے ان سے رشتہ جوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم اگر پروفیسر کے سہارے ترقی کی سیڑھیاں چڑھو گے تو ایک دن آئے گا جب تم مانوی کی نظروں میں گر جاؤ گے۔ اور وہ تم پر حاوی ہو جائے گی۔ مجھے تمہاری قابلیت پر ناز ہے۔ اپنی محنت سے ترقی کرو گے تو زندگی بھر سر اٹھا کر چلو گے...... دوسروں کے احسانوں کا بوجھ احساس کمتری میں اضافہ کر دیتا ہے۔ بڑی محبت سے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں...... ''میرے بیٹے...... میری بات مان لو...... اور یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا کہ تعلیم یہ نہیں سکھاتی کہ انسان اپنے سماجی۔ مذہبی اور اخلاقی اصولوں اور پابندیوں کو جو ہمیں آپس میں باندھے ہوئے ہیں بھول جائیں...... ''زندگی میں خوشحال رہنے کے لئے اُصولوں کی پابندیاں بہت ضروری ہیں۔ جو لوگ موسم کی طرح بدل جاتے ہیں۔ وہ اعتبار کے قابل نہیں ہوتے۔ پروفیسر نے کبھی اپنی کسی روایت کا احترام نہیں کیا...... تمہیں مانوی میں کیا پسند آ گیا...... نہ رنگ نہ روپ۔ سنا ہے بیحد مغرور اور سرکش لڑکی ہے

وہ ذرا سنبھل کر بولا...... اماں...... دراصل لوگ ان کی شہرت سے جلتے ہیں اور بلاوجہ ان پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ ماں...... یہ سب جھوٹ ہے...... ماں کے چہرے پر غصہ ابھر آیا...... وہ غصہ سے بولیں......

یہی تو غضب ہو گیا...... اس آزادی نے ہی ہمارے نوجوانوں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ شرم وحیا تو اس سرزمین سے اٹھ ہی گئی ہے۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں رہا...... اسی لئے گھر گھر میں جنگ چھڑی ہے۔ مشکل سے ہی کوئی خوشحال چہرہ نظر آتا ہے۔ میں تو اپنی پرانی تہذیب کی دلدادہ ہوں۔ میں ڈرتی ہوں کہ مانوی سے شادی کر کے تم کو پچھتانا پڑے گا۔؟ ایک بار اپنی ماں کی باتوں پر غور کرو...... شری ناتھ نے ماں کی نصیحتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اُدھر پروفیسر کی ضد کے سامنے مانوی کو جھکنا پڑا...... اور دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام کے ساتھ رچائی گئی......

''مانوی کی خوشیاں تو پامال ہو ہی چکی تھیں۔ اُس نے بھی عہد کر لیا کہ اب وہ کسی کو بھی چین سے جینے نہیں دے گی......'' وہ سسرال پہنچی تو ساس کا وہی حال کیا جو اُس نے گھر میں ماں کا کر رکھا تھا...... اُسے تو یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ کب سورج طلوع ہوا...... اور کب غروب ہو گیا۔ کب شری ناتھ آفس جاتا...... وہ دیر تک سوتی رہتی۔ پھر بستر سے اٹھ کر تیار ہو کر باہر نکل جاتی...... جب لوٹ کر آتی تو آرام کرتی...... اُس کی شامیں کلب میں گذر جاتیں۔ دونوں آدھی رات کے بعد گھر لوٹتے۔ مانوی کو نہ گھر کی فکر تھی نہ ساس کا خیال تھا۔ اس کو تو شری ناتھ کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ ہر وقت جلی بھنی سی رہتی تھی......

شری ناتھ کے پاس بھی وقت کہاں تھا۔ جو وہ ماں کے ساتھ بیٹھ کر ان کا حال پوچھتا...... وہ تو مانوی کی ناز برداری میں لگا تھا۔ اور پھر...... وہ دن بھی آ گیا جب شری ناتھ کو آسٹریلیا میں سروس مل گئی...... ماں کو چھوٹے بھائی کی سپردگی میں چھوڑ کر وہ مانوی اور اپنی بچی کو لے کر آسٹریلیا کے لئے روانہ ہو گیا......

ماں کو اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر میں بھی چین نصیب نہیں ہوا۔ بس کسی نہ کسی طرح گھر کی چاردیواری میں زندگی کٹ رہی تھی...... دن بھر کام کر کے جب رات میں تنہا اپنے کمرے میں ہوتیں تو اپنی نادانی پر رو رو پڑتیں۔ پچھتاتیں۔ کیوں میں نے اپنی زندگی میں ہی اپنی دولت کا بٹوارہ کر دیا......؟ میرے ہاتھوں میں میری دولت ہوتی تو آج مجھے بیٹوں کے رحم وکرم پر نہ جینا پڑتا! میں اپنی بہوؤں کے ہاتھوں ذلیل نہ ہوتی؟......

مانوی آسٹریلیا میں بالکل آزاد تھی...... اُسے ساس کی نگاہوں سے نجات مل گئی تھی...... بس ایک پریشانی یہ تھی کہ اُسے گھر کا سارا کام خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ جیسے ہی شری ناتھ آفس سے گھر آتا وہ تارنی کو اُس کی گود میں ڈال دیتی...... لو سنبھالو اپنی بیٹی کو...... اور اپنا گھر...... میں بہت تھک گئی ہوں۔ پھر شری ناتھ کو ہی

سارے کام نبٹانے پڑتے۔ مانوی بات بات پر بگڑتی...... مانوی کے غلط رویہ پر شری ناتھ کا دل ٹوٹ جاتا......اور دل ہی دل میں غصہ کر کے رہ جاتا......

مانوی ٹی۔وی کے سامنے بیٹھی اپنی تخیل وتصورات کی دنیا میں کھو جاتی۔ وہ خیالوں کی رو میں بہہ کر سمندر کے اس پار پہنچ جاتی۔ جہاں وہ اور چندر ملے تھے۔ وہ ریت پر اس کا نام لکھتا اور دوسرے ہی پل سمندر کی مست موجیں آ کر نام مٹا جاتیں...... اُس کے کانوں میں چندر کی باتیں گونجنے لگتیں...... میرے دل پر لکھے نام کو ہرگز بھی کوئی نہیں مٹا سکتا......

اُسے چندر کے وعدے یاد آتے اور وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ اٹھتی...... صرف ایک بار چندر سے ملنے کے لئے اس کا دل مچل جاتا اُس کی ایک ہی تمنا تھی۔ چندر کہیں مل جائے تو اُس کو بتا دے کہ اس گھڑی بھر کے پیار کے لئے وہ اس کے ساتھ مرنے کو تیار ہے۔ یہ شادی...... یہ دولت...... کچھ بھی تو میرا نہیں ہے۔ بس اس بھری دنیا میں ایک تم ہی میرے ہو۔ وہ شری ناتھ کی صورت دیکھ کر بیزار ہو جاتی۔ اگر یہ مجھ سے شادی نہ کرتا تو میرے پیار کی دنیا نہ اجڑتی......

مانوی کی ماں نے سنا تھا کہ آسٹریلیا میں مردوں اور خواتین کے حقوق برابر کے ہیں...... زیادہ تر عورتیں سروس کرتی ہیں اور بالکل آزاد ہیں...... مردوں کی طرح اگر وہ چاہیں تو اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہیں۔ لیکن بازاروں میں نیم عریاں لڑکیاں دیکھ کر اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... یہ کیسی تہذیب ہے جس میں شرم وحیا نام کی کوئی چیز نہیں ہے...... ماں یہ تو خوب جانتی تھیں کہ مانوی اس شادی سے بالکل خوش نہیں تھی...... شری ناتھ کے ساتھ مانوی کا نامناسب رویہ دیکھ کر والدین کو بے حد پریشانی ہوئی...... ماں نے اُسے سمجھانے کی کوشش بھی کی...... کہ جو کچھ تم کر رہی ہو وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اُس نے بڑے غصہ میں کہا...... پاپا نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے...... وہ بھی ٹھیک نہیں تھا...... تم نہیں سمجھ سکتیں کہ پاپا کی ضد نے مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے...... اب پروفیسر نے بھی چپ سادھ لی تھی...... وہ جانتے تھے کہ ضدی بیٹی کے ساتھ بحث کرنا فضول ہے......

کچھ ماہ رہ کر مانوی کے والدین غم اور فکر میں ڈوبے ہندوستان واپس چلے گئے...... پھر شری ناتھ نے اپنی ماں کو آسٹریلیا بلا لیا۔ اب مانوی کا رویہ پہلے سے بھی بدتر ہو گیا...... وہ بات بات پر شری ناتھ اور اُس کی ماں کی تذلیل کیا کرتی تھی...... ماں چپکے چپکے آنسو بہا کر خاموش ہو رہتیں...... چند ماہ رہ کر وہ بھی

واپس چلی گئیں...... شری ناتھ کو کام سے امریکہ جانا تھا...... وہ مانوی اور تارنی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا...... امریکہ کی چمک دمک دیکھ کر مانوی کی آنکھیں چندھیا گئیں......

جب واپس جانے کا وقت آیا تو وہ شری ناتھ سے بولی" تم چلے جاؤ...... میں تارنی کے ساتھ دیوالی کے بعد آجاؤں گی...... اور اس طرح شری ناتھ کو اکیلے ہی واپس جانا پڑا...... مانوی خوش تھی...... بہت خوش...... وہ شری ناتھ کو بالکل بھول گئی تھی...... دیوالی بھی آ گئی...... سب ہندوستانی مل کر خوشیاں منا رہے تھے۔ ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا...... مانوی اپنی ایک سہیلی رمولا کے ساتھ باتوں میں مگن تھی...... اچانک جو اُس کی نظریں اُٹھیں تو کسی کی شوخ نگاہیں سے ٹکرائیں...... وہ خوبرو نوجوان اُس کو یوں تک رہا تھا جیسے اُس کی برسوں پُرانی پہچان ہو...... اتفاق سے اُس نوجوان کی انگلی میں پڑی ہیرے کی انگوٹھی کی چمک مانوی کی آنکھوں میں پڑی...... اور بے ساختہ اُس کے منھ سے نکلا...... نہیں...... یہ وہ نہیں ہوسکتا...... گاؤں کا غریب چندو...... اور یہاں...... نہیں...... پھر اُسے اپنی سمت بڑھتا دیکھ کر اُس کے دل کی دھڑکیں ایک دم تیز ہوگئیں...... وہ جلدی سے اُٹھی...... اور تیزی سے باہر نکل گئی...... اُس نوجوان کی مسکراہٹ مانوی کے دل کے تاروں کو چھوگئی...... برسوں کے بعد مانوی کے دل میں ایک نیا احساس جاگا تھا...... مانوی کا دل چاہا کہ دوڑ کر اس کا استقبال کرے۔ لیکن وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی...... جب وہ اُس کے بالکل قریب آ گیا تب مانوی کو ہوش آیا۔ وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی...... تم کون ہو...... میں تم کو نہیں جانتی...... مجھے کچھ بھی یاد نہیں...... وہ اس کے اس انداز پر چونک اٹھا اور اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا...... تم...... مجھے بھول جاؤ...... یہ ممکن نہیں...... بھولنے والوں کے دلوں کے ناسور سے خون دل یوں آنسو بن کر نہیں ٹپکتا...... تم ہمارے پیار کے وہ لمحے نہیں بھلا سکتیں جو آج تک مجھے یقین دلاتے رہے کہ تم مجھے ضرور ملوگی۔ اور میرے دل کی ویرانیوں کو دُور کردوگی...... محبت بہت طاقتور چیز ہوتی ہے۔ ساری رکاوٹوں کو ڈھا دیتی ہے۔ میں اپنی محبت کے سہارے تمہاری دہلیز پر پہنچا تھا لیکن وہاں معلوم ہوا کہ تم کسی اور کا مقدر بن چکی تھیں...... میں تمہاری یادوں کو دل میں بسائے نامراد واپس لوٹ آیا...... تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا...... تم نے کچھ دن اور میرا انتظار تو کیا ہوتا...... تم شادی سے انکار کردیتیں...... لیکن...... تم نے دعویٰ کیا میری محبت کا اور اپنی زندگی کسی دوسرے کے حوالے کردی...... مانوی...... میری آرزوئیں...... آج بھی زندہ ہیں...... یہ دل آج بھی تمہاری یاد میں دھڑکتا ہے۔ اگر تم مجھے نہیں جانتی ہو اور

تمہارے دل سے میری محبت مٹ گئی ہے۔اور تم سب کچھ بھول گئی ہو...... تو کیوں میرے خیالوں میں آکر مجھے ستاتی ہو...... تمہیں کوئی حق نہیں تھا مجھے اس طرح تڑپانے کا......

مانوی حیرت بھری نگاہوں سے اُسے تکے جارہی تھی...... پھر ایک لمبی خاموشی طاری ہوگئی۔وہ خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔...... اور ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ مانوی کی آواز فضا میں اُبھری...... ٹھہرو...... کتنی آسانی سے مجھے قصوروار ٹھہرا کر چل دیئے...... اگر ایک عورت کی مجبوریوں پر غور کرو گے تو مجھے ہرگز بھی بے وفا ہونے کا الزام نہیں دو گے...... اس بے درد دنیا میں محبت کے سائے کی پناہ سے زیادہ عورت، ایک پناہ گاہ...... ایک سائبان کی محتاج ہوتی ہے۔باپ کے آنگن میں لڑکی کو تحفظ کا احساس رہتا ہے۔لیکن باپ ہی بے رحمی سے اپنے آنگن کے پھول کو توڑ کر کسی دوسرے کے آنگن کی رونق بنا دیتا ہے۔اور ایک بار بھی نہیں سوچتا کہ اُس آنگن کی مٹی میں اس کا پھول پنپے گا...... یا اُس کی نازک پنکھڑیاں ایک ایک کر کے مرجھا کر مٹی میں مل جائیں گی...... تم اپنے سارے قول وقرار بھول گئے...... ایک بار بھی تم کو میرا خیال نہیں آیا۔ایک بھی خط نہیں لکھا تم نے...... اب ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں......

چندر بڑے اشتیاق سے بولا...... تم کو بھلا دینا میرے بس میں نہیں ہے...... چندر کو اپنے خوابوں کی تعبیریں اُلٹی ہوتی نظر آرہی تھیں...... اس کے چہرے پر بے قراری پھیل گئی...... مانوی کا چہرہ زرد ہو گیا...... اُس کی زندگی کی سب سے مشکل گھڑی آن پڑی تھی...... وہ چندر...... جس نے بچپن سے آج تک صرف اُسی کو چاہا تھا...... اور اسی چندر کی تلاش میں اُس کی آنکھیں بھٹکتی رہتی تھیں...... آج وہی چندر اُس کے سامنے کھڑا تھا...... اور اپنی مانوی کو اپنی زندگی میں سمیٹ لینا چاہتا تھا...... وہ بے اختیار ہو کر بولی...... چندر میں کیا کروں...... اب میں تمہاری محبت کے قابل نہیں رہی...... وہ مانوی کے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی طمانت سے بولا...... بس اتنا کرو...... ان آنسوؤں کو روک لو...... مانوی کی نس نس میں شرارے جل اٹھے...... یہ کیسی خوبصورت گھڑی تھی...... وہ تو سب کچھ بھول گئی تھی۔اس ایک پل میں وہ سب کچھ ہار گئی تھی...... بس محبت جیت گئی تھی...... دونوں سرتاپا نہال ہو گئے تھے......

چندر کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے بے حد اُداس تھا اب ایک دم چمک اٹھا تھا...... اُس کی آنکھوں میں محبت کا اقرار تھا...... وہ بہت دھیمی آواز میں مانوی سے بولا...... بہت سارے سپنے دیکھے تھے...... سارے

کے سارے تمہاری پلکوں میں چھپے ہوئے ہیں...... کچھ دیر تک دونوں کی یوں ہی پیار بھری باتیں ہوتی رہیں۔ دونوں کا کارواں پھر سے رواں ہوگیا...... کچھ ہوش سنبھلے تو بڑی گمبھیر آواز میں بولا...... تمہارے بغیر کسی طرح جینا سیکھ لیا تھا...... لیکن یہ اچانک کیا ہوگیا......

مانوی چندر کے پیار کے نشے میں سرشار جھوم رہی تھی کہ اچانک تارنی کی آواز سنتے ہی اس کا سارا نشہ اُتر گیا...... شری ناتھ جب بھی ٹیلی فون پر مانوی سے واپس آنے کے لئے کہتا...... وہ کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے ٹال جاتی...... کیونکہ چندر کی ضد تھی کہ اب مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جانا...... ایک بار بچھڑ کر اب برسوں کے بعد ملے ہیں۔ تمہارے بنا میری جان پر بن آئے گی......

محبت کے دو دیوانے امنگوں کے سیلاب میں بہتے بہتے بہت دور نکل گئے تھے۔ جہاں سے واپس لوٹنا دونوں کے لئے بہت مشکل تھا...... وقت کا پرندہ بڑی تیزی کے ساتھ پرواز کر رہا تھا...... دیکھتے ہی دیکھتے کئی مہینے بیت گئے اور مانوی کے جانے کا وقت آ گیا...... تارنی بہت خوش تھی...... اور ہر وقت پاپا...... کی رٹ لگائے رکھتی تھی...... مانوی کو رخصت کرنے چندر ایئر پورٹ تک آیا تھا...... جیسے ہی جدا ہونے کی گھڑی آئی مانوی کا چہرہ ایک دم مرجھا گیا...... آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جلد لوٹنے کا وعدہ کر کے وہ آگے بڑھ گئی......

اگر تارنی ضد نہ کرتی تو مانوی کبھی واپس نہ آتی...... اب یہاں واپس آ کر وہ ہر لمحہ بجھی بجھی سی رہتی...... ہر وقت چندر کا چہرہ اُس کی آنکھوں میں بسا رہتا...... اس لمبی جدائی نے شری ناتھ اور مانوی کے درمیان فاصلے اور بڑھا دیئے تھے...... شری ناتھ جب بھی اُس سے بات کرتا...... وہ تُرشی سے جواب دیتی...... وہ بڑے صبر اور تحمل کے ساتھ مانوی کی حرکتوں کو برداشت کر رہا تھا۔...... مانوی اب زندگی سے پیار کرنے لگی تھی...... اپنے گرد و نواح کے حالات سے بے پرواہ بس اپنے ہی خیالوں میں مست رہتی تھی...... آنکھیں بند کرتے ہی وہ چندر کے پاس ہوتی...... وہ بے خودی کے عالم میں اُس سے ہم کلام رہتی...... چندر کے پاس جانے کے تصور سے اس کا دل خوشیوں سے بھر جاتا......

تارنی زور سے ماں کہہ کر پکارتی اور اُس کے سارے ارادے بکھر جاتے...... دل مرجھا جاتا...... بیٹی کی خوشیاں اُس کو شری ناتھ کے ساتھ رہنے کے لئے مجبور کر رہی تھیں...... کافی عرصہ گذر گیا...... لیکن وہ کوئی ٹھوس فیصلہ نہ کر سکی......

اُدھر چندر بھی بیحد خوش تھا۔ وہ مانوی کی محبت پا کر پھر سے جی اٹھا تھا...... وہ ٹیلی فون پر اپنے پیار کا افسانہ بار بار مانوی کو سناتا...... چندر کی پیار بھری باتیں سن کر مانوی کے قدموں میں پڑی زنجیروں کی کڑیاں آہستہ آہستہ کھلنے لگتیں...... لیکن تارنی کا خیال آتے ہی وہ اپنا فیصلہ بدل دیتی...... بڑی کش مکش میں اُس کی جان اٹکی ہوئی تھی...... اسی اُدھیڑ بن میں بہت دن گذر گئے۔ اُدھر چندر بھی مانوی کی جدائی میں تڑپنے لگا...... آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ آسٹریلیا آ گیا......

مانوی کے دروازے پر پہنچ کر بیل بجائی...... وہ اپنے چندر کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھی...... یکایک وہی سوال یاد آ گیا...... ایک طرف پیار تھا...... اور دوسری طرف تنہائیاں اور رُسوائیاں تھیں...... وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ چندر آگے بڑھا اور بولا...... "تم ملیں تو زندگی کا ہر لمحہ خوشنما ہو گیا تھا...... یا یوں کہوں کہ تم ملیں تو زندگی ملی۔ وقت پر کسی کا زور نہیں...... نہ جانے کب موت آ جائے...... زندگی کا ہر باقی لمحہ ہم دونوں ساتھ گذاریں گے......

مانوی رونے لگی...... اور روتے روتے اُس کی سسکیاں بندھ گئیں...... جو کچھ وہ چندر سے کہنا چاہتی تھی اُس کے لبوں پر آ کر رک جاتا تھا...... اُس کا دم گھٹتا جاتا تھا...... وہ بڑی ہمت جٹا کر دھیرے سے بولی۔...... چندر...... اتنی ساری خوشیاں ایک ساتھ کبھی کسی کو نہیں ملتی ہیں...... میں اپنی بچی کے ساتھ اتنی بڑی ناانصافی نہیں کر سکتی...... اُس کی ساری خوشیاں اپنے پیروں تلے روند کر تم تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اتنی ہمت کہاں سے لاؤں...... چندر میں بہت مجبور ہوں مجھے ایسے ہی جینے دو"......

چندر نے اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر کہا...... کیا میرے لئے یہ حکم ہے کہ میں مر جاؤں...... وہ بلک اٹھی...... نہیں...... چندر...... نہیں...... تم نہ رہے تو میں کیسے جیوں گی...... چندر میری معصوم بچی کو میری ضرورت ہے......

چندر بڑے تحمل سے بولا...... بچی کو ماں کا سہارا چاہیے...... تمہاری بچی میری بچی ہے۔ میں اس کو باپ کا پیار دونگا...... مانوی جلدی سے بولی...... یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ تارنی کا باپ زندہ ہے...... میں اپنی معصوم بچی کو اس کے باپ سے جدا نہیں کر سکتی...... تارنی جب بڑی ہو کر سب کچھ سمجھنے لگے گی تو مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی...... مجھ سے سخت نفرت کرے گی......

تم پاگلوں جیسی باتیں مت کرو مانوی۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ یہ دنیا

محبت کے بغیر بالکل اندھیری ہے۔ اب ہم دونوں ساتھ جئیں گے اور ساتھ ہی مریں گے...... یہی محبت کا دستور ہے۔ اُس نے بڑے حوصلہ کے ساتھ مانوی کا ہاتھ پکڑا...... تارنی کو ساتھ لیا اور ہوٹل آ گیا......

شری ناتھ شام کو جیسے ہی آفس سے گھر لوٹا ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی...... فون پر انجانی آواز سن کر چونک گیا...... وہ سیدھا ہوٹل پہنچا...... اور چندر کو ہوٹل میں دیکھ کر حیرت سے بولا...... چندر تم یہاں...... پھر فوراً ہی مانوی کی طرف دیکھ کر بولا...... تم یہاں کیا کر رہی ہو...... تارنی دوڑ کر اپنے پاپا سے لپٹ گئی۔ چندر بڑے طنز سے بولا...... شکر ہے تم نے مجھے پہچانا تو سہی...... میں وہی غریب چندر ہوں۔ جسے ہر امیر آدمی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا...... اب مانوی میرے ساتھ جا رہی ہے......

شری ناتھ نے حیرت سے مانوی کو دیکھا تو چندر نے شری ناتھ سے کہا...... ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں...... اب ہم نے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے...... شری ناتھ زور سے چیخا...... یہ ہرگز نہیں ہو سکتا...... میں قانون کی مدد لونگا...... چندر مسکرا کر بولا...... پچھتاؤ گے...... دلوں کے فیصلے کورٹ میں نہیں ہوتے...... شری ناتھ نے غضب ناک نظروں سے مانوی کو دیکھا اور کہنے لگا...... تم شاید یہ بھول رہی ہو کہ تم ایک معصوم بچی کی ماں بھی ہو...... ذرا سوچو...... اور اپنے دل و دماغ سے کام لو...... تم دس سال کے رشتے کو یوں پل بھر میں توڑ کر نہیں جا سکتیں...... یاد رکھو...... تمہارا یہ غلط قدم ایک دن تمہاری بیٹی کو بھی تم سے نفرت کرنے پر مجبور کر دے گا۔ تم اپنی معصوم بچی کی راہوں میں کانٹے نہ بچھاؤ...... تم جس پیار کی تلاش میں اپنے گھر کی دہلیز پار کر کے چل پڑی ہو اس راہ میں چلتے چلتے اپنے وجود کو کھو دوگی...... اب تو حقیقت یہ ہے کہ تم میری قانونی بیوی ہو...... اور میری بچی کی ماں...... ایک بیوی اور ایک ماں کی بہت ساری ذمہ داریاں ہوتی ہیں...... کیا تم اپنی اکلوتی بچی کے بغیر سکون سے رہ سکوگی...... شری ناتھ کو لگا کہ اچانک ایک ہولناک زلزلہ آ گیا ہے۔ جس سے ساری کائنات ہل کر رہ گئی ہے۔ اور اُس کی گرہستی کے گھر کی دیواریں اُس کے سر پر آ گری ہیں......

مانوی بڑی بے حجابی سے بولی...... بچی میری ہے۔ اُسے ماں کی ضرورت ہے...... اس لئے تارنی ہر حالت میں میرے ساتھ ہی جائے گی...... میں نے بہت مجبوری میں تم سے شادی کی تھی...... اگر میں تم سے شادی نہ کرتی تو میرے پاپا خودکشی کر لیتے۔ میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی۔ میرے پاپا کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی تمہاری گردن میرے سامنے کبھی اُٹھ نہ سکی...... شری ناتھ نے اُس کی بات

کاٹتے ہوئے کہا...... نادانی مت کرو...... اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اس معصوم بچی کے بہتر مستقبل کی خاطر گھر لوٹ چلو...... مانوی نے تو بے حیائی اختیار کر ہی لی تھی...... بڑی بے باکی سے بولی...... مجھے تمہارا ساتھ گوارا نہیں...... مجھے طلاق چاہیے...... اب تو شری ناتھ بے قابو ہو کر چلایا...... ہرگز نہیں...... میں تمہیں اس رشتے سے کبھی آزاد نہیں کرونگا...... شری ناتھ غصہ سے پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا...... مانوی تارنی کو لے کر ساری حدود توڑ کر چندر کے ساتھ امریکہ چلی گئی......

محبت کے نشہ میں چور وہ دونوں جدھر نظر اٹھاتے...... بہار ہی بہار نظر آتی...... مانوی کو پا کر چندر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے دونوں جہاں کی خوشیاں مل گئی ہوں۔ ابھی کچھ مہینے پہلے ہی وہ ہر محفل کی جان ہوتا تھا۔ لیکن آج وہی چندر جہاں جاتا لوگ اسے عجیب عجیب نظروں سے گھورتے۔ جیسے اُس نے کسی کی چوری کر لی ہو...... حالانکہ جو کچھ اس نے کیا تھا۔ وہ امریکہ کے معاشرے میں عام تھا...... لیکن اس کے دوستوں کے حلقہ میں یہ رشتہ قابل قبول نہیں تھا...... اُن کی ترچھی نظریں مانوی کے دل میں تیر کی طرح چبھ جاتیں...... اور وہ بے چین ہو جاتی۔ محبت کی چمکتی دنیا میں وہ تاریکیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی...... چندر اس کو یہ کہہ کر بہلانے کی کوشش کرتا کہ یہ سب لوگ ہماری خوشیوں سے جلتے ہیں...... دنیا والے کچھ بھی کہیں...... ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی رہیں گے......

پروفیسر کمار کو خبر ملی تو وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئے کہ اس لڑکی نے تو ہمارے چہروں پر شرمندگی اور ندامت کی سیاہی تھوپ دی ہے...... مانوی کی ماں نے روتے ہوئے کہا...... چندر غریب تھا تو کیا ہوا تھا تو اپنا...... اگر تم میری بات مان لیتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا...... مانوی کو باہر بھیج کر اُس کی بربادی کے راستے ہم نے خود ہی کھول دیئے تھے...... وہ وہاں جا کر وہیں کے رنگ میں رنگ گئی...... خود بھی شوہر کو چھوڑا...... اور بیٹی کو بھی باپ سے الگ کر دیا۔ تارنی کسی غیر مرد کو اپنا باپ کیسے مان لے گی......

وقت جلدی جلدی بیت رہا تھا...... مانوی اور تارنی کے امریکن ویزا کا سوال آیا۔ اسی چکر میں دونوں کو کنیڈا جانا پڑا۔ تارنی کی پڑھائی رُک گئی...... کچھ عرصہ کے بعد دونوں پھر امریکہ واپس آ گئیں...... تارنی اس خانہ بدوش زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ وہ چندر کو کسی حالت میں باپ کا درجہ دینے کو راضی نہیں ہوئی...... مانوی نے کئی بار اُسے سمجھایا کہ اب یہی ہمارا گھر ہے۔ لیکن وہ نفرت سے منہ موڑ لیتی...... ایک روز شری ناتھ کا فون آیا...... وہ زور زور سے رو رو کر اپنے پاپا سے کہہ رہی تھی...... پاپا...... تم مجھے بہت یاد

آتے ہو...... میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی......

امریکہ کی آزاد فضا میں تارنی کی ہم عمر لڑکیاں اور لڑکے بالکل آزاد تھے۔ اُن کو سب رشتوں کی پہچان تھی۔ ان کی زبانی تارنی نے اپنی ماں کے بارے میں بہت کچھ سن لیا تھا...... اب وہ بے حد شرمندہ تھی...... چندر کو ماں کے پاس بیٹھا دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی...... جب ضبط نہ کر پاتی تو ماں کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی...... ماں نے رونے کا سبب پوچھا تو بولی......لوگ تمہارے لئے نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں...... تم نے میرے باپ کو چھوڑتے وقت یہ تو سوچا ہوتا کہ ایک بے قصور لڑکی کو اُس کے باپ سے جدا کر رہی ہو...... تم نے اُن سے رشتہ توڑ کر ایک غیر آدمی سے ناطہ جوڑ لیا...... تمہارے اس رشتہ کو کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں ایک غیر آدمی کو اپنا باپ مان لونگی...... تم نے کتنی آسانی سے شادی کے مقدس بندھن کو توڑ ڈالا...... تم کو تو تمہارا پیار مل گیا...... لیکن میرے باپ کو اور مجھ کو کیا ملا......؟ ایک ماں تو اپنے بچوں کی خوشی پر قربان ہو جاتی ہے۔ لیکن تم کیسی ماں ہو کہ تم نے اپنی خوشی پر مجھے ہی قربان کر دیا...... آج میں ہر جگہ دھتکاری جاتی ہوں۔ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوال کرتے ہیں۔ بولو...... اب میں کیا جواب دوں؟......

مانوی بُت بنی سب کچھ سنتی رہی...... اور بیٹی کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں...... تارنی کا ایک ایک لفظ مانوی کی روح کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا...... ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی...... مانوی اپنے آپ کو شعلوں میں گھرا ہوا محسوس کرتی رہی...... اب وہ چندر کے ساتھ کسی طرح بھی سکون سے نہیں رہ سکے گی......اس کے اندر سب کچھ بکھرتا جا رہا تھا......

شری ناتھ نے طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا...... ویزا کا پرابلم پھر سامنے تھا۔ کتنے سارے دن یوں ہی گذر گئے...... ایک دن پھر تارنی ماں کے قریب جا بیٹھی...... اماں! لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟ یہ رشتہ تو بیحد کچا ہوتا ہے۔ دیکھو نا تم نے ایک نیا ہم سفر تلاش کر لیا۔ تم خوش بھی ہو...... اب تم مجھے اپنے پاپا کے پاس جانے دو...... باپ اور بیٹی کا رشتہ اٹوٹ ہے......

مانوی کو لگا جیسے آسمان اس کے سر پر آ گرا ہو...... اُس نے جو بھی کیا تھا...... لیکن تارنی کے معاملہ میں وہ بے حد حساس تھی...... بڑی شفقت سے بولی...... بیٹی...... مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت دے دو......اور یہ بات یاد رکھنا کہ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی...... مانوی کا ایک ایک پل گذرنا مشکل ہو رہا

تھا...... بیٹی قدم قدم پراُسے ذلیل کررہی تھی اور باپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی......

چندر نے تارنی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ چڑ کر بولی...... یہاں کے لوگ آپ کو شرافت کا پیکر کہتے تھے...... آپ جیسے شریف آدمی نے اپنی خوشی کی خاطر ایک خاندان کو اجاڑ دیا...... ایک بیٹی کو اُس کے باپ سے جدا کردیا...... کتنے کٹھور انسان ہیں آپ...... آپ نے میرا بچپن تباہ کردیا...... کیا رشتہ ہے آپ کا میری ماں سے۔کسی بھی قانون کی رو سے میرا اور میری ماں کا آپ کی چھت کے نیچے رہنا جائز نہیں...... آپ بے شک ممی کو رکھ لیں...... مگر مجھے میرے پاپا کے پاس جانے دیں...... اگر آپ نے میری بات پر توجہ دی تو میں اپنی جان دے دوں گی......

چندر حالات کی سنگینی کو سمجھ گیا تھا...... اصولوں کی خلاف ورزی ہمیشہ اذیت ناک ہوتی ہے۔اُس نے سوچا تھا کہ اپنی منزل کو اُس نے پالیا...... لیکن منزل پر پہنچ کر آج ایسا لگ رہا تھا کہ سب کچھ معدوم ہوا جارہا ہے...... مانوی...... سے رشتہ...... تعلق...... اور منزل...... یہ صدمہ اُس کے لئے جاں کاہ تھا۔لیکن اب تارنی کی زندگی کا سوال تھا...... ان حالات میں تارنی یہاں مستقل طور سے نہیں رہ سکتی۔بس یہی غم اُسے کھائے جارہا تھا...... اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے...... گھر میں موت جیسا سناٹا تھا...... مانوی کی خوشیوں کی خاطر چندر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا...... مانوی نے اپنا سب کچھ اُس کی خوشی کے لئے قربان کردیا تھا...... اب وہ کیا کرے......

اُس کا سویا ضمیر جاگ اٹھا...... ایک معصوم بچی پر ظلم نہ کر...... اُس کی خوشیاں واپس کردے......

چندر نے ایک طائرانہ نظر مانوی پر ڈالی...... اور بڑی منت بھری آواز میں کہنے لگا...... تمہارے قرب نے میری زندگی کا ایک ایک دن حسین اور خوشگوار بنادیا تھا...... مانوی کا بدلا بدلا رویہ دیکھ کر وہ خاموش ہوگیا پھر کچھ وقفہ کے بعد گہری نظر سے مانوی کو دیکھ کر کہنے لگا...... میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب وہ بڑی ہوگئی ہے۔اب اُس کے اوپر اپنا کوئی فیصلہ جبراً مسلط نہیں کیا جاسکتا...... اگر تم اجازت دو تو تارنی کو اُس کے پاپا کے پاس بھیج دیا جائے......

مانوی کو چندر کی محبت پر بڑا ناز تھا۔لیکن تارنی کو بھیجنے والا خیال بے حد دل لرزنے والا تھا...... وہ بے تحاشہ چلائی...... چندر...... شاید تم بھول رہے ہو کہ تارنی میری اکلوتی بیٹی ہے...... میری جان ہے...... میں مانتی ہوں کہ میں مجرم ہوں میں نے جرم کیا ہے...... مجھے میرے جرم کی اتنی بڑی سزا تو نہ دو...... چندر

دبی آواز میں بولا...... مانوی مجھے غلط مت سمجھو...... تم مجھے آج بھی اتنی ہی عزیز ہو جتنی پہلے دن تھیں۔ لیکن میں تو صرف تمہاری ذہنی الجھن دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری خوشی کے لئے کچھ بھی کر گذروں گا...... تم اپنا فیصلہ سنا دو......

شری ناتھ آفس سے آتا...... کچھ دیر اپنی ماں سے بات چیت کر کے تارنی کے کمرے میں چلا جاتا...... تارنی کے لئے اُس نے عمدہ عمدہ کپڑے اور کتابیں خریدی تھیں...... وہ اُس کی ہر چیز کو بار بار اُٹھاتا۔ آنکھوں سے لگاتا۔ اور بے اختیار رونے لگتا۔ ماں نے کئی بار کہا...... یہ چیزیں تارنی کو بھیج دو...... وہ یہ سب چیزیں دیکھ کر خوش ہو جائے گی...... لیکن شری ناتھ نے انکار کیا...... نہیں ماں...... وہ دن دور نہیں جب میری بچّی میرے پاس لوٹ آئے گی...... تھوڑی بڑی ہو جائے تو خود ہی اپنے پاپا کے پاس چلی آئے گی......

انتظار کی گھڑیاں کسی نہ کسی طرح گذر رہی تھیں...... مانوی کی بے چینیاں بھی ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں...... کیونکہ تارنی اپنے پاپا کے پاس جانے کے لئے ہر وقت بضد تھی...... فون پر تارنی اپنے پاپا سے امریکہ آنے کی ضد کر کے رونے لگتی تھی...... یوں تو وہ اکثر ہی رو پڑتی تھی...... لیکن آج تو اُس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر ممی اور پاپا نے ساتھ رہنے کا فیصلہ نہ کیا تو وہ اپنی جان دے دیگی...... تارنی کی ایک وارننگ نے شری ناتھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا...... سب کچھ تو وہ کھو چکا تھا...... بس ایک تارنی ہی تو اُس کی تھی...... جب مانوی گئی تھی...... تب تارنی چھوٹی تھی...... اُس عمر میں بچّی کو ماں کے پیار کی ضرورت ہوتی ہے...... تارنی کی خوشی کی خاطر ہی تو اُس نے اپنی بیٹی سے یہ لمبی جدائی منظور کی تھی...... وہ اپنی بچّی کے لئے کتنا رویا تھا...... اور تڑپا تھا...... لیکن آج جو کچھ وہ اس سے مانگ رہی تھی وہ اُس کو کسی حال میں نہیں دے سکتا تھا...... وہ تمام رات تارنی کے کمرے میں بیٹھا سوچتا رہا...... اس کا یہ اٹل فیصلہ تھا کہ مانوی اس گھر میں کبھی نہیں آ سکتی......

کچھ دن کے بعد جب شری ناتھ نے تارنی کو فون کیا تو وہ رو کر بولی...... پاپا...... تمہارے اور ممی کے جھگڑے میں میرا بُرا حشر ہو رہا ہے اور فون مانوی کو دیتے ہوئے بولی...... لو...... ممی سے بات کر لو......

دونوں طرف خاموشی تھی...... مانوی دھیرے سے بولی...... جو دُکھ میں اٹھا رہی ہوں وہ میرے لئے انتہا گناہوں کی سزا ہے...... میں تمہاری مجرم ہوں۔ لیکن سزا تم اپنی معصوم بیٹی کو دے رہے ہو......

شری ناتھ غصہ میں بھڑک کر بولا...... جب محبت کا جنوں تمہارے سر پر سوار تھا تب تم نے نہیں سوچا

تھا کہ اس دہکتے لاوا کی زد میں آ کر تمہاری بیٹی بھی جھلس جائے گی...... اب تمہاری یہی سزا ہے کہ تم زندگی بھریوں ہی دکھ اٹھاتی رہو...... بے بس کھڑی بیٹی کی خوشیاں برباد ہوتے دیکھتی رہو...... اور روتی رہو...... میں جانتا ہوں تارنی ایک ضدی لڑکی ہے وہ تمہیں ایک پل بھی چین سے جینے نہیں دے گی...... اور فون بند کر دیا......

ایک ہفتہ بیت گیا...... تارنی نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا تھا...... اُس کی بس ایک ہی ضد تھی...... ماں...... اب گھر چلو...... مانوی سوچتی...... کس کا گھر...... کون سا گھر...... میں تو اب بے گھر ہو چکی ہوں......

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی...... شری ناتھ نے فون اٹھایا...... مانوی کانپتی آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی...... وہ اُس کے رونے کی آواز سن رہا تھا...... شری ناتھ...... تارنی نے کھانا نہیں کھایا ہے...... دو دن ہو گئے ہیں۔ وہ تمہارے پاس آنے کی ضد کر رہی ہے......

شری ناتھ نے کہا...... میری بیٹی کو فوراً بھیج دو...... کیسے بھیج دوں...... سسکیوں کے دوران وہ اٹک اٹک کر بولی...... میں تارنی کے بغیر نہیں رہ سکتی...... شری ناتھ ترخ کر بولا...... اگر ایک پیار کرنے والا باپ اپنی بیٹی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے تو تم جیسی خود غرض ماں کو بھی بیٹی کے بغیر رہنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے...... اور فون بند ہو گیا...... مانوی وہیں سر ٹکا کر بہت دیر تک روتی رہی...... شری ناتھ کے لئے یہ فون کسی عذاب سے کم نہیں تھا...... اُس کا دل مرجھا گیا...... اُس نے کھانے کی طرف دیکھا بھی نہیں...... اور تارنی کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا...... رات آدھی سے زیادہ گذر گئی تھی...... ماں اپنے بیٹے کی حد سے زیادہ اُداسی اور بے قراری کو دیکھ کر بہت زیادہ پریشان تھیں...... پاس آ کر بولیں...... بیٹا...... اس طرح کب تک اپنے کو دُکھ دیتے رہو گے۔ تارنی کی ایک مسکراہٹ تمہارے دل کی ساری اُداسی کو دور کر دے گی...... کچھ لمحے رُک کر ماں بڑے مستحکم انداز میں بولیں...... بیٹا...... سب کچھ بھول جاؤ اور معاف کر دو مانوی کو......

وہ سر نہ اٹھا سکا...... ماں سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہ ہوئی...... یہ وہی ماں ہے جس کے لئے مانوی کے دل میں نہ عزت تھی...... نہ پیار تھا...... ہر وقت ان کو ذلیل کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی...... وہ دھیمے سے بولا...... اماں میں اُسے معاف کر دوں...... جس نے سر بازار میری عزت کو نیلام کر دیا ہے اور جو میرا سب کچھ لوٹ کر لے گئی...... ماں کچھ سوچ کر بولیں۔ تاریک راستے میں گرنے والے کو بھی سہارا مل جاتا ہے...... شری ناتھ نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا...... ذرا سوچو...... دنیا والے کیا کہیں گے...... مذاق اڑائیں گے میرا...... نہیں...... اماں...... اب تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے...... اب وہ اپنے پچھلے گناہوں کی

معاف مانگ رہی ہے...... جاتے وقت اس کو کسی کے جذبات...... محبت...... اور خاندان کی عزت کی پرواہ نہیں تھی...... پھر میں کیوں...... ماں درمیان میں ہی بول پڑیں...... تو پھر اُس کو طلاق دے دو...... عورت کو چھوڑنا بہت آسان ہے...... لیکن ایک ماں کو بچے سے الگ کرنا بہت مشکل ہے...... جس طرح آج تم اور تمہاری بچی ایک دوسرے کے لئے تڑپ رہے ہو کل وہ بچی اپنی ماں کے لئے اسی طرح تڑپے گی...... طلاق کا مطلب جانتے ہو؟...... یہ وہ بھیانک راستہ ہے جس پر چلنے والے لوگ ہمیشہ تنہا ہی رہ جاتے ہیں ابھی بھی مانوی تمہاری بیوی ہے۔ طلاق کے بعد وہ اس رشتے سے آزاد ہو جائے گی...... چندر آج بھی اُس کے دل میں بسا ہوا ہے...... لیکن طلاق کے بعد وہ اُس سے شادی کر کے اُس کی غلام بن جائے گی...... پھر مانوی کتنی ہی روئے...... کتنی ہی تڑپے...... چندر کے حکم کے بغیر نہ ہی تارنی کو اپنے پاس رکھ سکے گی...... اور نہ ہی امریکہ سے بار بار اپنی بیٹی سے ملنے یہاں آسکے گی...... اور پھر تم بھی تو ساری عمر بیٹی کو خوشیوں پر نہیں لٹا سکتے...... ؟ ایک ہمدرد ساتھی کے بغیر اس ملک میں تم کیسے رہ سکو گے...... میں آج ہوں...... نہ معلوم کب میری آنکھ بند ہو جائے۔ میں مرنے سے پہلے تم کو پھر سے شاد آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔ تارنی کو مسکراتے دیکھنا چاہتی ہوں...... میری یہ بات بھی یاد رکھنا کہ سوتیلی ماں تارنی کو وہ ساری خوشیاں ہرگز نہیں دے پائے گی جو اُس کی سگی ماں دے سکتی ہے...... شری ناتھ کا دل چاہا کہ ماں کے قدم چوم کر کہے اماں...... یہ سب کبھی نہیں ہو سکتا...... تم مجھے معاف کر دو......

وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا...... اُس کو ڈوب جانے دو...... اس دلدل میں وہ اپنی مرضی سے گئی ہے...... وہ بچوں کی مانند رونے لگا...... اس کے آنسو بہنے لگے......

ادھر مانوی بہت زیادہ بے چین رہنے لگی تھی...... اُس کا بیشتر وقت اب تو آنسو بہانے میں ہی گذرتا تھا۔ ایک روز چندر اُس کے قریب بیٹھ کر بولا...... یہ گھر میرے لئے جنت کا حسین گوشہ تھا...... جہاں میں تھا اور تمہاری یادیں تھیں...... لیکن اب یہ پل پل بدلتا تمہارا روپ میری سمجھ سے باہر ہے...... میں نے سوچا تھا۔ تم کو پا کر مجھے اور کسی چیز کی چاہت نہیں ہوگی...... لیکن کسی دوسرے کی چیز چھین کر انسان ہرگز بھی سکھ سے نہیں رہ سکتا...... موجودہ لات کا تقاضہ یہ ہے کہ تم تارنی کے ساتھ واپس لوٹ جاؤ...... شری ناتھ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا ہے وہ اُس کی خوشی کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے...... شاید...... وہ خاموش ہو گیا......

مانوی اُس کو گھورتی رہی...... بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟...... یہی نا کہ شاید شری ناتھ مجھے معاف

کر دے۔ مانوی لرز اٹھی...... وہ چندر کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ جس نے ابھی ابھی کہا تھا کہ وہ اُس کی پوجا کرتا ہے اور پل جھپکتے ہی اُس نے اپنی محبت کی مورتی کو آسمان سے زمین پر گرا کر چور چور کر دیا تھا...... وہ گھبرا کر بولی...... چندر...... تم یہ کیا کہہ رہے ہو......؟

اب میں کہاں جاؤں...... میں دنیا میں بے قدر ہو گئی۔ وہ تمہاری بے پناہ محبت...... وہ تمہارے جینے اور ساتھ مرنے کے وعدے کیا ہوئے...... اُس نے مانوی کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا...... یقین کرو مانوی...... میں تم کو اس طرح بکھری بکھری نہیں دیکھ سکتا...... میرے وعدے ہرگز بھی جھوٹے نہیں ہیں...... اور نہ ہی میری محبت میں کسی طرح کی کمی آئی ہے...... یہ میری محبت ہی بول رہی ہے......'' تارنی تمہارے ساتھ رہنے کو راضی نہیں ہے۔ اور تم تارنی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں...... شری ناتھ کسی حالت میں تمہیں طلاق دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں...... وہ ایسا کیوں کر رہا ہے......

مانوی نے افسردہ لہجہ میں کہا...... کیونکہ وہ مجھے اذیت پہنچانا چاہتا ہے...... وہ اُس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے بولا...... نہیں...... وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا...... جس سے تم کو تکلیف ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ تارنی کو ہرگز بھی تمہارے ساتھ نہ آنے دیتا...... تارنی اُس کی بیٹی ہے۔ اولاد پر باپ کا حق ہوتا ہے...... وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک دن ہار کر تم اُس کے پاس واپس چلی جاؤ گی...... مانوی...... سچ بات تو یہ ہے کہ میں ہار گیا ہوں...... میں تمہیں کسی بھی قانون کے تحت اپنا نہیں سکتا...... جب تک شری ناتھ تم کو آزاد نہ کر دے......

اب تم کو ایک کا انتخاب کرنا ہوگا...... میں اب بھی ساری زندگی تمہارے ساتھ گذارنے کو تیار ہوں...... اب تم خود ہی سوچ کر جواب دو...... تارنی...... یا...... پھر میرا ساتھ...... پھر وہی دل دہلانے والا سوال آ گیا...... مانوی کے آنسو اُس کے مضطرب چہرے پر برسنے لگے۔ چندر نے اُس کی ریشمی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ تمہاری بے تابی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی...... ایک گہرا سناٹا چھا گیا...... دم گھٹنے کا سا ماحول تھا...... کس کا یقین کرے...... کس پر بھروسہ کرے......

اس کے مردہ ضمیر میں ہلکی سی ایک جنبش ہوئی...... یہ تو نے کیا کر ڈالا...... اپنا شریک سفر چھوڑ کر دوسرے کا ہاتھ تھام لیا...... جس ہاتھ پر تجھے کچھ زور ہی نہیں...... کتنی آسانی سے تیرے ہاتھوں سے وہ ہاتھ پھسلا جا رہا ہے تو نے اپنی معصوم بیٹی کی خوشیوں کا خون کر دیا......؟...... تو کمزور تھی...... تیرے ارادے

کمزور اور بے ثبات تھے...... اُٹھ...... اور بہت سے کام لے...... تو ماں ہے...... بیوی کا فرض نہ نبھا سکی...... اب ماں کا فرض تو نبھا......

اتفاق سے اُسی وقت ٹیلی فون پر شری ناتھ نے اپنی بیٹی کا حال پوچھا...... تارنی بے اختیار روتے ہوئے بولی...... پاپا...... میری خاطر آپ میری ماں کو معاف کر دو...... ہم لوگ پھر سے ساتھ ساتھ رہیں گے تو کتنا اچھا لگے گا...... شری ناتھ نے یہ بات سنی اَن سنی کر دی...... شری ناتھ کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی...... دو چار پیار کی باتیں کیں اور ٹیلی فون کاٹ دیا۔ بیٹا! یہ آج کل کے زمانے کی پکار ہے۔ اس دنیا میں وفا اور محبت باقی نہیں رہی...... اُٹھ چکی ہے...... آج کل اگر ایک مرد تین بار طلاق دیتا ہے تو عورت بھی تین بار شادی کر لیتی ہے۔ آج تمہاری بچی تارنی کو ماں کی ضرورت ہے۔ میرے جانے کے بعد تم اکیلی بچی کو اس بڑے گھر میں چھوڑ کر آفس نہیں جا سکتے...... اور پھر تم تو کئی کئی دن کے لئے باہر چلے جاتے ہو...... اس بچی کی دیکھ بھال کون کرے گا...... تم لوگوں کے کہنے پر مت جاؤ...... ہر گھر میں کچھ نہ کچھ مصیبت تو آتی ہی ہے...... آج ہر گھر کی عجیب عجیب کہانیاں ہیں...... میں پوچھتی ہوں کون آیا تمہارے دُکھ بانٹنے...... تمہارے آنسو پونچھنے...... تم دنیا والوں کی خاطر اپنی معصوم بچی کی خوشیاں برباد نہیں کر سکتے...... کبھی کبھی ہمیں وہ زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ جو ہم گذارنا نہیں چاہتے...... اس دنیا میں کون بے عیب ہے...... گناہ اور پاپ تو ہم سب ہی کرتے ہیں...... چھوٹا یا بڑا...... گناہ تو بہر حال گناہ ہے...... اور اُس لحاظ سے ہم سب گنہگار ہیں...... بس ہمارا خالق ہی ہمارے گناہوں کو معاف کرتا ہے...... تارنی تمہاری بیٹی ہے۔ تم اُسے بے حد پیار کرتے ہو...... اُس کی خاطر سب کچھ بھول جاؤ......

شری ناتھ کی آنکھیں ماں کے پُر وقار چہرے پر ٹکی رہیں...... کتنی گہرائیاں ہیں ماں کے دل میں...... کتنے غم چھپے ہیں محبت کے گہرے سمندر میں۔ واقعی یہ ماں کا ہی ظرف ہے کہ دُنیا جہاں کے سارے غموں کو دل میں سمو کر محبت کا پیغام دیتی ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں...... میں تارنی کی ماں کو ہرگز بھی معاف نہیں کر سکتا......

دوسرے دن مانوی بے حد آزردہ نظر آ رہی تھی...... اُس کا چہرہ گواہ تھا کہ وہ رات بھر سوئی نہیں تھی...... پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا...... وہ کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی روئے جا رہی تھی...... وہ اپنی بے بسی کے احساس سے بالکل بے دم ہو گئی تھی...... اس کا سارا وجود کسی بید کی طرح کانپ رہا تھا......

چندر بڑی خاموشی سے اُس کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا...... اور بڑے پیار سے بولا...... ''کیا یوں ہی روتی رہوگی'' ...... وہ بدستور سسکتے ہوئے بولی...... چندر...... میں نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے...... دونوں بہت دیر یوں ہی گم سم بیٹھے رہے...... بڑی بے قراری کا عالم تھا......

چندر گھر پر نہیں تھا...... مانوی نے شری ناتھ کو فون لگایا...... وہ مانوی کی سسکیوں کی آواز سن رہا تھا...... مانوی روتے ہوئے بولی...... تمہاری بیٹی تمہارے پاس آنا چاہتی ہے...... وہ غصہ میں جھنجھلا کر بولا...... بھیج دو میری بیٹی کو میرے پاس...... چند ثانیے کے بعد وہ پھر بولی...... پلیز...... شری ناتھ...... فون نہ رکھنا...... میری بات تو سنو...... میں اُس کی ماں ہوں...... اُس کے بغیر بالکل نہیں رہ سکتی...... وہ غصہ میں چلاکر بولا...... چلو! تم کو اتنا تو احساس ہوا کہ تم ایک بچی کی ماں ہو...... تم میرے گھر میں نہیں رہ سکتیں...... تم کیا سوچتی ہو کہ میں ہمیشہ چپ رہ کر تمہاری حرکتیں برداشت کرتا رہوں گا...... تم کسی کے پیار میں دیوانی ہوکر سب کچھ چھوڑ کر چلی گئیں...... اب شاید تم اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ میں دوبارہ تمہیں اپنے دل کے کسی گوشے میں بٹھا لوں گا...... لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اب میں وہ شری ناتھ نہیں رہا جو تمہاری ہر ادا پر مسکرا دیا کرتا تھا...... اور تمہاری ہر خطا کو معاف کردیا کرتا تھا...... تمہاری بے جا حرکتوں کی وجہ سے میری زندگی عذاب بن گئی...... میرا راستہ چلنا دشوار ہوگیا تھا...... لوگ روک روک کر تمہاری بے وفائیوں کا ذکر کر کے مجھے ملامت اور رُسوا کرتے تھے...... کوتاہ اندیشی تم نے کی...... اور اندھا میں ٹھہرایا گیا...... گنہگار تم ہو...... سزا میں جھیل رہا ہوں......

شری...... شری...... پلیز میری بات تو سنو...... لیکن شری ناتھ نے ٹیلی فون رکھ دیا...... اور مانوی اپنا دل مسوس کر رہ گئی...... اب شری ناتھ نے کئی دن تک تارنی کو بھی ٹیلی فون نہیں کیا...... حالانکہ اُس کا دل تارنی سے بات کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا...... پھر ایک دن اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو شری ناتھ دھیرے دھیرے اٹھا...... اور ریسور کان سے لگالیا...... دوسری طرف مانوی شری ناتھ سے مخاطب تھی...... مانوی کے لہجہ میں نرمی تھی...... آواز دھیمی...... اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ پر یقین انداز میں شری ناتھ سے کہہ رہی تھی...... ہم آج ہی روانہ ہورہے ہیں...... مانوی نے فلائیٹ کا نمبر بتایا اور فون کاٹ دیا...... اس بار شری ناتھ ریسور ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہ گیا......

شری ناتھ نے راحت کی سانس لی...... میری بیٹی آرہی ہے...... لیکن دوسری سانس آنے سے۔

پہلے ہی مانوی کے آنے کے خیال نے اُس کے ذہن و دل کو بری طرح سے جھنجھوڑ ڈالا...... پھر گذرے ہوئے سالوں کا ایک ایک حادثہ اُس کی آنکھوں کے سامنے دوڑنے لگا...... وہ ایک دم تلملا اٹھا...... اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے گھنٹوں وہیں بیٹھا سوچتا رہا...... اُس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے...... اتنے سارے گھنٹے اُس نے کیسے بتائے یہ تو بس وہ ہی جانتا تھا...... کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا......

فلائیٹ آنے کا وقت ہو گیا تھا...... ماں کے بہت اصرار کرنے کے باوجود بھی وہ ائیر پورٹ نہیں گیا...... بلکہ تارنی کے کمرے میں بیٹھا اپنی پیاری بیٹی کا انتظار کرتا رہا......

گھنٹی بجی...... ماں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا...... تارنی دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی...... اور اپنے پاپا سے والہانہ انداز میں لپٹ گئی...... شری ناتھ نے کتنا چوما تھا اپنی لاڈلی بیٹی کو...... کبھی اُس کا ماتھا چومتا تو کبھی پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا...... آنسو تو اُس کی آنکھوں سے رکتے ہی نہیں تھے...... تارنی نے باپ کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا...... پاپا...... اب مت روئیے...... اب تو میں آ گئی ہوں...... اب میں آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی......

تارنی اب بڑی ہو گئی تھی...... اب وہ اپنے پاپا کو تسلیاں دے رہی تھی...... اور شری ناتھ کا بے قرار دل کسی حد تک آسودہ ہو گیا تھا...... مانوی اپنے ہی گھر کی دہلیز پر مہمان بنی کھڑی تھی...... ساس کو دیکھتے ہی اُن کے قدموں پر گر پڑی۔ اور اس قدر روئی کہ اپنے آنسوؤں سے اُن کے قدم دھو ڈالے......

اماں...... میں تو آپ کے پوتر قدم چھونے کے قابل بھی نہیں رہی...... میں نے جو گناہ عظیم کیا ہے اُس کی معافی تو شاید خدا کے گھر میں بھی نہ ہو...... اماں...... میری بچی کو بچا لو...... وہ کسی طرح بھی ماں کے قدموں سے اپنا سر اٹھانے کو تیار نہیں تھی......

بڑی مشکل سے ماں نے اس کا سر اٹھایا...... اور اُسے لے جا کر اپنے کمرے میں بٹھا دیا...... اس وقت مانوی سے کچھ بھی کہنا بے کار تھا...... سمجھانے کے لئے بہت وقت تھا...... پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا بس تارنی کی آواز اس بات کا یقین دلا رہی تھی کہ اس گھر میں زندگی ہے۔ مانوی شری ناتھ کے سامنے نہیں پڑی...... وہ ہر لمحہ سہمی سہمی سی رہتی تھی...... اندر سے وہ بالکل خالی اور بے وزن ہو چکی تھی......

شام کے وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ در و دیوار جو اُسے اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ سب کے سب اس سے ناراض ہیں...... سب اُسے دیکھ کر چپ چاپ سے تھے۔ بلا کی

خاموشی طاری تھی...... اس کا دل چاہا...... چیخ چیخ کر اُن درو دیوار سے کہے...... **مجھے معاف کردو**...... اور میرا یہ پیغام شری ناتھ تک پہنچادو...... وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں...... اور دوسرے سے تیسرے کمرے میں گئی...... لیکن کہیں بھی زندگی کی خوشبو نہیں تھی...... سب کچھ اُجڑ گیا تھا...... وہ خود ہی تو اس ساری تباہی کی ذمہ دار تھی...... اپنے ہنستے کھیلتے گھر کو خاک کر کے خود بھی دھیرے دھیرے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی......

وہ بڑی ہمت کر کے شری ناتھ کے کمرے میں گئی...... اور بڑی باریک بینی سے سارے کمرے کا جائزہ لیا...... سب کچھ بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ گئی تھی...... اچانک اُس کی آنکھیں شادی کی تصویر پر اٹک کر رہ گئیں۔ جو میز پر آج بھی جوں کی توں رکھی مسکرا رہی تھی...... اس تصویر کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے...... باوجود ضبط کرنے کے بھی وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکی......

اُس نے بیڈ کو بڑے غور سے دیکھا...... یہ سب کچھ اُسی کا ہی تو تھا...... پرانے دنوں کی یاد اُس کے ذہن میں تازہ ہوگئی...... کس قدر چاہتا تھا شری ناتھ مجھے...... ٹوٹ کر محبت کی تھی شری ناتھ نے مجھ سے...... ایک بار اُس کے دل میں اُس بیڈ کو چھونے کی آرزو پیدا ہوئی...... اور اُس کے ہاتھ خود بخود بیڈ کی طرف بڑھے...... لیکن پھر ایک دم رک گئے...... اور وہ منہ ہی منہ میں بدبدانے لگی...... میں پاپی ہوں...... میں گناہ گار ہوں...... میں پوتر پھولوں کی اس سیج کو چھو کر ناپاک نہیں کروں گی...... اچانک اُس کی نظر سامنے والے آئینہ پر پڑی...... آئینے میں اُس نے اپنا چہرہ دیکھا...... اُس کے چہرے پر نہ وہ رنگت تھی...... اور نہ آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی...... اُس کے چہرے پر بے شمار داغ اُبھر آئے تھے...... چہرے کا رنگ اس قدر پھیکا پڑ چکا تھا...... جیسے وہ مہینوں کی بیمار ہو۔ اُس نے گھبرا کر داغوں سے بھرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا...... وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھی سوچتی رہی...... کاش...... میں بھی اپنی ساس کی طرح حلیم...... صلح پسند اور ملنسار ہوتی؟...... اگر میرا دل بھی ان کی طرح محبت کرنے والا ہوتا تو آج میں یوں رسوا نہ ہوتی...... کاش میں اپنی ساس کو اپنی ماں کا درجہ دیتی......

فوراً ہی اُس کے ذہن میں بات اُبھری...... تو نے اپنی سگی ماں کا ہی کون سا احترام کیا تھا...... اس کا ضمیر اُسے دھتکار رہا تھا...... نہ ہی تو ایک پاکباز اور وفا شعار بیوی بن سکی...... اور نہ ہی ایک مکمل ماں کا کردار نبھا سکی...... آج وہ اپنے کئے ہوئے گناہوں پر بے حد پشیمان ہو رہی تھی...... اس بُری حالت میں اُس

کے ذہن میں ایک ہلکا سا خیال اُبھرا...... شاید شری ناتھ مجھے معاف کر دے...... شاید میری کوتاہیوں اور میری بے وفائی کو شری ناتھ نظر انداز کر دے...... شاید ایک بار پھر میرے اُجڑے دل کی صدا سن لے...... اپنے دل میں نہ سہی...... اپنے قدموں میں ہی تارنی کی عمدہ پرورش کے جذبہ سے تھوڑی سی جگہ دیدے؟......

وہ کھڑی ہوگئی...... اور حسرت بھری نگاہوں سے ایک بار پھر شری ناتھ کے کمرے کو دیکھا...... لیکن اُسے اپنے لئے محبت کی مہک کسی چیز میں سے آتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔ مانوی کے سخت رویہ...... اور ترش الفاظ نے ہی شری ناتھ کی روح کو بُری طرح گھائل کر دیا تھا...... پھر مانوی کی اس آوارگی نے اُسے جیتے جی وقت سے بہت پہلے ہی مردوں سے بدتر کر دیا تھا......

شری ناتھ ہر حال میں زندہ رہنے کی کوشش کر رہا تھا...... اُس کا زندہ رہنا تارنی کے لئے بہت ضروری تھا...... صرف اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر اُس نے اپنے گھر میں مانوی کی موجودگی برداشت کر لی تھی...... لیکن نہ تو اُسے مانوی کی کسی بات کا بھروسہ تھا...... اور نہ ہی اُس کے کسی ارادے کا یقین تھا...... شری ناتھ کو صرف اس بات کی فکر تھی کہ کسی طرح تارنی کا مستقبل سنور جائے......

اس معصوم بچی نے اپنی ماں کی گود میں انسانیت اور محبت کا پہلا سبق سیکھا ہی نہیں تھا...... لیکن اب اُس کو سنوارنے کی ساری ذمہ داری شری ناتھ کے کندھوں پر تھی......

بوڑھی ماں کب تک ساتھ دیتیں...... وہ چلتے چلتے مانوی کی وکالت کر گئیں...... بیٹا مانوی کی خطاؤں کو معاف کر دو...... شری ناتھ کے دل کے زخم اور گہرے ہوگئے...... ایک طرف ماں کی جدائی کا غم اور دوسری طرف مانوی کی بے وفائیوں کا غم...... اُسے غموں نے بُری طرح سے گھیر لیا تھا...... وہ کمرے میں پریشان حال اکیلا بیٹھا تھا...... مانوی کو اندر آتا دیکھ کر کھڑا ہوگیا......

وہ آگے بڑھی...... اور شری ناتھ کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا...... شری ناتھ تیزی سے پیچھے ہٹا...... اور کہا...... بیتی رُت کبھی واپس نہیں آتی...... مانوی بدستور اُس کے قدموں پر سر رکھے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہی...... اور شری ناتھ سکون کی تلاش میں کھلی فضا میں تنہا چلتا گیا...... چلتا گیا......

☆☆☆

تلاش۔ اپنوں کی

جوں جوں میری شادی کا دن قریب آ رہا تھا میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں...... چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی...... میری ماں بھی پریشان سی نظر آتی تھیں لیکن ہم دونوں چپ چپ...... خاموش خاموش...... اپنی اپنی گہری سوچوں میں غرق تھے۔ میں ماں سے اپنے دل کی بات کہنا تو چاہتی تھی مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا...... کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ بات تھی بھی تو بہت عجیب سی......

جب میری برداشت کی حد ٹوٹ گئی تو میں نے مدھم آواز سے کہا...... اماں میں یہ شادی نہیں کر سکتی...... ماں تو یوں اُچھلیں جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو...... چیخ کر بولیں...... صبح صبح بدشگنی کی بات نہ کر...... لگام دے اپنی زبان کو۔ میں اس قابل نہ تھی جو تیرے لئے اتنا قابل لڑکا ڈھونڈ پاتی...... بھلا ہو اشوک بابو کا جنہوں نے ایک اچھے پڑوسی ہونے کا حق ادا کیا۔ اگر یہ بات اُن کے کانوں تک پہنچی تو غضب ہو جائے گا......

اماں میں مجبور ہوں...... اگر یہ شادی ہوئی تو قیامت آ جائے گی......

اماں غصے میں لال ہو کر غرائیں...... کیسی مجبوری۔ کونسی مجبوری...... تجھے ہر حال میں یہ شادی کرنی ہوگی...... ہم دونوں کی مرادیں پوری ہونے کا دن آ رہا ہے۔ تیرا امریکہ جا کر آگے پڑھنے کا سپنا...... اور میرا تجھے دلہن سجانے کا سپنا......

اماں سپنے تو سپنے ہوتے ہیں...... ہر انسان سپنے دیکھتا ہے...... مگر اس کا ہر سپنا تو پورا نہیں ہو جاتا...... میں شادی نہیں کرونگی یہ میرا آخری فیصلہ ہے......

ارے کیوں نہیں کرے گی شادی...... انہوں نے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے بڑی ترشی سے کہا۔ انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو...... مجھ پر تو قیامت سے پہلے ہی قیامت ٹوٹ پڑی...... میری فرمانبردار بیٹی نے آج پہلی بار میرا کہا ٹالنے کی جسارت کی ہے...... اب آگے کیا ہوگا؟...... کچھ ٹھہر کر بولیں اپنی بدھوا اماں پر ترس کھا...... رحم کر مجھ پر...... کہیں تیری یہ بے جا ضد اس خوشی کے ماحول کو ماتم میں نہ بدل ڈالے...... اور ہماری یہ چھوٹی سی کٹیا بھسم ہو جائے اور تجھے ساری عمر پچھتانا پڑے......

میرے آنسو بہہ نکلے...... اماں تم سے الگ ہونے کا خیال ہی میرا دل دہلا دیتا ہے۔ روح کانپ اٹھتی ہے۔ میں تمہیں تنہا چھوڑ کر اتنی دور نہیں جا سکتی...... آج تک میں تمہاری مرضی پر چلتی رہی لیکن اب نہیں...... میری بات مان لو...... روک دو اس شادی کو...... ورنہ......

ورنہ کیا......؟ اماں پھر گرجیں...... اچھی طرح سوچ لے۔ تیرے اس انکار کا انجام بڑا بھیانک ہوگا۔ میں تیری یہ بے تکی بات ہرگز ہرگز نہیں مان سکتی...... ہمارے سماج میں لڑکی کا رشتہ ٹوٹ جائے تو وہ لوگوں کی نظروں میں گر جاتی ہے پھر اس کی کوئی قدر اور عزت نہیں رہتی ساری عمر کنواری بیٹھی رہ جاتی ہے......

اماں وہ زمانے ختم ہو گئے...... اب رشتوں کی وہ اہمیت نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی شادیاں ٹوٹ رہی ہیں...... طلاق ہو رہے ہیں اور طلاق شدہ عورتوں کی دوسری شادیاں ہو رہی ہیں۔ رشتہ ٹوٹنا تو ایک معمولی سی بات ہے......

اماں زہر خند لہجے میں بولیں...... آگ لگے اس زمانے کو جس نے ہماری قدیم تہذیب اور ریتی رواجوں کو تار تار کر ڈالا...... کان کھول کر سن لے تو میری سوچ نہیں بدل سکتی۔ تیری ہر کوشش ناکام رہے گی...... تب ہی گوتم اور گیان کمرے میں داخل ہوئے۔ پہلی بار ماں بیٹی کے درمیاں گرما گرم بحث ہوتے دیکھ کر دونوں نے پریشان ہونے کا ڈھونگ رچایا...... گوتم نے بڑے ہونے کا حق جمایا...... بولا...... آنٹی جو بدلتے زمانے کے ساتھ نہیں بدلیں گے وہ نئے زمانے کی اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ اب ہمارا بدلنا بھی ضروری ہے۔ اس میں ہی سب کی بہتری ہے......

اماں تو غصہ میں جلی بھنی بیٹھی تھیں...... کرختگی سے بولیں۔ مجھے یہ نئے زمانے کے نئے طور طریقے سمجھانے کی کوشش نہ کر...... نئے زمانے کے حمایتی۔ یہ بتا...... کیوں...... تیرے اس نئے زمانے میں عورت اس درجہ غیر محفوظ ہے کہ وہ اپنے گھر میں عزت اور چین سے نہیں جی سکتی...... اسے سمجھا دے کہ میں اکیلی رہ سکتی ہوں اور رہ لونگی...... یہ اپنے گھر جائے تو میں بھی سکھ کی سانس لوں......

گوتم نے مسکرا کر کہا...... عورت کہیں بھی کبھی بھی محفوظ نہیں...... اس کے لئے نا ہم بدلتے زمانے کو دوش دے سکتے ہیں اور نا ہی مردوں کو دوشی ٹھہرا سکتے ہیں...... اماں حوا کو باغ عدن کی شاندار زندگی راس نہیں آئی۔ سو نافرمانی کر بیٹھیں...... اُن کی غلطی کی سزا عورت ابد تک جھیلتی رہے گی...... انہوں نے باغ عدن سے اس یقین کے ساتھ اپنے قدم باہر نکالے کہ باہر کی بڑی سی بڑی دنیا کی رنگینیوں میں غرق ہو

جاؤنگی۔ آنے والے ہر غم وفکر سے آزاد ہو جاؤں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دام میں محفوظ ہو جاؤنگی......

مگر ہائے رے عورت کی بد قسمتی...... اسی دن سے اُس کی زندگی کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ آج تک عورت اپنی چھت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اُسے گھر تو ملے...... باپ کا گھر...... شوہر کا گھر...... بھائی کا گھر...... بیٹے کا گھر...... مگر وہ چھت آج تک میسر نہ ہوسکی جیسے وہ اپنا کہہ سکے...... جہاں وہ بے خوف وخطر سر اُٹھا کر عزت اور شان سے اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکے۔ عورت کسی نہ کسی مرد کے سایہ تلے ہی پلتی ہے اور ہمیشہ پلتی رہے گی...... وہ جتنی بھی نیک چلن اور پارسا ہو۔ جتنا بھی احتیاط برتے لوگ اکیلی۔ بے سہارا عورت پر انگلیاں ضرور اٹھاتے ہیں۔ اُسے ناحق رسوا اور بدنام کرتے ہیں اور اُس کا جینا دشوار کر دیتے ہیں۔ آپ جیسی خوبصورت اور کم عمر بیوہ پر تو ہر مرد کی نظر ٹھہر جاتی ہے۔ عورت جتنی بھی قابل ہو تعلیم یافتہ ہو مرد کی نظر میں وہ صرف ایک عورت ہے۔ زمانے بدل گئے مگر مردوں کے خیالات نہیں بدلے......

شادی کا خیال ہر لڑکی کو خوش کر دیتا ہے مگر جب سے ہمانی کا رشتہ پکا ہوا ہے یہ خاموش رہنے لگی ہے۔ آپ کا کوئی سگا رشتے دار نہیں ہے۔ اس کو ایک ہی فکر لاحق ہے کہ اس کے جانے کے بعد کون آپ کا خیال رکھے گا...... وقت مصیبت میں کون آپ کا ساتھ دے گا......

اماں کو گوتم کا بھاشن ایک دم نہیں بھایا...... طنزیہ لہجے میں بولیں...... ہاں بھئی تم نئے زمانے کی پود ہو تم ہمانی کی ہی وکالت کرو گے۔ زندگی بھر میں مصیبتوں اور مسائلوں کی زنجیروں میں جکڑی اس کی شادی کے سپنے دیکھتی رہی۔ اب نا مجھ میں ہمت ہے اور نا ہی حوصلہ...... اسے سمجھا دے...... اگر اس نے شادی کرنے سے انکار کیا تو یہ اپنی ماں کو کھو دے گی...... گیان فوراً اماں کے پاس جا بیٹھا...... بولا...... آنٹی ہم آپ کو نہیں کھو سکتے۔ آپ کو صرف ہمانی کی شادی کی فکر ہے مگر مجھے آپ دونوں کی فکر ہے......

گوتم زیر لب مسکرایا...... آنٹی اس مشکل کا ایک آسان حل ہے...... آپ اس گھر کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ شفٹ ہو جائیں...... اکیلی عورت کو نا تحفظ ملتا ہے اور نا ہی دلی سکون...... اماں کو تو یوں لگا جیسے کسی نے گرم گرم لوہے کی سلاخ سے داغ دیا ہو۔ بلبلا ہی اُٹھیں...... پاگل ہو گئے ہو تم لوگ...... خبردار...... یہ بات دوبارہ نہ کہنا...... میں نے آج تک صاف اور سچی زندگی گذاری ہے۔ کوئی بھی بدنامی اپنے نام کے ساتھ دیکھنے سے گھبراتی ہوں۔ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جس کی وجہ سے میری ذات دنیا والوں کی نگاہوں میں مذاق کا نشانہ بن جائے اور میری وجہ سے میری بیٹی کی خوشیاں بھی خاک میں مل جائیں......

میں نے فوراً کہا کون دنیا والے...... باہر والوں کی پروا کرنا حماقت ہے اور آپ کا اپنا سگا تو کوئی ہے ہی نہیں...... کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی...... پھر اماں کی دُکھ سے بھری دھیمی آواز آئی...... سگے رشتے...... دل کے رشتے۔خونی رشتے...... گر مانو...... تو رشتے ہیں...... ناں مانو تو انسان بالکل اکیلا ہے۔ بالکل تنہا...... میری طرح...... رشتے بڑے قیمتی ہوتے ہیں...... رشتے کمزور نہیں ہوتے...... ہم انسان کمزور اور بے انتہا خودغرض ہیں...... رشتے نبھانا نہیں جانتے۔کبھی کبھی اتنی لاپرواہی برتتے ہیں کہ خونی رشتے بھی کانچ کی طرح چھن سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں...... جیسے میرے سارے رشتے بکھر گئے اور میں رشتوں سے بھری اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی۔کوئی بھی تو نہیں جسے اپنا کہہ سکوں۔کیا بتاؤں کتنے دُکھ دل میں چھپائے جی رہی ہوں۔ماں سوتیلی ہی سہی...... ہے تو...... باپ تو میرے اپنے ہی...... وہ بھی میرے نہیں ہوئے۔ساس ۔سسر ہیں...... باپ کی اکلوتی بیٹی اور سسرال میں بھی اکلوتی بہو...... میں لاوارث نہیں ہوں......

سب کچھ بھول بھال کر میں اپنی ماں سے لپٹ گئی...... اماں میں تو آج تک یہی سوچتی تھی کہ ہم یتیم ہیں۔ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں۔آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔آج آپ کو بتانا ہوگا۔میرے دادا ۔دادی۔نانا۔نانی۔کے نام اور ٹھکانوں کے پتے......

اماں بولیں...... مجبوری تھی...... اُن لوگوں نے مجھے نہیں اپنایا...... اگر تجھے بھی دھتکارتے تو غم دونا ہو جاتا...... جب دلوں میں نفرت جنم لے لیتی ہے تو دامن چھوٹ جاتے ہیں...... جب دامن چھوٹ جاتے ہیں تو رشتے ٹوٹ جاتے ہیں پھر سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ہم دونوں سب کے ہوتے ہوئے بھی اکیلے ہو گئے...... بھگوان نے میری ماں مجھ سے چھین لی اور دنیا والوں نے اُس کی اتنی بڑی سزا مجھے دی ۔پیدائشی بدنصیب کہہ کر سب نے مجھے ٹھکرایا......

میری سوتیلی ماں کا کہنا ہے کہ میں وہ منحوس۔بدنصیب ناگن ہوں جس نے اس دنیا میں آتے ہی اپنی ماں کو ڈس لیا...... ساس اور ماں دونوں کو میری پرچھائیں تک سے نفرت ہے۔جب سے ہوش سنبھالا خوشیاں مجھ سے دور بھاگتی رہیں۔میری سوتیلی ماں نے میری وجہ سے میرے پاپا کی زندگی بھی عذاب کر دی تھی۔میں اپنے پاپا کی آنکھوں کی طراوت اور دل کی راحت تھی۔ان کی آشا تھی...... پھرتیلی تھی۔ہوشیار تھی۔انہیں یقین تھا کہ پڑھ لکھ کر میں اپنا مستقبل ضرور سنوارلونگی...... مجھے اسکول جانے کا جنون تھا اور اماں کو میرا اسکول جانا اکھرتا تھا۔وہ مجھے گھر میں نوکرانی بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔پاپا کی ضد کے

سامنے وہ ہار گئیں۔اپنی اس ہار کی انہوں نے مجھے کڑی سزادی...... بہت ستایا۔نا کبھی پیٹ بھر کھانا ملا نا چین کی نیند۔انکا بس چلتا تو مار مار کر میری ہڈیاں توڑ ڈالتیں۔گلا دبوچ کر مار ڈالتیں۔میں سخت جان تھی...... مر کر ہی نہ دی...... جب جب میرے بیاہ کی بات چلتی وہ میری بد نصیبی کا ذکر چھیڑ دیتیں اور بات وہیں ختم ہو جاتی۔پاپا کی پریشانیاں دیکھ کر ان کے بچپن کے دوست نے اپنے بیٹے سے میرا رشتہ پکا کر دیا......

بڑے زور وشور سے میرے بیاہ کی تیاریاں چل رہی تھیں۔برات کے آنے کا انتظار سب سے زیادہ مجھے تھا کیونکہ میری سنگدل ماں کی قید سے میری رہائی کا وقت قریب تھا۔وہ ہزار بار کہہ چکی تھی کہ آگے میرا منحوس چہرہ کبھی نہیں دیکھے گی...... اگر کبھی میں نے اُن کی چوکھٹ پر قدم رکھا وہ دن میرے اور میرے پاپا دونوں کے لئے سب سے بُرا دن ہوگا...... لمبے انتظار کے بعد جب یہ ہولناک خبر کہ دولہے کو کشتی میں ناگ نے ڈس لیا ہم سب کو ملی تو گھر میں ایک ہی آواز گونجی...... یہ لڑکی ناگن ہے اس نے اس کو بھی ڈس لیا...... سنتے ہی میرے گھر کی چھت دھڑ دھڑاتی ہوئی میرے سر پر آگری...... میرے اوپر ہیبت طاری ہوگئی تھی...... اماں کی چیخ سن کر تو میری روح تک کانپ اٹھی تھی...... وہ کہہ رہی تھی۔اب اس ناگن کو کوئی نہیں اپنائے گا۔مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ناگن ہم سب کو ڈس کر مرے گی...... اس سے پہلے کہ یہ مجھے ڈس لے میں اسے اپنے گھر سے نکال دونگی...... نہ آگ۔نہ دھواں۔نہ شعلہ۔نہ چنگاری پر میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔میرا تن من جل رہا تھا۔میں اپنے حواسوں میں نہیں تھی...... ادھر اُدھر کہیں پاپا دکھائی نہیں دیئے...... نا میرے پاؤں تلے دھرتی تھی اور نا ہی سر پر آسمان...... اماں کو دونوں ہاتھ پھیلاتے اپنی طرف لپکتے دیکھا تو میرا رواں رواں کانپ اٹھا کسی نے مجھے سہارا نہیں دیا......

شیکھر نے اماں کو روک کر کہا...... آپ ہیں ان کی سوتیلی ماں۔سوتیلی مائیں اتنی سنگدل کیوں ہوتی ہیں......؟معصوم۔بے بس بچوں کو کیوں ستاتی ہیں۔میری ماں بھی سوتیلی ہیں۔مجھے ناگ کہتی ہیں جیسے آپ انہیں ناگن کہہ رہی ہیں۔ہم دونوں کے ایک سے حالات ہیں...... میں بھی ان کی طرح اپنی سوتیلی ماں کی نفرت کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں جلتا رہا...... چھوٹا تھا۔کمزور اور مجبور تھا...... دھمکیاں دے دے کر وہ مجھ پر حاوی ہو جاتی تھی۔راجیو میرا بچپن کا دوست تھا۔وہ میرے اور ان کے سارے حالات سے باخوبی واقف تھا۔میری طرف دیکھ کر کہا...... وہ آپ کو اس دوزخ سے نجات دلوانا چاہتا تھا...... میں انہیں اپناؤنگا...... ان سے ابھی۔اسی وقت شادی کرونگا...... انہیں وہ ساری خوشیاں دونگا

جو میرا جگری دوست انہیں دینا چاہتا تھا...... میرے دوست نے میری ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا...... اب میری زندگی کا مقصد ہے کہ میں اُس کی آخری خواہش پوری کروں......

کسی نے یہ بھی نہ پوچھا...... تم کون ہو......؟ کسی نے روک کر نہیں کہا...... میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ رہیں...... تم دونوں جہاں بھی رہو سدا خوش رہو۔ آباد رہو...... خالی دل...... خالی ہاتھ خالی جھولی...... آنسوؤں سے بھری آنکھیں لئے میں نے اپنی زندگی کے نئے انوکھے سفر کے لئے قدم بڑھائے تھے......

مجھے دیکھتے ہی ساس کے اندر کا شعلہ بھڑکا...... شیکھر کی طرف دیکھ کر بولیں...... ناکام کا ناکاج کا...... ایک فقیرنی کو اور اٹھا لایا...... تو اگر چاہے تو اپنے باپ کے گھر میں رہ سکتا ہے مگر کسی ایری غیری لڑکی کے لئے میرے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ میری طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر بولیں...... اس گھر کو سرائے سمجھنا...... اپنا ٹھکانا نہیں...... سرائے میں صرف ایک دو دن ہی رہا جاتا ہے...... تو آج رات یہاں گذار سکتی ہے کل پو پھٹنے سے پہلے یہاں سے دفع ہو جانا...... یاد رکھ کل صبح تک اگر نہیں...... تو میں خود دھکے مار کر تجھے اپنے گھر سے باہر نکال دونگی......

وہ تو دھم دھم کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں...... شیکھر کے فادر حیران و پریشان ہماری طرف دیکھتے ہی رہ گئے...... شیکھر نے اُن سے سوال کیا...... پاپا...... کیا آپ کے اس لمبے چوڑے گھر میں میرے لئے ایک کونہ بھی نہیں ہے......؟ انہوں نے بیٹے کو اپنی باہوں میں تھام کر کہا...... تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ جو کچھ میرا ہے سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ بس...... یہ ماں تمہاری نہیں ہے سوتیلی جو ہے...... گھر تو ماں سے ہوتا ہے...... انسان رشتوں پر حق جتانا تو جانتے ہیں مگر رشتے نبھانے نہیں جانتے۔ احساس اور پیار زندگی کو خوبصورت بناتا ہے...... جن کے دل پیار سے خالی ہیں وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتے...... خود بھی نفرت کی آگ میں جلتے ہیں اور دوسروں کو بھی جلاتے ہیں۔ بالکل تمہاری ماں کی طرح، انسان اپنی پسند کے لئے ہمیشہ ہی خودغرض ہے۔ تمہاری ماں کو...... بہو سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہو کوئی بھی ہوتی۔ بس مالدار کی بیٹی ہوتی تو اس گھر میں اُس کے کے لئے جگہ ہوتی۔ وہ تمہاری شادی اپنے کروڑ پتی ماموں کی بیٹی سے کروا کر خود کروڑ پتی بننے کے لئے سپنے دیکھ رہی تھی...... تم نے اُس کا سپنا چور چور کر دیا۔ محبت کے رشتوں کو بیچنے اور خریدنے میں ہم انسانوں کے سارے جذبے خاک ہو جاتے ہیں جب جذبے ہی خاک ہو جائیں تو انسان حیوان کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ ہم خود اپنے ہاتھوں رشتوں کے چراغ بجھا دیتے ہیں...... دولت کی ہوس

انسان کو پاگل بنادیتی ہے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے......

معلوم نہیں جو ہوا وہ کیوں ہوا...... خیر جو بھی ہوا سو ٹھیک ہی ہوا کیونکہ کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں ہوسکتا...... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب تم وہ کرو جو ہونا چاہیے...... ہمت باندھ لو۔ حوصلہ رکھو۔ ہراساں نہ ہو۔ خوف نہ کرنا کیونکہ خوف عذاب ہوتا ہے۔ تم دونوں ہی سوتیلی ماؤں کے عتاب کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے...... اب اس بلا سے آزاد ہو...... سوتیلی ماں کی نفرتوں کی پکی دیوار پر محبت کی کٹیا نہیں بنائی جاسکتی...... اس گھر میں تم دونوں کو کبھی کوئی خوشی میسر نہ ہوگی۔ آج میں خود سے شرمندہ ہوں۔ اپنی الگ پیار کی کٹیا بناؤ، جہاں تم دونوں سدا خوش رہ سکو...... جاؤ...... میں تمہیں نہیں روکونگا...... میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہونگا کیونکہ اولاد پاس ہو یا دور اپنے ماں باپ کے دل میں سمائے رہتے ہیں...... کل تم باہر کی دنیا میں قدم رکھو گے۔ قدم قدم پر اندھیروں کا سامنا ہوگا۔ مشکلات کا سامنا صبر سے کرنا...... خدا صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ کوئی تمہارے ساتھ بُرا کرے تم اُس کا جواب بھلائی سے دینا...... کیونکہ لوگ بُرے نہیں ہوتے حالات لوگوں کو بُرا بنادیتے ہیں...... موسم کی طرح انسان بھی بدلتے ہیں...... مجھے یقین ہے کہ تمہاری ماں بھی ضرور بدلے گی اُس دن کا انتظار کرنا جب وہ خود چل کر تمہارے گھر جائے گی۔ انہوں نے شیکھر کو بینک بک دی اور گھر کی چابی میری طرف بڑھا کر بولے...... یہ لو...... بٹی...... گھر تو عورت کا ہوتا ہے۔ ہم دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھتے اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں لئے باہر نکل گئے...... زندگی میں پہلی بار میرے اندر خوشیوں اور سکوں کا ٹھنڈا ٹھنڈا احساس پھیلتا چلا گیا۔ بس اس ہی احساس کے ساتھ آج تک جی رہی ہوں......

گھر چھوڑتے وقت شیکھر نے کہا۔ آج میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر جا رہا ہوں۔ آئندہ تمہارے اوپر میری ظالم ماں کا سایہ کبھی نہیں پڑنے دونگا۔ شادی سے پہلے شیکھر نے نوکری کی تلاش میں کئی آفسوں کے چکر کاٹے تھے۔ کئی دفتروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ جوتوں کے تلے گھس گئے مگر چھوٹی موٹی چپراسی کی نوکری بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ نے انہیں یہ احساس دلا دیا تھا کہ علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ شاید اسی لئے وہ تو اپنے جنرل اسٹور کی دیکھ بھال میں مصروف رہے مگر مجھے کالج بھیج دیا...... اُن ہی کی وجہ سے آج میں کالج کی پروفیسر بنی......

انہوں نے اپنے جنرل اسٹور کے سامنے بینچ ڈال دی...... جو آتا اُسے مفت چائے پلاتے۔ چائے تو رشتے بناتی ہے...... وہ خود بھی ایک نہایت خلیق مہربان اور حساس دل انسان تھے۔ دوسروں کے دکھ

درد محسوس کرتے تھے اور ان کے دُکھ بانٹنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ اچھے کاموں میں جواں لڑکوں کو اپنے ساتھ ملاتے تھے۔ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے والوں کو بڑی بڑی محبتیں مل جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے جولوگ دل فتح کر لیتے ہیں انہیں شکست کبھی نہیں ہوتی۔ ہماری بزنس میں اضافہ ہوتا گیا......

جب تم آئیں تو گھر میں جیسے نور کا چراغ جل اٹھا۔ گھر گلزار بن گیا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی۔ پھول ہی پھول۔ مہکار ہی مہکار۔ محبت تو بارش کی طرح ہوتی ہے اس کی پھوہار دلوں کے سارے زخم سارے دُکھ دھو ڈالتی ہے۔ محبت بھرے ماحول میں میں اپنے دُکھ بھول گئی تھی۔ مگر موسموں کا بدلنا ضروری ہوتا ہے۔ پھول مرجھاتے ہیں۔ پھر میری بدقسمتی نے میری خاک اڑا ڈالی شیکھر کی ناگہانی موت پھر مجھے کانٹوں بھرے بن میں کھینچ لائی۔ بچپن کے سارے دکھ درد تازہ ہو گئے۔ ہر پل...... ایک ہی فکر...... ایک ہی خیال...... میرے بعد تو کسے اپنا کہے گی...... تیرا رشتہ پکا ہوا تو میرے بیقرار دل کو قرار ملا......

۴؍دن باقی رہ گئے ہیں۔ وہ لوگ آنے والے ہیں اور تو بیاہ کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ گوتم سمجھا دے اسے میرا یہ دل دُکھ سہتے سہتے تھک گیا ہے۔ اب میرے دل اور جسم میں اتنی شکتی نہیں رہی ہے جو...... اُن کی آواز بھر آگئی...... آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں......

گوتم بولا۔ آنٹی آپ بھی تو ہماری بات پر ذرا سا دھیان دیں۔ آپ اکیلی نہیں رہ سکتیں...... آپ اپنی ضد چھوڑ دیں اور ہماری بات مان لیں......

اماں پھر بکھر گئیں...... تمہاری بات مان لوں...... جو طوفان آئے گا اس کے اثرات کتنے بھیانک ہونگے...... بہت تیز آندھی آئے گی اور دونوں خاندانوں کی خوشیاں اڑا کر لے جائیگی...... یہ بڑا گمبھیر معاملہ ہے۔ اس کے سسرال والے یہ ہرگز برداشت نہیں کر پائیں گے...... یہاں معاملہ صرف میری سیفٹی کا ہی نہیں۔ یہاں معاملہ میرے خاندانی وقار اور عزت کا بھی ہے۔

میں نے کہا آپ ان لوگوں کی خاطر اپنی بیٹی کی خوشیوں کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ جنہوں نے آپ کو بیچ منجدھار میں ڈوبنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ خیر...... جو ہوا سو ہوا...... اب میں اُن سب کو تلاش کر کے ہی دم لونگی...... آج مجھے ان لوگوں کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے اپنوں کے ہوتے ہوئے لاوارثی کا احساس لے کر جینا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ انہی سے میری پہچان ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں میں کون ہوں۔ میری جڑیں کہاں ہیں......

اماں کے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی کی ایک لہر پھیلی...... اگر انہوں نے تمہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تو...... بیٹا جب دلوں میں دوریاں حائل ہو جاتی ہیں تو زمینی فاصلے بھی کوسوں پر محیط ہو جاتے ہیں...... گذرتے وقت کے ساتھ ان فاصلوں میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ پھر ملنے کی آس ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ ان لمبے اٹھارہ سالوں کے بعد...... تم وہاں کہاں جاؤ گی...... اب وہاں کچھ بھی نہ بچا ہوگا سوائے نفرت کے اونٹ کٹاروں کے جو تمہیں بھی زخمی کر دیں گے......

اماں خون کی ایک بوند نور ہوتی ہے جو نفرت کے پہاڑ کو ایک پل میں ڈھا دیتی ہے۔ میرے زخموں سے ٹپکا لہو کا پہلا قطرہ میری شناخت کی گواہی دے گا...... یکا یک اُن کے من کے پٹ کھل جائیں گے...... پریم کی ورشا ہوگی اور وہ لوگ مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ کر کہیں گے۔ تم ہماری ہو اور ہم سب تمہارے ہیں...... اماں خون میں بڑی طاقت اور کشش ہوتی ہے۔ وہی طاقت اور کشش مجھے اُن کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے......

اماں بولیں...... اب مجھے ان باتوں پر نایقین رہا نا بھروسہ...... اگر ایسا ہوتا تو میرے پاپا میرے آس پاس ہوتے۔ ان اٹھارہ سالوں کے ہر پل ہر لمحے میں نے اُن کا انتظار کیا مگر...... گیان بولا...... آنٹی انسان کو انسان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اکیلا انسان......

اماں بیچ میں ہی بول پڑیں۔ میں اپنی زندگی کے اس سفر میں اکیلی نہیں ہوں۔ شیکھر کے جانے کے بعد میں نے ہر گھڑی اُن کے ساتھ گذاری ہے......

گوتم بولا...... کل میں ٹی۔ وی دیکھ رہا تھا۔ بمبئی میں ایک 80 سال کے بزرگ اکیلے رہتے ہیں اُن کا اکلوتا بیٹا اپنی بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ میں رہتا ہے...... باپ نے بیٹے سے اپنی تنہائی کا رونا رویا تو بیٹے نے فوراً دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ باپ نے اخبار میں اشتہار دیا۔ ایک 65 سال کی بیوہ نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی...... وہ منگنی کی انگوٹھی لے کر جب میڈم کے گھر پہنچے تو اپنی چاہت کے رنگوں میں رنگا اپنا منتظر پا کر بیحد خوش ہوئے...... فوراً منگنی کی انگوٹھی پیش کی...... منگنی کی انگوٹھی لڑکا لڑکی دونوں ہی ایک دوسرے کو پہناتے ہیں لیڈی اُن کے ساتھ بازار گئیں...... دکان دار نے میڈم سے سوال کیا...... کس کے لئے انگوٹھی چاہیے...... وہ ہنس کر بولیں...... ان کے لئے...... سُن کر پہلے تو سب ہکا بکا رہ گئے پھر خوشی کی ایک لہر پھیل گئی۔ ماحول ہی بدل گیا...... دوکان والوں نے فوراً مٹھائی منگوائی...... پھولوں کے ہار

منگوائے۔آس پاس کی دُکانوں سے بھی لوگوں کو اکٹھا کیا اور سب نے مل کر ان دونوں کی منگنی کی رسم ادا کی......اس انوکھے ملن پر سب خوش ہوئے۔کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ ہر انسان کو ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے......

گیان ایک دم بولا...... آنٹی آپ میرے ڈیڈی کی ساتھی بن جایئے ساری مشکلات کا سب سے آسان حل یہی ہے۔آپ کی بیٹی بھی ہنسی خوشی اپنی سسرال چلی جائے گی۔نہیں یہ نہیں...... ہو سکتا...... میرا کالا سایہ جس پر بھی پڑے گا وہ برباد ہو جائے گا...... اماں کی آواز میں مایوسی تھی۔اُداسی تھی......

گوتم نے فوراً اماں سے سوال کیا...... یہ کالا سایہ کیا ہوتا ہے؟...... آپ نے ابھی تک ان وہموں کو اپنے دل سے جکڑ رکھا ہے۔یہ سب فضول کی باتیں ہیں۔زندگی مصیبت۔زندگی مسرت کبھی افسانہ مگر بے حقیقت...... یہ زندگی اپنے جینے کے لئے روز روز نئے راستے بناتی ہے۔جن پر زندگی کا کارواں رواں دواں رہتا ہے۔کوئی راستہ بے مقصد نہیں ہوتا۔زندگی کا کارواں آگے بڑھتا جاتا ہے۔کبھی کبھی اچانک ہی چلتے چلتے ساتھی چھوٹ جاتا ہے۔کوئی اور ساتھ ساتھ چل پڑتا ہے۔بس منزل بدل جاتی ہے۔اب آپ کو بھی نئے راستے پر چلنا ہوگا۔کب تک اس اندھیری ڈگر پر اکیلی چلتی جائیں گی۔اپنی تنہائی سے بیزار ہو کر ایک دن ہار جائینگی...... آپ بھی کسی کا ساتھ دیں کیونکہ یہی کائنات کا دستور ہے......

اماں بولی کچھ نہیں بس رو پڑیں۔ان کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے صاف ظاہر تھا کہ دنیا کے سامنے بہادری کی اوڑھنی تلے وہ بھی ایک کمزور اور بے بس عورت ہیں حالات جس کا امتحان لیتے رہتے ہیں اور سماج ڈراتا رہتا ہے......

اماں تھوڑا سنبھلیں تو گوتم نے کھڑے ہو کر کہا...... بہت سے کام کرنے ہیں۔آج ہی امریکہ سے باراتیوں کا قافلہ بھی آنے والا ہے۔آپ بالکل بے فکر رہیں پاپا نے سارے انتظامات مکمل کر دیئے ہیں۔ہم تینوں اپنوں کی تلاش میں نکل پڑے......

شام کو دروازے پر بھیڑ دیکھ کر اماں ٹھٹھا گئیں۔اپنی سوتیلی ماں اور ساس کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکی کہ لڑکھڑا ہی گئیں۔ان دونوں نے لپک کر اماں کو تھاما...... نہ جانے کونسی جادو بھری سُر اُن کے کانوں میں پھونکی کہ پل میں اماں کا چہرہ کھل اٹھا...... نہ کوئی شکوہ نہ شکایت...... سُسر جی کو دیکھا تو حیرانی سے آگے بڑھیں......اُن کے چرن چھو کر جیوں ہی اماں نے سر اٹھایا اپنے قریب ایک پولس افسر کے ساتھ کئی اور لوگوں

کو کھڑا دیکھ کر پیچھے کھسک گئیں...... گرنے ہی والی تھی کہ افسر نے ان کا بازو تھام لیا۔ نہ جانے کیا کشش تھی اس لمس میں۔اماں کے آنسو بہہ نکلے۔ پولس افسر نے اپنا ڈنڈا ہلاتے ہوئے اماں سے سوال کیا بیٹیا آج یہ جشن کس خوشی میں منایا جارہا ہے۔اماں تو اُن کا منہ ہی دیکھتی رہ گئیں۔اور میں نے کہا۔آج ملن کا دن ہے۔ پولس افسر نے اپنے چہرے سے ماسک اتار دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اپنے نانا جی کو نہیں پہچان سکی تھی۔ جنہیں کچھ دیر پہلے میں نے دھوتی کرتے میں دیکھا تھا۔اپنی بیٹی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر۔ سینے سے لگا کر۔ ماتھا چوم چوم کر بولے اس بھیس میں رونا نہ میں تمہارے گھر کے اردگرد چکر کاٹتا تھا۔مگر آج ہمانی کو اپنی چھت کے نیچے کھڑا دیکھ کر میری نظروں میں پھول مہک اٹھے تھے۔......دل میں امید کی شمع جل اٹھی تھی......

میرے دادا جی بولے آتا تو میں بھی تھا مگر دروازے سے ہی لوٹ جاتا تھا۔ میں تمہیں غم پر غم نہیں نہیں دینا چاہتا تھا۔میری زندگی کس کشاکش میں گذری کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ جینے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر اس امید پر جیتا رہا کہ ایک دن تمہاری ماں خود چل کر تم سے ملنے آئے گی...... ہم مرد عورت کو کمزور سمجھتے ہیں۔ صرف دل بہلانے کا کھلونا...... مگر عورت جو مرد کو جنم دیتی ہے بہت شکتی شالی ہوتی ہے اس کی ضد کے سامنے مرد کی ایک نہیں چلتی...... عورت چاہے تو مٹا دے۔...... چاہے تو بنا دے...... میں مرد ہو کر بھی وہ نہ کرسکا جو تم نے کر ڈالا...... مجھے تم پر فخر ہے۔تم جیسی بچیاں جہاں بھی جاتی ہیں بہاریں اُن کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔محبت کی مہکار پھیلاتی ہیں۔دلوں کو روشن کرتی ہیں......

تب ہی اشوک آنکلا اور گیان کے ساتھ امریکہ سے آنے والے براتیوں کا قافلہ بھی آپہنچا......

میرے دادا جی نے ہم تینوں کو اپنے قریب کر کے کہا۔ ہمانی تو ہے ہی میری اپنی مگر آج سے تم دونوں بھی میرے اپنے ہو۔آج ہمانی کی ماں کی منگنی تمہارے پاپا کے ساتھ ہوگی......اور کل دونوں کی شادی......

میں گھبرائی کہ نہ جانے میرے سسر کا کیا رویہ ہوگا۔وہ بولے دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہمارا بدلنا بھی ضروری ہے۔اس ہی میں ہم سب کی بہتری ہے......

گیان پھولوں کے ہار اور منگنی کی انگوٹھیاں لے کر کھڑا کہہ رہا تھا...... ہمانی اب تم بے خوف وخطر امریکہ جاؤ...... تمہارا اپنی ماں کو دلہن بنانے کا سپنا پورا ہوگیا......

☆☆☆

تلاش۔ڈالرز کی

میری یہ مختصری کہانی میری ہی زبانی آپ کا دل دہلادے گی...... سنگدل دغاباز۔کمینہ ذلیل۔ لعنتی اور نہ جانے کیا کیا گھٹیا نام مجھے عطا کریں گے۔ میرے منھ پر تھوکیں گے۔ میرے سر پر جوتے برسائیں گے اور مجھے ٹھوکریں مار مار کر رسواوخوار کریں گے اور میں بس اتنا ہی کہونگا...... یاروتم میرے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرو کیونکہ میں نے جو نیچ اور گھنونی حرکتیں کی ہیں ان کے لئے یہ سزائیں بہت کم ہیں......

میں نے وہ ہولناک جرم کیا ہے جس کی پاداش میں مجھے سرعام۔چوراہے پر سنگسار کروتا کہ میری موت لوگوں کے لئے ایک عبرت بن جائے۔اگر میں انسان کا مجرم ہوتا تو انسانوں کی عدالت گاہ میں کھڑا ہوتا۔ انسان مجھے مجرم ٹھہراتا۔میرے لئے سخت سے سخت سزا تجویز کرتا۔مگر میں نے اپنے بھگوان سے غداری کی ہے۔غدار کی سزا صرف موت ہے۔موت تو بھگوان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔مگر اب میں موت سے کیونکر ڈروں۔میں زندہ ہی کب ہوں۔مجھے مرے تو مدت ہوگئی۔مجھے کسی جلاد نے پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھایا۔میں وہ خونخوار مجرم ہوں جس نے اپنے آپ کو قتل کرڈالا۔اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودی اور اپنی بے کفن لاش کو ایک گہری تاریک قبر میں دفن کیا ہے۔

میں جانتا ہوں کوئی بھی مجھ جیسے ذلیل شخص کی بات پر یقین نہیں کریگا۔میں سچ کہتا ہوں میں شروع سے ایسا خود پرست اور خودغرض نہیں تھا۔میں بھی ایک سیدھا سادہ دیسی لڑکا تھا۔اپنے دیس باسیوں کی طرح میں بھی اپنے ماں باپ کی پوجا کرتا تھا۔اپنے ماں باپ کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔اُن کی زندگیوں کی روشنی اور ان کا غرور تھا۔کہیں بھی ہوتا اُن کے دلوں کی دھڑکنوں میں سمائے رہتا تھا...... ان کا ہر حکم بجالانا۔ ان کی ہر خواہش پوری کرنا میری زندگی کا مقصد تھا......

میرے والدین پڑھے لکھے تھے مگر ان کے پاس یونیورسٹی کی بڑی بڑی ڈگریاں نہیں تھیں۔ دونوں کی دلی خواہش تھی کہ میں خوب پڑھوں اور ڈگریاں حاصل کروں۔دونوں برسر روزگار تھے۔ایک پشتینی مکان تھا۔ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔نا کوئی غم تھا نہ پریشانی۔ہم تینوں اپنے حال میں آسودہ اور شادماں تھے۔ ہمیشہ ہمارے چہروں پر ہنسی اور زبانوں پر راگنی رہتی تھی۔میرے ماں باپ کی زندگی کا مقصد صرف میری سرفرازی تھی۔میں ذہین تھا سوان کا خواب پورے کرنے کے لئے میں نے دل وجان سے کڑی محنت کی اور مجھے نیویارک کی ایک یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل گیا......

بڑی بڑی موٹریں۔ عیش و آسائیشوں کے سامانوں سے بھرے بڑے بڑے عالیشان مکانات قیمتی لباس اور کھانے کی بھرمار دیکھ کر میری زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ امریکہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ جی چاہا میرے پاس بھی جادو کی چھڑی ہوتی جسے ہلاتے ہی مجھے بھی یہ سب مل جاتا۔ اسی چاہت نے مجھے ڈالرز کمانے کا دیوانہ بنا دیا۔ آہستہ آہستہ ذہن میں ڈالرز کی چمک بڑھتی گئی اور دل کے رشتوں کی روشنی مدھم ہوتی گئی...... یہاں تک کہ ماضی کی یادیں دھند لا گئیں۔ پھر نہ جذبوں کا احساس رہا۔ نا رشتوں کا پاس۔ ماں باپ کے ساتھ رہنے کی خواہش۔ اُن کی خدمت بجالانے کا خیال۔ ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کا خواب، خواب بن کر ہی رہ گیا۔ مشینوں کے اس وشال دیس میں رہتے رہتے میرا دل بھی مشین کا ایک پرزہ بن گیا...... وہ سب کچھ جو میری آنکھیں چاہتی تھیں میں نے حاصل کر لیا، اپنے دل کو کسی طرح کی خوشی سے نہ روکا......

میں 6 فٹ لمبا۔ سانولے رنگ کا اسمارٹ جواں مرد ہوں۔ لڑکیاں میرے اردگرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتی تھیں...... مگر مجھے امیر باپ کی بیٹی کی تلاش تھی۔ سیما اور روپا دیکھنے میں تو یوں ہی تھیں مگر امیر کبیر باپ کی بیٹیاں تھیں۔ دونوں بلا کی گھمنڈی اور مزاج کی بیحد تند و تیز، امریکہ میں پیدا ہوئی تھیں سو دونوں نے سارے امریکن چلن سیکھ لئے تھے۔ سیما کی شادی پر اُس کے فادر نے لاکھوں ڈالرز خرچ کئے تھے مگر سیما کے گھمنڈ اور بد مزاجی کی وجہ سے یہ شادی دو ماہ بھی نہیں ٹک سکی تھی۔ میری نگاہ روپا پر جا ٹکی......

بڑے اطمینان سے گذر بسر ہو رہی تھی۔ اچانک میرے فادر کی بیماری کی خبر نے ہلچل مچا دی۔ اماں نے فوراً وطن لوٹنے کا آڈر دیا۔ میں نے اماں کو سمجھا دیا کہ نا ہی میرے پاس ٹکٹ کے پیسے ہیں اور نا ہی مجھے چھٹی مل سکتی ہے۔ پاپا کا علاج سب سے اچھے ڈاکٹر سے کروانا...... میں قرضہ لے کر اُن کے علاج کے لئے روپیہ بھیج دونگا...... اماں بیچاری سسکتی رہ گئیں۔ ان کی آہوں کا میرے دل پر قطعی اثر نہیں ہوا۔ نا کچھ ملال ہوا اور نا ہی اپنے کئے پر شرمسار ہوا۔ اپنے دل کو یہ سوچ کر تسکین کر لی اور مطمئن ہو گیا کہ اماں پاپا کا علاج کسی اچھے ڈاکٹر سے ضرور کروائیگی۔ پاپا کو میری نہیں ایک اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے......

ایک سال یوں ہی بیت گیا۔ میرے ماں باپ دیس میں تکلیفیں اور مصیبتوں میں گھرے تھے اور میں امریکہ کی آسائیشوں میں ڈوبا ایسا مگن تھا کہ مجھے اُن کے دکھوں اور مصیبتوں کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ میں اپنی ذمے داریوں سے غافل ہوتا گیا۔ جب فادر کی ڈ-تھ کی خبر ملی تو اپنے دل کو یہ سوچ کر بہلا لیا کہ جانے والا تو چلا گیا اب وہاں جا کر کرونگا بھی کیا۔ بے چاری اماں پھر تڑپتی رہ گئیں......

اماں کی ضد تھی کہ میں دیس لوٹ آؤں اور اُن کی پسند کی لڑکی سے شادی کروں۔ میں کسی حال میں بھی ڈالرز سے بھرے دمکتے ملک میں رہنے کا سنہرہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔ دہشت گردوں کے حملے کے بعد امریکہ میں سرکار نے قانون بہت سخت کر دیئے تھے۔ ملک میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھی جانے لگی تھی...... میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری ماں کو امریکن ویزا کبھی نہیں ملے گا۔ اگر کبھی آ بھی گئیں تو روپا انہیں دو دن سے زیادہ اپنے گھر میں ٹکنے نہیں دے گی......

گرین کارڈ ملا تو میرا سب سے بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب میں بے روک ٹوک امریکہ آ جا سکتا تھا۔ میں ماں سے ملنے ہندوستان گیا۔ اپنی ساری الجھنوں سے آزاد ہو کر میں نے نیویارک کی فلائٹ پکڑی۔ سارے راستے نیند ہی نہیں آئی۔ کیسے آتی آنکھوں میں تو شادی اور جہیز میں لاکھوں ڈالرز پانے کے سپنے سجے تھے۔ دل بے قابو تھا اور دماغ سن۔ عجب حالت تھی۔ خیر۔ خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا۔

میں بڑی بیقراری سے نیوریارک ائیر پورٹ پر کھڑا روپا کی راہ تک رہا تھا...... وہ تو آئی نہیں...... اُس کا فون آیا۔ عجب سی مایوسی اور درد بھری آواز میں کہنے لگی...... ابھی ابھی انڈین چینل۔ ٹی۔ وی پر دکھا رہے ہیں کہ پچھلی رات ایک بیٹا اپنی بیوہ ماں کو نیویارک لانے کے بہانے اپنے ساتھ دہلی ائیر پورٹ لایا...... ماں کے ہاتھوں میں جالی پاس پورٹ اور جالی ائیر ٹکٹ تھما کر غائب ہو گیا...... بیچاری بے سہارا عورت نے رو رو کر ساری رات انتظار کیا۔ صبح پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا اُس کا بیٹا جا چکا تھا۔ تب ماں نے بتایا کہ میرے بیٹے نے چپکے سے میرا پشتینی مکان بیچ کر اور میرا بینک خالی کر کے مجھے بھکارن بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ بے سہارا عورت کی درد بھری کہانی سن کر سب لوگ کانپ اٹھے۔ اُن لوگوں نے اس عورت کی مدد کی اور اُسے اُس کے پشتینی مکان پہنچایا...... وہاں لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ہچکچائی۔ آپ بیتی کہنے سے شرمائی...... ائیر پورٹ والوں نے سارا قصہ سنایا...... تب وہ بولیں...... میرا نا کوئی اپنا ہے اور نا ہی کوئی ٹھکانہ ہے...... مجھے آپ ایک کمرہ کرائے پر دے دیں۔ میں اگلے مہینے پنشن ملتے ہی آپ کا قرضہ چکا دونگی...... گھر کی نئی مالکن بولی۔ اماں جی...... آپ کی نیکیوں کے چرچے ہیں ہم سب خوش قسمت ہیں جو بھگوان آپ کو واپس یہاں لے آیا ہے...... ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے...... یہ آپ کا پشتینی مکان تھا۔ ہے اور ہمیشہ رہے گا...... یہ سب لوگ آپ کے لئے نہایت پریشان تھے۔ آپ بغیر بتائے چلی گئی تھیں۔ ہم سب آپ کے ہیں اور آپ ہماری ہیں...... آئندہ کبھی نہ کہنا کہ آپ کا اس دنیا میں کوئی نہیں...... آج سے ہم سب آپ کی دیکھ بھال کریں گے......

پر اچانک ہی اُس کی آواز میں حقارت اور کرختگی در آئی...... وہ سوال پر سوال کر رہی تھی۔

بولو...... تم خاموش کیوں ہو...... وہ چیخ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا میں نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے چھپا کر یہ سب کیا تھا۔ ناس ہو اس میڈیا کا جس نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی یہاں سب کو خبر پہنچادی...... وہ پھر چیخی...... تم بولتے کیوں نہیں...... تمہاری خاموشی بول رہی ہے۔ تم ہی وہ انوراگ ہو جس نے اپنی ماں کے ساتھ یہ نیچ حرکت کی ہے۔ جو اپنی ماں کے ساتھ غداری کرسکتا ہے وہ کسی غیر کے ساتھ کیا وفا کرے گا۔ میں تم جیسے رذیل اور ظالم آدمی کا چہرہ کبھی نہیں دیکھونگی۔ ارے کیا تم خود اپنا چہرہ آئینہ میں نہ دیکھ سکو گے۔ جاؤ جا کر کہیں ڈوب مرو...... میرے قدم ڈگمگانے لگے...... میرا روم روم کانپ رہا تھا...... میرے اندر ایک عجب سی تاریکی پھیل گئی یوں لگ رہا تھا اندر باہر گہرا اندھیرا چھایا ہے۔ میرے اندر ایک عجب سا ہولناک سناٹا پھیل گیا کہ میں خود سے ڈر گیا...... سانس لینا دشوار ہو گیا۔ جسم بے جان ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میری رگوں میں لہو کا ایک قطرہ بھی نہیں بچا ہو۔ بامشکل تمام میں اپنی لاش کو کھینچ کر اپنے گھر لے آیا...... یہ گھر گھر نہیں ہے۔ یہ تو وہ گہری قبر ہے جو میں نے اپنے ہاتھوں سے کھودی ہے......

اپنی ماں کو بے گھر کر کے ان کی پناہ گاہ چھین کر اب میرے لئے بھی کہیں پناہ نہیں رہی۔ اپنی ماں کو زندگی کا سب سے بڑا دکھ دیکر میں بھی گہرے غم اور دکھ میں مبتلا ہوں...... جس اذیت سے میں گذر رہا ہوں وہ میری برداشت سے باہر ہے میں اُسے کسی حال بیاں نہیں کرسکتا۔ میری جاں کی کسی کو فکر نہیں رہی۔ میں وہ بدنصیب بیٹا ہوں جس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں...... میں سدا تنہا بے راہ ویرانے میں بھٹکتا رہونگا......

بامشکل تمام میں نے بتی کا بٹن دبایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا میری اماں قیمتی صوفے پر بیٹھی کہہ رہی ہیں۔ تو نے میرا سب کچھ چھین کر سوچا تھا کہ میں تجھ کو چھوڑ دونگی...... میرے لال میں تیری ماں ہوں اور ماں کو اُس کی اولاد سے کوئی جدا نہیں کرسکتا...... نا میری ناغریبی اور نا فاصلے یہاں تک کہ موت بھی نہیں...... جب تک زندہ رہونگی تیرے آس پاس رہونگی اور مرنے کے بعد میری ماتا اور میری دعائیں تیری حفاظت کریں گی......

میں آگے بڑھا...... میرے قدموں میں شدید لڑکھڑاہٹ ہوئی۔ میں منہ کے بل گر پڑا۔ بلک بلک کے روتا رہا...... گڑگڑاتا رہا۔ پچھتاتا رہا۔ مگر کوئی مجھے تسلی دینے والا نہ تھا......

میں جانتا ہوں جب انسان اپنا اعتبار کھو دیتا ہے تب اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں رہ جاتی۔ وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاتا...... میں سب کچھ کھو چکا ہوں اب میری اس قبر پر کوئی کبھی پھول چڑھانے نہیں آئے گا......

کاش آسمان سے انگارے برسیں اور میں بھسم ہو جاؤں...... میری خاک کا ذرہ ذرہ بولے جو عظیم گناہ میں نے کیا تم نہ کرنا...... ☆☆☆

تلاش۔اپنے گھر کی

میری یہ مختصر سی کہانی میری ہی زبانی اگر میرے جیسے بد بخت مردوں کے دلوں میں پیوست ہو جائے تو وہ اس مہلک آگ سے بچ سکیں گے جس میں میں پل پل جل رہا ہوں۔ میں جو دُکھ ملامت اور توہین سہہ رہا ہوں وہ ناقابل برداشت ہے۔ الجھن وندامت اور شرمندگی سے میری زبان گنگ ہے۔ اپنے اس پشتینی مکان کی اونچی اونچی دیواروں میں بس میں ہوں۔ میری تنہائی اور کچھ میرے بچپن اور جوانی کی رنگا رنگ بھولی بسری یادیں ہیں۔......

میں بھی اپنے والدین کا فرمانبردار۔ سعادتمند اکلوتا بیٹا تھا۔ بڑی خوشحال زندگی تھی۔ دنیا بھر کی نعمتیں مجھے میسر تھیں۔ جب خوشخبری ملی کہ اماں نے رانی کو میرے لئے چنا ہے تو من چاہی مراد جیسے میری جھولی میں آ گری۔ حُسن کی مورتی کو آنکھوں میں شوخیوں کی بہاریں لئے اپنے کمرے میں دیکھ کر میں بے حواس ہو گیا۔ بے خودی کے عالم میں اپنے دل کی دھڑکنوں کا پیغام دے ڈالا کہ کالج کے زمانے سے ہی میں اس چاند کو تکتا آیا ہوں اور آج فلک کا چاند میرے گھر میں اتر آیا ہے۔ آج سے یہ گھر تمہارا ہے۔ اس گھر کا ہر فرد تمہارا ہے۔ مجھے اپنی اماں سے زیادہ کوئی اور اس دنیا میں پیارا نہیں...... انہیں خوش رکھو گی تو میں تمہارا دامن خوشیوں سے بھر دونگا...... منزل دور ہے اور راہ کٹھن...... لاکھوں مشکلیں آئیں گی ہم دونوں مل جل کر ہر مشکل آسان کر لینگے...... وعدہ کرو۔ ہر قدم پر تم میرا ساتھ دو گی...... وہ ہاں بولی نہ نا بس دل پذیر انداز میں مسکرائی۔ میں اس کی مسکراہٹ پر نثار ہو گیا محبت کے رنگ نے میرے اندر ایک نئی ترنگ پیدا کر دی......

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ محبت میں انسان اپنے ہوش وحواس۔ دل دماغ سب کھو بیٹھتا ہے۔ پھر نہ اُسے اپنی حیثیت کا خیال اور نا ہی اپنی اور کسی اور کی عزت کا خیال رہتا ہے۔ وہ ہر سانس پر اپنے محبوب کا نام لیتا ہے۔ میں بھی رانی کی انوکھی اور نرالی اداؤں کا ایسا اسیر ہوا کہ اپنا آپا ہی بھول گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں عورت کی فطرت سے ناواقف تھا کہ وہ پہلے اپنی محبت کا جال بچھاتی ہے۔ جب مرد اس کی محبت کا اسیر ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ مرد کے ذہن اور دل کے ہر تار پر قابو کر کے اُسے اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچاتی ہے۔ میرا اپنا خیال تھا کہ میاں بیوی کا رشتہ اٹوٹ اور مستحکم ہوتا ہے اور اعتماد اس رشتے کی ضمانت

ہے۔ سو میں رانی پر اندھا بسواس کرنے لگا۔ وہ جو بھی کہتی میں یقین کرتا گیا۔ اس کی محبت میں میرا دل شاد اور سرشار تھا میرے ذہن کا رُخ دوسری طرف پلٹا ہی نہیں کہ عورت فتنہ ہوتی ہے۔ آدمی کے پرزے پرزے کر دیتی ہے۔ خاندانوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے......

شادی کے بعد کچھ مہینے آرام سے گذرے۔ پھر اماں کے نظام میں دخل اندازی۔ نوکروں کے ساتھ نوک جھوک اور پھر گلے شکوؤں کا دور شروع ہوا۔ میں نے کہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر یوں ہنگامہ برپا کرنا تمہیں شوبھا نہیں دیتا...... پڑھی لکھی ہو۔ عقل سے کام لو۔ اماں نرم دل اور خاموش طبیعت کی مالک تھیں۔ سب کا خیال رکھنے والی سب سے محبت کرنے والی وہ سب دیکھتی رہیں۔ سب سنتی رہیں خود کچھ نہیں بولیں۔ ایک دن میں نے کہا اماں کچھ پریشانی ہے کیا۔ تو بولیں...... نہیں...... نہیں...... کچھ پریشانی نہیں۔ لگتا ہے تمہیں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ مجھے رانی کے ناخاندان کا پتہ تھا نہ نیت کا...... ایک دن بولی...... اس گھر میں میرا دم گھٹتا ہے...... یہاں سے کہیں اور چلو...... میں نے کہا یہ گھر آسودگی اور آسائش کا کاشانہ ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤنگا...... مجھے جو سکون یہاں ملتا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ملتا...... وہ تو بھری بیٹھی تھی۔ جھنجھلا کر بولی...... یہ گھر...... تمہارا نہیں اماں کا ہے۔ بس میں چیخ پڑا۔ جو کچھ اماں کا ہے سب میرا ہی ہے۔ وہ بولی تمہارا ہوگا پر میرا نہیں ہے۔ میں نے کہا مجھے حیرت ہے کہ تم جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کی سوچ اتنی گھٹیا ہے۔ تم اماں کے بیٹے پر پورا قبضہ جمائے بیٹھی ہو اور کہتی ہو کہ اماں کا گھر تمہارا نہیں ہے۔ اماں کے بعد تم ہی اس گھر کی مالکن ہوگی۔ دوسرے گھر کے سپنے دیکھنے چھوڑ دو...... کیونکہ مجھ جیسا معمولی سا بندہ گھر بنانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ یاد رکھو مکان...... اور دھن دولت وہ خوشیاں نہیں دے سکتیں جو اپنوں کی محبت دیتی ہے۔ رشتوں کو پہچانو۔ رشتوں کا احترام کرو اور جڑ کر رہنا سیکھو ورنہ بہت کچھ بتاؤ گی......

اسی نوک جھونک کے درمیان وقت گذرتا گیا۔ ہمارے تین بیٹے ہوگئے۔ گھر میں خوشیاں دوڑنے لگیں۔ اماں کو تو جیسے دونوں جہاں مل گئے۔ رانی کا روّیہ اور خراب ہوگیا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر طوفان برپا کر دیتی۔ ماں کا لحاظ قطعی نہیں کرتی۔ کچھ رشتے مجبوری کے تحت قائم رکھنے پڑتے ہیں۔ رانی میرے بیٹوں کی ماں تھی مگر جی کا جنجال بن گئی تھی پھر بھی میں اُس کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارا گھر...... گھر نہیں رہا...... رن بھومی بن گیا تھا...... مگر یہ جنگ ایک طرفہ تھی۔ میری خوشیوں کی خاطر اماں نے ہونٹ سی لئے تھے۔ زبان پر تالا لگا لیا تھا......

میرا ٹرانسفر ہوا تو رانی نے ساتھ جانے کی ضد باندھ لی۔ میں نے کہا نئی جگہ میں معلوم نہیں

حالات کا رخ کس طرف جائے۔ وہ بولی جو بھی ہو تم اکیلے نہیں جا سکتے...... میں نے کہا بھئی مجھے تو جانا ہی ہوگا۔ گھر میں بیٹھ کر تمہارا دل بہلاؤنگا تو ہم سب کھائیں گے کیا۔ وہاں چھوٹا فلیٹ ملے گا تمہیں وہاں یہ عیش وآرام میسر نہیں ہوگا۔ وہ بولی...... نا ہو نہ سہی...... وہ میرا اپنا گھر ہوگا...... اور اماں کو بھی میں اکیلا چھوڑ نہیں سکتا...... ہر ماں بیٹے کو جنم دے کر سوچتی ہے کہ وہ اجل تک اس کا ساتھ دے گا۔ تم بھی یہی سوچتی ہوگی۔ اماں میری ذمے داری ہیں...... وہ تنک کر بولی میں اور میرے بچے بھی تمہاری ذمے داری ہیں۔ حیرت ہے تم ہمیں چھوڑ سکتے ہو اپنی اماں کو نہیں...... میں نے کہا بیٹے کے بنا ماں کا جیون کچھ نہیں ہوتا۔ بچوں کے بغیر اماں کا دم نکل جائے گا۔ ذرا سوچو...... اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم اماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ماں کا دل ٹوٹے گا تو باقی کیا بچے گا۔ وہ بولی سوچ لیا۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں نے کہا جب انسان خود غرض ہو جاتا ہے تو بربادی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا...... جو تم کرنے جا رہی ہو اس کے نتائج بہت خوفناک ہوں گے...... تمہیں اس ظلم کا حساب خدا کو دینا ہوگا...... وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی...... بولی جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا...... پھر میں نے بھی سوچا ایسی ضدی عورت اماں کو دکھ ہی دکھ دے گی...... اپنی ماں کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر میں چلا گیا......

نئی جگہ۔ نئے لوگ۔ آفس کی ذمے داریاں اور بچوں کے ہزار مسئلے...... میں حالات کے شکنجے میں اس بری طرح پھنس گیا کہ مجھے اپنا ہی ہوش نہیں رہا...... کچھ دنوں تک تو رانی نے مصنوعی مسکراہٹ کا خول اپنے چہرے پر سجا کر ساری مشکلات کا سامنا کر کے اپنی جیت کا مظاہرہ کیا...... گھر کے کام سنبھالتے سنبھالتے جب ناک میں دم آ گیا تو شکایتوں کا دفتر کھلا...... میں نے کہا تمہاری خاطر میں رشوت ہرگز نہیں لونگا۔ مجھ میں نوکر رکھنے کی حیثیت نہیں...... اماں کے گھر کا آرام اور عیش تمہیں راس نہیں آیا۔ اب گذارو فقیروں جیسی زندگی۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے...... تم جانو...... مجھ سے کچھ امید نہیں رکھنا......

سچ تو یہ تھا کہ اماں سے جدا ہوتے پل جو بجلی میرے گھر پر گری تھی اس میں میرے سارے کے سارے خواب جل جلا کر راکھ ہو گئے تھے۔ میں بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور مجھے سمیٹنے والا کوئی نہیں تھا۔ جب بھی اپنے گھر جانے کی سوچتا رانی کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑا کر دیتی۔ اور یوں سالوں پر سال گذر گئے۔ میں اپنے کیے پر اس درجہ نادم اور شرمندہ تھا کہ پھر گھر کی طرف رخ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی......

میرے تینوں بیٹے شادیاں کر کر کے اپنے اپنے گھروں میں جا بسے۔ گھر کی خاموشی ڈرانے لگی۔

رانی کی صحت بگڑنے لگی۔ علاج بہت کروایا مگر کسی دوا کا اثر نہیں ہوا۔ ماں کے دل کے درد کی دوا تو بیٹوں کے ہاتھوں میں تھی اور بیٹے کہاں جا بسے تھے ہمیں خبر نہ تھی۔ رانی دن رات اکیلی بیٹھی کھڑکی سے باہر جھانکتی رہتی۔ کراہتی رہتی۔ آہیں بھرتی رہتی...... آنسو ٹپکاتی رہتی۔ ایک دن رو رو کر بولی میری ساری تدبیریں الٹی ہوگئیں...... میری ہی چالوں اور میرے ہی کاموں سے یہ مصیبت میرے پر آئی ہے۔ یہ بہت تلخ ہے اس کی تلخی میرے دل کی تہہ تک پہنچ گئی ہے۔ میرا خاندان تتر بتر ہو گیا یہ تو ہونا ہی تھا۔ بیج تو میں نے ہی بویا تھا...... اب فصل بھی مجھے ہی کاٹنا ہوگی...... وہ ہار گئی تھی۔ آخر اس دُکھ نے اُس کا کام تمام کر دیا۔ خاموشی سے اپنے دُکھوں کے سمندر میں غرق ہوگئی......

فلیٹ چوکیدار کے حوالے کر میں تہی ہاتھ تہی دامن اپنے گھر لوٹ آیا۔ جہاں اماں تھیں۔ سکون ہی سکون تھا۔ مگر یہ کیا...... یہاں بھی کچھ نہیں تھا...... میں ہراساں ہوں کہ میں کچھ سن نہیں سکتا...... ایسا پریشان ہوں کہ کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے اور ہول میرے اوپر غالب آ گیا۔ یہاں کی خاموشی میرے لئے خوفناک ہوگئی ہے۔ ''بابو جی آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ اماں جو بہت دردناک موت مری ہیں۔ آخری دم تک آپ کا ہی نام پکارتی رہیں'' یکایک گہری تاریکی چھا گئی۔ میں تھر تھر کانپ اٹھا۔ آنکھیں برسنے لگیں۔ ویران دیواروں سے ویرانی ہی ویرانی برسنے لگی۔ جانکنی اور غمگینی نے مجھے آن لیا۔ ''بابو جی یہ چابیاں'' میں چونک اٹھا...... دھیرے دھیرے آگے بڑھا...... لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ اندر گیا۔ اماں کے پیار کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ اُن کی دھیمی دھیمی پیار بھری آواز گونجی...... میں کہیں نہیں گئی۔ میں تو تیرے ساتھ ہوں۔ ماں کو بیٹے سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ میری ممتا اور میری دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی......

میں تڑپ رہا ہوں۔ اپنی ماں کے قدموں کی دھول چومنے کے لئے، میں پیاسا ہوں۔ اپنے پیاروں کی محبت کے چند قطروں کے لئے ترس رہا ہوں...... مگر ویرانی اور سنسانی میرے نصیب میں آئی ہے میں رشتوں سے بھری اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ بالکل اکیلا......

غم سے مرتا ہوں کہ اپنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد۔

غالبؔ کا شعر یاد آیا۔

خدا جزا اور سزا لئے آتا ہے میں اس سزا کا سزاوار ہوں

☆☆☆

تلاش۔اصلی سکون کی

میری یہ مختصری کہانی میری ہی زبانی شاید میری جیسی احمق اور سرپھری لڑکی کو اپنی روش بدلنے پر مجبور کردے اور وہ اپنے اور اپنے خاندان کو اُن ساری آفتوں اور مصیبتوں سے بچالے جو میں نے اور میرے خاندان کے لوگوں نے سہی تھیں......

ہم دو بہنیں تھیں۔ میری دیدی کی شادی ڈیڈی کے جگری دوست کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی جو ایک نہایت خودغرض اور بداخلاق انسان تھا۔ دیدی کی سسرال اُن کے لئے جہنم سے کم نہیں تھی۔ انہیں اپنی سسرال میں نا کوئی مقام حاصل ہوا اور نا ہی شوہر کا پیار ملا۔ جب وہ بیماری کی حالت میں ہمارے گھر بھیج دی گئیں تب ڈاکٹر نے ڈیڈی کو بتایا کہ آپ کی بیٹی بہت ذہنی دباؤ کا شکار ہے اور یہ مسلسل ذہنی دباؤ اُس کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ می بُری طرح خوفزدہ ہو گئیں۔ می دیدی کو اُن ظالموں کے ہاتھوں سے رہائی دلوانا چاہتی تھیں مگر ڈیڈی طلاق کے سخت خلاف تھے۔ ڈیڈی نے سختی سے کہا کہ داماں جیسا بھی ہو اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ اب وہ ہماری بیٹی کے اکلوتے بیٹے کا باپ بھی ہے۔ جنم ماں دیتی ہے مگر بیٹا اپنے باپ کے گھر کا چراغ ہوتا ہے۔ کوئی اپنے گھر کا چراغ کسی دوسرے گھر کو روشن کرنے کے لئے نہیں دے سکتا...... طلاق ہوتے ہی تمہاری بیٹی اپنے بیٹے کو کھودے گی۔ جس طرح تم اپنی بیٹی کے لئے بے چین ہو طلاق کے بعد تمہاری بیٹی اپنے بیٹے کے لئے تم سے بھی بہت زیادہ بے چین ہوگی۔ تڑپے گی۔ آنسو بہائے گی بیٹے کو دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں ترس جائیں گی مگر اُس سے کبھی نہ مل پائے گی اور نا ہی دیکھ پائے گی۔ اُس کی دوسری شادی کے سپنے دیکھنے چھوڑ دو۔ طلاق شدہ ایک بیٹے کی ماں کو کوئی نہیں اپنائے گا۔ وہ جس حال میں ہے اُسے اسی حال میں جینا ہوگا...... میں کئی طوفانوں سے گذر چکا ہوں۔ کورٹ کچہری کے چکر لگا کر تھک گیا ہوں۔ اب مجھے اپنی عزت اور اپنے گھر کے چین اور سکون کی فکر ہے۔ آئندہ یہ چھوڑا چھاڑی کا ذکر اپنی زبان پر نہ لانا۔ اگر اُس کے سسرال والوں کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو انجام بے حد خوفناک ہوگا۔ وہ لوگ تمہاری بیٹی کو اس دہلیز پر پھینک جائیں گے اور دوبارہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ پھر یہ گھر تمہاری بیٹی کے لئے ایک جہنم سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ صبر سے کام لو۔ کچھ سالوں میں اُس کا بیٹا جوان ہو جائے گا۔ جوان بیٹے

ماں کی ڈھال ہوتے ہیں۔ ممی تو خاموش ہوگئیں مگر ڈیڈی کی باتوں نے مجھے حیران اور پریشان کردیا۔ میں نے اسی وقت تہیہ کرلیا کہ میں ارینج میرج ہرگز نہیں کرونگی۔ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرونگی اوراپنی مرضی کی زندگی جیونگی......

میری اور راجا کی ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں ایک دوست کے گھر ملے۔ ہائے ہلو کے بعد میں نے اُس سے پوچھا شادی کی یا نہیں'' ...... وہ بولا پہلے تم بتاؤ ...... ''تمہیں کوئی پسند آیا یا ابھی تک مسٹر رائٹ کی تلاش جاری ہے''۔ میں نے کہا کھوج تو بہت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اب مسٹر رائٹ کی ہاں کی منتظر ہوں۔ اُس نے ہنس کر سوال کیا......کون ہے وہ خوش نصیب جس کی ہاں کی تم منتظر ہو۔ بے ساختہ ہی میرے منہ سے نکلا............ ''تم ......''میں''......''کیا مطلب''اُس نے حیران کن لہجے میں سوال کیا۔ مطلب یہ کہ میں تم سے شادی کرونگی......وہ گمبھیر لہجے میں بولا...... یہ نہیں ہوسکتا......تم پھولوں میں بسنے والی اور میں ایک معمولی سا بندہ...... جومنزل کی تلاش میں سرگرداں ہے اور راستہ ناہموار ہے۔ ناہی سر پر باپ کا سایہ ہے اور ناہی کوئی سیڑھی جس پر کھٹا کھٹ چڑھ کر اپنی منزل تک پہنچ جاؤں۔ مجھے اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے بے حد جدوجہد کرنا ہے۔ ایک ایک قدم آگے بڑھانا ہوگا۔ میرے ساتھ کھردری راہوں پر چلتے چلتے تمہارے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے......

فکر نہ کرو میرے ڈیڈی اپنی کسی کمپنی میں تمہیں اچھی سی نوکری دے دیں گے۔ یہ سنتے ہی اُس کے تیور بدل گئے۔ بولا میں غریب اور بے سہارا ہوں مگر کمزور نہیں۔ مجھے کسی کے رحم وکرم کی ضرورت نہیں ہے۔

میں سمجھ گئی وہ بہت حساس اور خود دار ہے۔ میرے رئیس بہنوئی کی طرح لالچی اور خودغرض نہیں ہے گھر میں میری شادی کی بات ہورہی تھی ڈیڈی نے مجھ سے کہا...... آج تمہیں اپنا آخری فیصلہ سنانا ہوگا۔ میں نے کہا میں آپ کو اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں اور میرا فیصلہ اٹل ہے۔ کسی کو پسند کرنا اور اُس کے ساتھ زندگی گذارنے کی خواہش کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ وہ چیخ کر بولے جس کے پاس اپنی چھت تک نہیں وہ تمہیں کیا سکھ دے گا۔ تمہارا اور اُس لڑکے کا کوئی ساتھ نہیں ہے۔ وہ تمہیں آرام اور آسائش مہیا نہیں کر پائے گا جس کی تم عادی ہو۔ عادتیں بدلنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا ڈیڈی محبت کاروباری معاملہ نہیں ہوتا اس میں سودوزیاں نہیں دیکھا جاتا۔ جو ہوگا سو ہوگا۔ اگر میرے ساتھ برا ہوگا تب بھی میں آپ کو اور راجا کو الزام نہیں دونگی کیونکہ راجا نے مجھے

اپنے خاندان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔

ڈیڈی کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کی انہوں نے مجھے بہت کڑی سزا دی۔ ممی ڈیڈی دونوں نے مجھ سے سارے رابطے توڑ ڈالے۔ یہاں تک کہ فون پر بھی بات کرنا گوارا نہیں کیا......

کرائے کا گھر تھا جسے میری ساس نے بہت سنوار کے رکھا ہوا تھا۔ وہ بے حد محنتی اور سلیقہ مند تھیں۔ گھر کے سارے کام خود ہی کرتی تھیں اور مجھے بھی اپنی طرح بنانا چاہتی تھیں۔ میرے لئے اُس ماحول میں ایڈ جسٹ کرنا بے حد مشکل تھا پر میں کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا مگر اُن کی ہر وقت کی ٹوکا ٹوکی سے میں بیزار ہو گئی تھی......

دو سال کے بعد جب میں ایک بیٹی کی ماں بنی تو ممی تحفے لے کر آئیں جو راجا کو بالکل پسند نہیں آیا۔ ممی آتی رہیں مگر ڈیڈی بچی کو دیکھنے نہیں آئے۔ ممی میرا گھر دیکھ کر بہت پریشان ہو گئی تھیں مگر میں نے کہا میں۔ یہاں آرام سے ہوں اور بہت خوش ہوں آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔

میرے اور میری ساس کے درمیان تلخیاں بڑھتی گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ راجا مجھے بہت پیار کرتا ہے اور جو بھی میں کہوں گی ضرور مانے گا میرا ساتھ دیگا......سو میں نے راجا سے کہا...... یہ روز روز کی چِک چِک سے گھر کا سکون جاتا رہے گا۔ تم اپنی ماں کو سمجھاؤ...... وہ تو ایک دم گرم ہو گیا۔ سخت لہجے میں بولا...... میں نے تم سے پہلے دن ہی کہا تھا کہ میری ماں کی اہمیت میری زندگی میں سب سے زیادہ ہے۔ میں اُن کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کرونگا...... میری خاموشی کو میری کمزوری مت سمجھنا۔ میں سب دیکھ کر بھی خاموش ہوں کیونکہ بہت سی باتوں کو لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم جیسی تعلیم یافتہ سمجھدار لڑکی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تمہیں خود معلوم ہے کہ بڑوں کے سامنے اونچی آواز سے بات نہیں کرتے......تم اپنی زبان درازی اپنے قابو میں رکھو۔ اور اپنا لہجہ درست کرو۔ تمہاری تند مزاجی نے اس گھر کا سکون درہم برہم کر دیا ہے۔ بڑوں کی عزت کرنا چھوٹوں کا فرض ہوتا ہے۔ آئندہ ہوشیار رہنا......

ڈیڈی ممی کے پیار سے محرومی اور ساس کی طعنہ زنی سے میں یوں بھی بہت پریشان تھی۔ پہلے ہی مرحلے پر راجا کا ساتھ نہیں ملنے پر میں مایوسی۔ تنہائی اور ناامیدی کا شکار ہو گئی۔ میرا بھروسہ میرا بھرم سب ٹوٹ گیا تھا۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ ہر شخص میرا دشمن ہے۔ حالات بری طرح بگڑتے گئے اور میری ساس گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد حالات بد سے بد ہوئے

گئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میں بھڑک جاتی۔ میرے اور راجا کے درمیاں فاصلے بڑھتے گئے۔ میرا اعتبار ایسا ٹوٹا کہ پھر مجھے خود پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ میں جو ہمیشہ کی ضدی تھی اپنے فیصلے خود کرتی تھی اپنی زندگی کا سب سے غلط فیصلہ کر لیا۔ راجا نے بہت منایا بہت روکا مگر میں نے اُس کی ایک نہ سنی تو ہار کر اُس نے کہہ دیا میں تمہیں تو نہ روک سکا مگر میری بیٹی اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔ بچی بلک بلک کر روتی رہی مگر میرا دل نہیں پسیجا میں دندناتی گھر کی دہلیز عبور کر گئی......

ڈیڈی مجھے دیکھتے ہی بولے میں جانتا تھا یہی ہوگا۔ خیر ہوا جو سو ہوا۔ تم اُس گھر کو بھول جاؤ اور یہاں رہ کر آرام کرو۔ میں خوش ہوں کہ تم سلامت لوٹ آئی ہو۔ اب تم اُس لڑکے سے اپنی جان چھڑاؤ......

جس گھر میں مجھے دلی سکون ملتا تھا وہی گھر مجھے قید خانہ سا لگنے لگا۔ بیٹی کی یاد۔ اپنے گھر کی یاد ہر وقت رُلاتی تھی۔ سمجھ نہیں آتا تھا کیا کروں......

ایک دن جب ممی اور ڈیڈی دونوں کسی ضروری کام سے باہر گئے میری پرانی آیا نے آکر مجھے کہا۔ کہ جو بات میں کہنے جارہی ہوں وہ تمہاری ممی کو تم سے کہنا چاہے تھا مگر انہیں تمہارے درد کا قطعی احساس نہیں ہے۔ تم بچپن سے ہی ضدی ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر واویلا مچاتی تھیں۔ اپنی بات منوا کر ہی دم لیتی تھیں۔ بچپن بیت چکا ہے۔ اب تم ایک ذمے دار عورت ہو۔ ایک بیوی اور ایک بچی کی ماں ہو۔ میاں بیوی میں چھوٹی موٹی تکراریں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اپنی رنجشوں کی سزا اپنی بیٹی کو نہ دو۔ ہر بچہ اپنے باپ کی چھت کے نیچے اپنی ماں اور باپ دونوں کی محبت کا حقدار ہوتا ہے، ماں اپنی اولاد کی پل پل کی خبر رکھتی ہے۔ تمہیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ تمہارے بغیر اُس ننھی سی جان پر کیا قیامت گذر رہی ہوگی، تمہارا تروتازہ چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ جب سے اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہو تمہاری جاں عذاب میں آگئی ہے۔ نہایت بے چین اور بے سکون ہو۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہتے ہیں۔ دل روتا ہے تو آنسو بہتے ہیں۔ دل غیروں کے لئے نہیں اپنوں کے لئے روتا ہے......

راجا بابو ایک سلجھے اور سمجھدار انسان ہیں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اگر نہ ہوتا تو وہ بچی کے ساتھ اسی شام تمہیں لینے نہیں آتے۔ تمہارے ڈیڈی نے انہیں بہت بے عزت کیا...... بولے کہ میری بیٹی تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ تم سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ تم یہاں سے نکل جاؤ اور اپنی بیٹی کو بھی لے جاؤ اور میری بیٹی کی جان چھوڑ دو۔ انہوں نے راجا بابو کی کو بلینک

چیک دے کر کہا کہ تمہیں آزاد کرنے کی جتنی رقم چاہیۓ لے سکتے ہیں۔ راجا بابو نے چیک کے پرزے پرزے کر دیئے۔ وہ دوسرے دن بھی آئے تھے۔ ڈیڈی نے ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا اور وہ ناامید ہو کر واپس چلے گئے۔ وہ تمہاری شادی اپنے کسی رئیس دوست کے بیٹے سے کروانا چاہتے ہیں۔ کوئی مرد کسی غیر مرد کی اولاد اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا...... اس لئے وہ تمہاری بیٹی کو تم سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ طلاق کے بعد تم اپنی بچی سے کبھی نہیں مل پاؤ گی۔ تمہاری بیٹی کو تمہارے پیار کی اور تمہاری ضرورت ہے اُس سے اُس کا حق مت چھینو...... جب دلوں کے رشتوں کے ریشمی دھاگے بری طرح الجھ جاتے ہیں تو انہیں خود آہستہ آہستہ بہت ہوشیاری سے سلجھانا پڑتا ہے۔ تم نے اپنا ذاتی معاملہ اپنے ڈیڈی کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ وہ تو شروع سے ہی تمہارے رشتے کے خلاف تھے۔ اُن کا وکیل وہی کرے گا جو وہ چاہتے ہیں...... وکیل صرف قانونی کاروائی کرتے ہیں انہیں کسی کے احساس اور جذبات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا...... محبت فتح نہیں خود سپردگی کا نام ہے۔ تمہارے اندر انا بھری ہے۔ انا محبت کی دشمن ہے۔ انا اور محبت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ تمہیں بدلنا ہوگا۔ بہت ہو چکا۔ وقت بہت گذر چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے اور تمہاری یہ ضد تمہارا سنسار پھونک ڈالے...... جاؤ۔ واپس چلی جاؤ۔ اپنے گھر۔ اپنے شوہر اور اپنی بچی کے پاس لوٹ جاؤ۔ کئی دن بعد مجھے لگا مجھے کوئی اپنا مل گیا ہے۔

آپا کی باتوں نے میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میرے دل میں ماں باپ کی جو امیج تھی سب پاش پاش ہوگئی۔ جیسے ہی ڈیڈی ممی وکیل چاچا کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے میں ان تینوں کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی اور ڈیڈی سے کہا آپ دیدی کے طلاق کے خلاف تھے۔ اب آپ کے خیالات کیسے بدل گئے...... انہوں نے مجھے تھام کر کہا بیٹا میں جو بھی کر رہا ہوں تمہاری بہتری کے لئے ہی کر رہا ہوں۔ اس لڑکے سے شادی کر کے تم نے میری عزت بھی خاک میں ملا دی اور خود بھی تکلیفوں کا سامنا کر رہی ہو۔ میں نے کہا دیدی مصیبتیں جھیل رہی ہیں اس پر بھی آپ اپنے بڑے داماد کی طرفداری اور خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کی کوتاہیوں پر پردہ ڈالتے ہیں...... راجا کے لئے آپ کے دل میں نفرت کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے نوکروں کے سامنے راجا اور میری بیٹی کو ذلیل اور ملامت کیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔ اُس سے جھوٹ بولا کہ میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ کیوں؟...... ڈیڈی...... کیوں کیا آپ نے ایسا......؟

وہ بولے کیونکہ بیٹا ہم تمہیں اُس بے کار آدمی کے ساتھ زندگی گذارتے نہیں دیکھ سکتے جس کا سوسائٹی میں کوئی اسٹینس نہیں۔ تمہارا اور اس لڑکے کا کوئی ساتھ ہی نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی عیش و آرام سے اپنی زندگای گذارو......

میں نے ممی سے کہا میں تو آپ کے وجود کا حصہ ہوں۔ حیرت ہے آپ کو بھی میری پریشانیوں اور دُکھ کا احساس نہیں ہوا۔ مانا کہ میں نے اپنا گھر چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا ملے گی۔ گھر چھوڑنے سے رشتے تو نہیں ٹوٹ جاتے۔ آپ کا فرض تھا مجھے میری غلطیوں کا احساس دلاتیں۔ بجائے اس کے کہ مجھے بدگمانیوں اور ناراضگیوں کو دور کرنے کا عمل سکھاتیں۔ مجھے سیدھی راہ دکھاتیں آپ نے بھی ڈیڈی کا ساتھ دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ طلاق عورت کے ماتھے پر ایک دھبہ سمجھا جاتا ہے۔ کالا داغ جو مٹائے نہیں مٹ سکتا...... میں نے ڈیڈی سے کہا مجھے آپ کی اُس ہائی سوسائٹی میں کوئی دلچسپی نہیں جس میں انسان سے زیادہ اس کی دولت کی قدر ہوتی ہے۔ پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ آپ جسے دولتمند ہر چیز کی قیمت لگا سکتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ آپ کا بلینک چیک راجا کو نہیں خرید سکا۔ جسے آپ ناچیز سمجھتے ہیں۔ ماں باپ اپنے بچوں کو بنتا بستا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ مگر آپ دونوں کو نا ہی مجھ سے کوئی ہمدردی ہے اور نا ہی میری زندگی میں کوئی دلچسپی ہے۔ آپ کو صرف دولت اور اپنی ہائی سوسائٹی سے مطلب ہے اور سب کچھ آپ کے لئے غیر ضروری ہے۔ آپ دونوں پیار اور محبت کے احساس سے قطعی بے بہرہ ہیں۔

آپ نے آج تک جو بھی کیا صرف اپنی انا کی تسکین کے لئے کیا۔ آگے کچھ ایسا کریں جس سے کسی عام آدمی کی بہتری ہو...... مجھے راجا کی قابلیت اور اُس کے قوت بازو پر بھروسہ ہے۔ میں اپنے گھر جا رہی ہوں کیونکہ اصلی سکون اصلی خوشیاں اپنوں کے ساتھ ہی ملتی ہیں......

وکیل چاچا نے کہا...... بیٹیوں کے معاملات میں جذبات سے زیادہ عقل سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ جانے دو...... اسے نہ روکو......

میں اسی وقت اپنے گھر لوٹ آئی...... میری بیٹی مجھ سے لپٹ گئی۔ نا میں کچھ بولی...... نہ ہی راجا نے کچھ کہا...... بس ہماری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے شادی دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ اور روحوں کا رشتہ خاموشی سے ہوتا ہے......

☆☆☆

تلاش۔ مکمل مرد کی

میری یہ مختصر سی کہانی میری ہی زبانی شاید مردوں کو اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنے کے لئے مجبور کردے۔ میری طرح ہر مرد اپنے آپ کو مکمل سمجھتا ہے۔ شاید اس ہی لئے مرد عورت پر حاوی ہوگیا اور عورت اپنے شوہر کو مجازی خدا سمجھنے لگی۔ میری طرح اور بھی بہت سے مجازی خدا ہونگے۔ جو اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا الزام اپنی بیویوں کے سر تھوپ کر خود مکمل ہونے کا دعویٰ بھرتے ہونگے۔

میں بیحد عام سا بندہ ہوں۔ ایک ایماندار اور دیانتدار سرکاری افسر ہوں۔ رشوت لینا گناہ سمجھتا ہوں۔ اپنے بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں سے پیار کرتا ہوں۔ کسی پڑوسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ میرے یار مجھے مسٹر پرفیکٹ پکارتے ہیں۔

میری شریک حیات میری نہیں میری ماں کا انتخاب ہے۔ نازک سی۔ پیاری پیاری۔ دھیما بولنے والی۔ ہر حال میں مسکرانے والی۔ سہمی سہمی۔ ڈری ڈری سی لیکن ایسی خدمت گار کہ کچھ دنوں ہی میں خاندان کے ہر فرد کا دل جیت کر جھانسی کی رانی کا خطاب حاصل لیا۔ اب گھر میں سب اُسے رانی ہی پکارتے ہیں......

ہمارا گھر یوں لگتا ہے جیسے زمین پر جنت اُتر آئی ہو۔ شادی کے بعد چار سال ہنستے ہنساتے بیت گئے۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا...... جب رانی ماں نہ بن سکی تو اماں کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک دن برس پڑیں۔ فوراً کسی اچھے ڈراکٹر سے صلاح مشورہ کرنے کا حکم صادر کردیا۔ پاپا دھیرے سے بولے مانا کہ سائنس بہت ترقی کر رہا ہے مگر اولاد ڈاکٹر نہیں خدا دیتا ہے۔ ڈاکٹر ہزار ٹیسٹ کروائے گا۔ ٹیسٹ ویسٹ کا جھگڑا چھوڑو۔ جب داتا کی مرضی ہوگی دے دیگا۔ بندے کا کام ہے صبر کرنا۔......

اماں اُبل پڑیں...... صبر...... چار سال سے صبر ہی تو کر رہی ہوں۔ اور کتنا صبر...... میرا بچہ منھ سے کچھ نہ بولے مگر ہر جوان مرد کی طرح اُس کے دل میں بھی اولاد کی تمنا تو ہوگی...... امید بر آنے میں تاخیر دل کو بیمار کر دیتی ہے۔ ماحول میں تلخی پھیلی تو میں وہاں سے کھسک گیا۔

اماں کی ضد کے سامنے تو پاپا بھی ہتھیار ڈال دیتے تھے پھر میری کیا مجال تھی...... میرا اور رانی کا ہسپتال جانے کا سلسلہ شروع ہوتے ہی رانی کی پریشانیوں کا آغاز ہوگیا۔ بانجھ پن کا خیال ہی عورت کے

لئے عذاب ہوتا ہے۔ دل ٹوٹنے سے زیادہ رشتہ ٹوٹنے کا ڈر ہے۔ بے گھر ہونے کا ڈر اُسے سہائے رکھتا ہے۔ رانی ایک بے سہارا بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ سر پر نا باپ کا سایہ تھا اور نا ہی بھائی کا سہارا۔ اس کے اوپر تو عجب سی دہشت طاری ہوگئی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹیں معدوم ہوگئیں۔ بوکھلائی بوکھلائی سی بار بار ایک ہی بات کہتی ...... تم سے بچھڑ کر میں جی نہیں پاؤنگی۔ خدا کے واسطے مجھے بے گھر۔ بے در نہ کرنا۔ میں اُسے دلاسے دیتا کہ جتنا حق میرا اس گھر پر ہے اتنا ہی تمہارا بھی ہے بلکہ میرے خیال میں تمہارا مجھ سے زیادہ ہے۔ تم اس گھر کے ہر فرد سے محبت سے پیش آتی ہو۔

سب کی خدمت میں لگی رہتی ہو۔ گھر بیٹھے ٹیوشن کر کے اچھی خاصی رقم کماتی ہو اور اپنی کمائی سے اس گھر کو سنوارتی ہو۔ سجاتی ہو۔ اس گھر کو تمہاری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی تمہیں اس گھر کی ہے۔ تمہیں اس گھر سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ اُسے مطمئن کرنے کے لئے میں نے اُس کی تعریفوں کے پل باندھے مگر سب بے سود۔ اُسے میری کسی بات پر یقین ہی نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ بھی جانتی تھی اور میں بھی کہ گنوں سے لبالب بانجھ عورت کی حیثیت دودھ میں مکھی جیسی ہے۔ سب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اُس کی عزت اور قدر نا گھر میں اور نا ہی سماج میں ہے سب اُسے منحوس سمجھتے ہیں اور اس کی پرچھائیں سے بھی دور بھاگتے ہیں......

رپورٹ لینے میں اکیلا ہی گیا۔ ڈاکٹر زیرلب مسکرایا اور بولتی نظروں سے یوں میری طرف دیکھا جیسے میری چوری پکڑلی ہو۔ اس سے پہلے کہ میں رانی کے نہ آنے کا بہانہ بیان کرتا وہ بولے میں جانتا ہوں سب شوہروں کی طرح آپ بھی اکیلے ہی آئیں گے۔ ہم مرد اپنے کو بہت بہادر سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں ہم عورتوں کے مقابلے میں کمزور ہیں۔ ہم اپنی کمزوریوں پر ہمیشہ پردہ ڈالتے ہیں یہاں تک کہ اپنی بیویوں سے بھی اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ عورت اپنی خامیوں کا ڈٹ کر بہادری سے مقابلہ کرتی ہے۔......

انہوں نے رپورٹ میرے ہاتھوں میں دی۔ میں نے پڑھی پر میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ ڈاکٹر نے رپورٹ پڑھ کر مجھے سنائی مگر میں کچھ سمجھ نہیں پایا تو انہوں نے تفصیل سے سمجھایا۔ مجھے یقین نہیں آیا...... میں سوچنے لگا میں جو مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ ہوں مجھ میں اتنی بڑی کمی ...... بے ساختہ ہی بول پڑا نہیں...... نہیں...... ڈاکٹر...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ میری طرح کے مردوں کی کیفیت سے خوب واقف تھے۔ میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے ایسا ہی ہے۔ یہ بنانے والے کی قدرت ہے۔ اس میں انسان کا دخل نہیں۔ افسوس۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا...... میں اندر ہی اندر اپنی موت مر گیا۔ اس پل

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قیامت آگئی ہو۔زمین وآسمان ہل رہے ہوں۔ساری کائنات ہل رہی ہو...... ہر طرف تباہی ہی تباہی اور کائنات کا مالک بے خبر ہے۔ بہت دیر لگی مجھے اپنے حواس بٹورنے میں۔گرتا پڑتا ہسپتال کے باہر نکلا...... میرا لاغر۔ بے جان جسم کا ڈھانچہ ایک پیڑ تلے ڈھے گیا۔ میں آنکھیں موندے اپنے بنانے والے کے سامنے روتا رہا۔گڑگڑاتا رہا کہ مالک ہر جگہ دُکھوں کے جال بچھے ہیں گر تو ہی ساتھ نہیں تو میں کدھر جاؤں......

سورج ڈھلے گھر پہنچا تو اماں نے کئی سوال کرڈالے۔ میں نے زور سے کہا۔سب نارمل ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے داتا دے گا۔بس انتظار کرو۔ اور میں تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گیا جہاں رانی بیقراری سے میری منتظر تھی۔ میری ذہنی الجھن تو میرے چہرے سے ظاہر تھی۔ مجھے دیکھ کر گھبرائی اور بولی...... ارے تمہیں کیا ہو گیا ایک دم بے جان سے لگ رہے ہو۔ کیا رپورٹ مل گئی۔اُس نے امید افزا نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے جلدی سے اپنے پر قابو پایا اور اُس کے قریب بیٹھ کر بولا...... رپورٹ جو بھی کہے تم بالکل بے فکر رہو۔ میں تمہارا علاج کرواؤنگا......

اور ایک دن تم میرے بچے کی ماں ضرور بنوگی۔ وہ میرے قدموں میں گر کر زار و قطار روتی رہی۔ کچھ دیر بعد بولی...... میں تمہارے قدموں کی دھول بن کر زندگی گذار دونگی۔ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے اپنے سے جدا نہ کرنا۔ کچھ دیر بعد بولی...... اور اماں'' ...... بڑے پیار سے میں نے اُسے ڈھارس بندھایا...... تم تو جانتی ہو میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔میرے ہوتے تم پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آسکتی......

ڈاکٹر کی باتوں نے مجھے بالکل ناامید کردیا تھا۔ناامیدی کفر ہے...... انسان کو اس حد تک کمزور کردیتی ہے کہ اُس کا ایمان بھی ڈگمگا جاتا ہے۔...... میرا دماغ بھی ٹونے۔ٹونکے۔تعویذ جھاڑ پھونک پر اور بابا کی طرف پلٹا۔ میرے گھر سے ذرا دور سڑک کے ٹکڑ پر لمبی داڑھی والا بابا گھنے پیڑ کے تلے آنکھیں موندے چمٹا بجا بجا کر جپ کرتا تھا۔ میرے قدم خود بخود اُدھر بڑھتے چلے گئے۔ وہاں مردوں۔عورتوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔سب کا ایک ہی کہنا تھا کہ اس در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔اس یقین کے ساتھ کہ میری بھی مشکل یہی حل کردیں گے۔ میں نے بھی اپنا سر اُن کے چرنوں میں جھکا دیا۔انہوں نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر کہا...... بول بچے کیا چاہتا ہے'' میں نے دھیرے سے کہا۔اپنی بانجھ عورت کا علاج......انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ پاس کھڑے اُن کے مرید نے کہا کل اپنی بیوی کو لے کر آجانا۔

علاج لمبا اور مہنگا ہے۔ میں گھر گیا۔ چپکے سے اپنی بیوی کا زیور بیچا اور دوسرے دن بیوی کو ساتھ لے کر بابا جی کے دربار میں حاضر ہو گیا۔

ایک لمبے انتظار کے بعد ایک عورت آئی اور رانی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ کئی گھنٹے یوں ہی اونگھتے اونگھتے بیت گئے۔ وہی عورت رانی کو واپس لائی۔ بولی۔ بابا کا حکم ہے کہ کل بھی اسی وقت آنا۔ اور اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ اثر الٹا ہو جائے گا بابا جو بھی حکم کرتے ہیں بنا چوں چرا مانتا گیا۔

اس خبر نے کہ میں باپ بننے والا ہوں میرا

کلیجہ ہی ہلا دیا۔ دل پر ایسی زور کا دھما کہ ہوا کہ دل کا جھل مل کرتا چراغ ہی بجھ گیا۔ آندھی جیسی تیز تیز سائیں سائیں کرتی آوازیں کانوں میں شور مچاتی رہیں...... پورا بدن یوں کانپ رہا تھا جیسے بھونچال آ گیا ہو گھر میں خوشیاں چہک رہی تھیں۔ مٹھائیاں بٹ رہی تھیں۔ رانی سجی دھجی پلنگ پر بیٹھی اپنی دوستوں سے گپیں لگا رہی تھیں۔ اور میں اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا منھ چھپائے اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ندامت کے آنسو بہار ہا تھا......

میں نے رانی سے علاج کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ مجھے تکلیف سے بچانے کے لئے ڈاکٹر مجھے انجکشن لگا دیتی تھی۔ کیا علاج ہوتا تھا میں نہیں جانتی۔ مگر اُس کی بیقرار نظریں مجھے گھورتی رہ گئیں۔ نا معلوم وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ سچ بول رہی تھی یا پھر میری ہی طرح وہ بھی......

آج میں ایک بیٹے کا باپ ہوں...... باپ بن کر طبیعت اداس ہے۔ دل پریشان ہے اور دماغ میں طوفان برپا ہے۔ میری آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے ہیں۔ اپنے ایک راز کو راز رکھنے کی کوشش ہی میں خود اپنی آنکھوں میں گر گیا ہوں۔ وہ شدید ترین اذیت جھیل رہا ہوں جسے ضمیر کی اذیت کہتے ہیں۔ ایسا ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں کہ اب مجھ میں...... میں بھی نہیں بچا۔

جب جب رانی مجھے منا کے پاپا کر کے پکارتی ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے میرے منھ پر زوردار طمانچہ مارا ہے اور مجھے عمیق غار میں ڈھکیل دیا ہے۔ میری ماں دادی بن کر پاپا دادا بن کر بہت خوش ہیں۔ بیٹا پا کر رانی اب اس گھر کی مالکن بن گئی...... اس بچے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں نفرت عود کر آتی ہے۔ پھر میں اپنے کو سمجھاتا ہوں کہ گنہگار تو میں ہوں۔ اس بچے کا قصور نہیں ہے اس سے نفرت نہ کر اس نے تو مجھ پر کرم کیا ہے۔ آج بھی میں سب کی نظروں میں ایک مکمل مرد ہوں......

☆☆☆
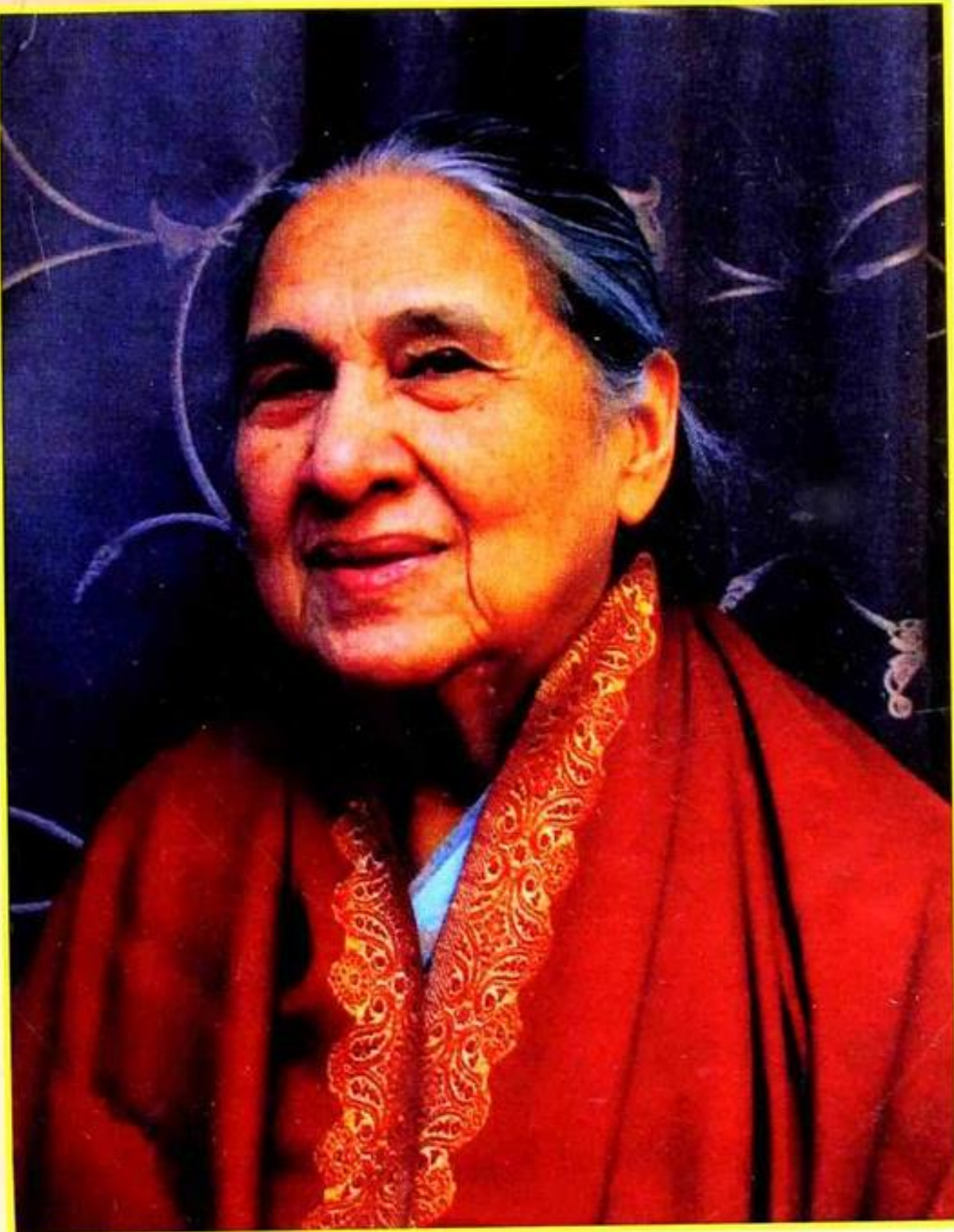
ساوتری گوسوامی

PUBLISHED BY:

Asbaque Pablication

Saira Manzil, 230/B/102, Viman Darshan, Sanjay Park,
Lohgaon Road, Pune 411032 M.S. (India)
M.:9822516338 / 8055755623
E-mail: nazir_fatehpuri2000@yahoo.com